KitaabPoint.blogspot.com

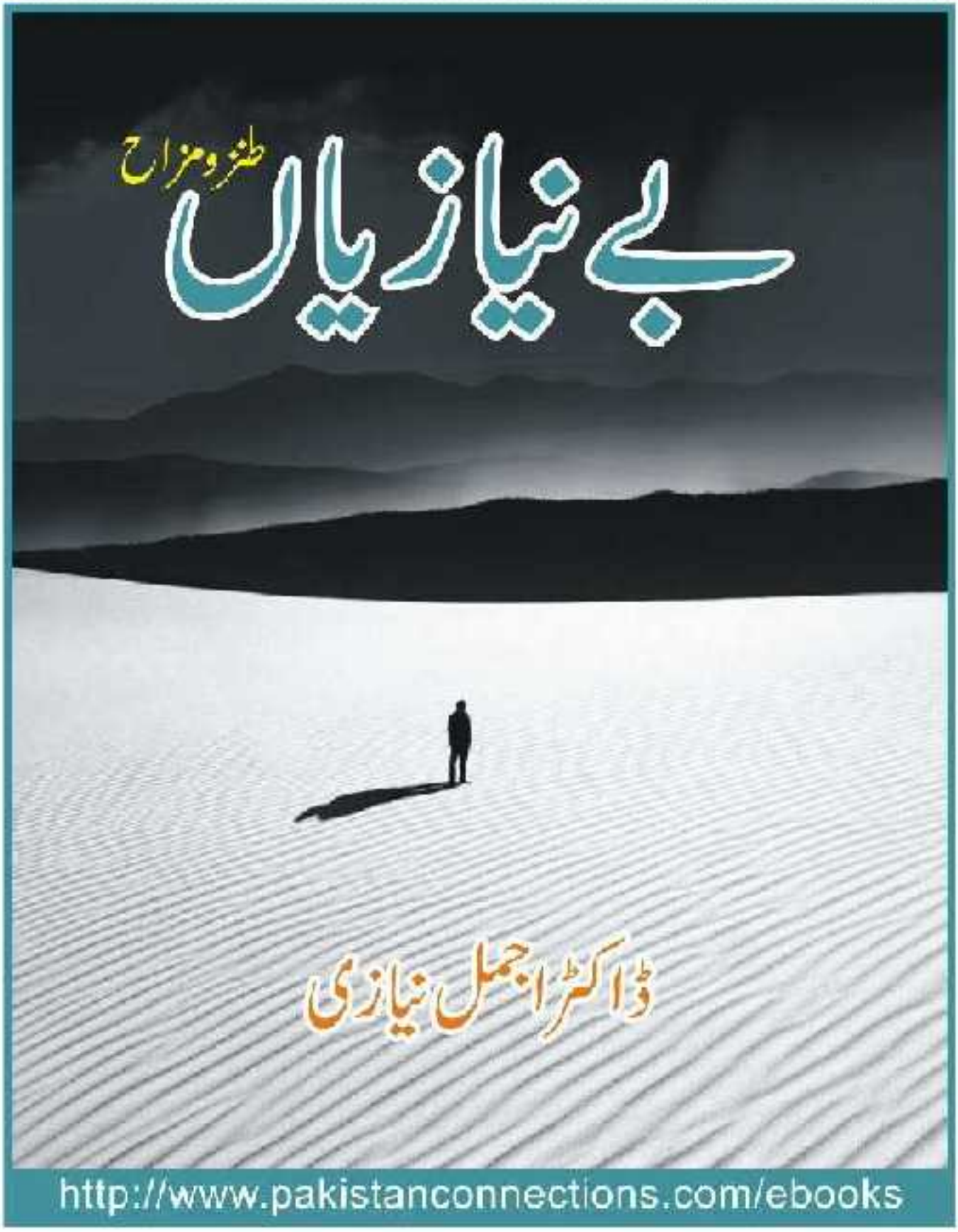

KitaabPoint.blogspot.com

بے نیازیاں

طنز و مزاح

ڈاکٹر اجمل نیازی

KitaabPoint.blogspot.com

جیل میں ذکر یار

ڈسٹرکٹ جیل گجرات سے ایک صحافی طارق عثمانی اور ایک پنجابی شاعر طالب حسین ناز نے ہمارے نام ایک خط میں ڈی سی گجرات اور سپرنٹنڈنٹ جیل گجرات سے مطالبہ کیا ہے کہ انہیں جیل کے اندر ''اسیران محفل'' کے نام سے ادبی تنظیم قائم کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ مشاعرے اور ادبی نشستیں منعقد کی جائیں ان کے خیال میں اس طرح ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو توانائی ملے گی۔ قیدیوں میں ادبی ذوق وشوق پیدا ہوگا اور جرائم پیشہ افسران کی اصلاح میں بھی آسانی ہوگی ہم یہ خط پڑھ کے رو دیئے پھر ہنس دیئے۔ رونا اس بات پر کہ عثمانی صاحب قید میں ہیں اور ہنسی اس بات پر کہ ہم آزاد ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر ڈی سی صاحب اور سپرنٹنڈنٹ صاحب ہماری بات مانتے ہوتے تو ہم لکھنے پڑھنے کی بجائے کوئی اور کام نہ کر رہے ہوتے اور اگر ادبی تنظیمیں قائم کرنے سے جرائم کم ہوتے تو جیلیں کیوں بنائی جاتیں۔ صرف لاہور میں اتنی ادبی تنظیمیں ہیں کہ پاکستان بھر میں اتنی جیلیں نہ ہوں گی۔

بعض اوقات بے گناہ لوگ جیلوں میں بھیج دیئے جاتے ہیں۔ سیاسی لیڈر صحافی ادیب وشاعر اس لحاظ سے کچھ حکومتوں کے پسندیدہ لوگ ہوتے ہیں بلکہ انہیں اس سلسلے میں مستحق بھی سمجھا جاتا ہے۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ عثمانی صاحب اور ناز صاحب کس کھاتے میں جیل گئے ہیں بالعموم سیاسی قیدیوں پر بھی فوجداری مقدمات ہی بنائے جاتے ہیں حکومت کی خطرناک مخالفت کو بھی قابل دست اندازی پولیس فعل سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً چوہدری ظہور الٰہی مرحوم پر بھینس چوری کرنے کا الزام لگایا گیا تھا یعنی بھینس چوری کرنا اور حکومت پر تنقید کرنا برابر ہے ویسے یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے کہ پرانے سیانے لوگوں نے جس کی لاٹھی اس کی بھینس والی ضرب المثل سوچ سمجھ کر بنائی ہوگی جس کے پاس لاٹھی ہو وہ دوسروں کو بھینس رکھنے کا حق کیوں دے گا۔ جس طرح ایٹمی طاقت والا امریکہ کسی غریب یا مسلمان ملک کو ایٹم بم بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔

نامور پنجابی شاعر استاد دامن کو اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب انہوں نے بھٹو صاحب کے دور میں یہ نظم لکھ دی۔

اوہ کیہ کری جاندا ایں اوہ کیہ کری جاندا ایں
کدی شملے جاندا ایں تے کدی مری جاندا ایں

استاد نے شاہی مسجد کے سائے میں تنگ وتاریک چھوٹے سے کمرے میں ساری عمر گزار دی۔ نجانے استاد اس کمرے میں سوتا

KitaabPoint.blogspot.com

کس طرح تھا تو پھر جاگتا کس طرح تھا اس کے لیے یہ محاورہ رسمی نہ رہا تھا کہ کتابیں میرا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ استاد کو ایک مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے یہ الزام لگایا کہ تمہارے گھر سے اسلحہ برآمد ہوا ہے۔ استاد یہ سن کر ہنسا اسے ہنسی اسلحہ کی بات پر نہیں اپنے کمرے کو گھر کہنے پر آئی تھی۔ اس نے مجسٹریٹ سے کہا کہ آپ کی پولیس بڑی نااہل ہے۔ میرے کمرے میں اور بھی بہت سا اسلحہ ہے جو برآمد نہیں کیا گیا۔ مجسٹریٹ کے علاوہ پورے کمرۂ عدالت میں سنجیدگی چھا گئی۔ جب استاد نے یہ بتایا کہ جناب میرے کمرے میں ایک ٹینک اور ایک بکتر بند گاڑی بھی ہے تو حاضرین کے علاوہ مجسٹریٹ اور تھانیدار بھی ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ استاد دامن نے کوئی لطیفے کی بات نہیں کی تھی کمرے میں وہ خود رہتا تھا تو اس سے زیادہ طاقتور چیز کیا ہے۔ حکومتیں اور اس کے لاؤ لشکر کسی بہادر سچے اور تخلیقی آدمی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ روس کے باغی ادیب سولزے نیٹسن کو دنیا کا تیسرا ایٹم بم کہا گیا۔ سولزے نیٹسن نے کہا کہ ایک سچا ادیب ریاست کے اندر ریاست ہوتا ہے حکومتیں اسے کس طرح برداشت کر سکتی ہیں۔

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

اس طرح کے کام کرنے والے تخت اور تختے کو ایک حیثیت دیتے ہیں ویسے کوئے یار میں پہنچنا اور تختہ دار پر چڑھنا تقریباً ایک جیسا عمل ہے۔ دونوں کاموں کے لیے بڑا حوصلہ اور ہمت چاہیے عجیب بات یہ ہے کہ جیل جانے والوں میں کوئی نہ کوئی قدر مشترک ضرور ہوتی ہے۔ سیاسی لیڈر ہو ادیب و شاعر یا صحافی ہو چور ڈاکو قاتل یا بے گناہ ہو کسی بھی جرم میں پکڑا گیا ہو جیل جانے کی خواہش ہی میں اس نے کچھ نہ کچھ کیا ہوگا۔ یہ اپنا اپنا ظرف ہے جو جس قابل ہوگا وہی کچھ وہ کرے گا۔

سیٹاں تے آئی دا سکندر ہوئی دا
سیٹاں توں جائی دا قلندر ہوئی دا
جے حکومت نال ٹھن جائے دامنا فیر
فیر کیہ اے بھئی فیر اندر ہوئی دا

مجاہد ملت عبدالستار خان نیازی نے تو اس لیے شادی نہ کی کہ جیل جانے میں آسانی ہو وہ بھی اس رستے سے ایوان میں پہنچے۔ کچھ لوگوں اور کچھ ادیبوں کے لیے جیل جانا اور گھر جانا ایک ہی بات ہے۔ ان دونوں جگہوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کے لیے ان سے پوچھا جائے تو وہ جیل جانا ہی پسند کریں گے۔ وہ جس سرشاری سے جیل جاتے ہیں اتنی ہی بیزاری سے گھر جاتے ہیں۔ رات کو دیر سے گھر جانے میں ایک خواہش یہ بھی ہوتی ہے کہ شاید پولیس والے تھانے لے جائیں۔ جب حبیب جالب نے کہا تھا۔

KitaabPoint.blogspot.com

لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو

اس نے اس مصرعے میں ''ورنہ'' ضرورت شعری کے تحت لگایا تھا اس نے کہیں اور جانے کی بجائے تھانے کو ترجیح دی انقلابی راجہ انور نے ایام اسیری کے تاثرات پر مشتمل اپنی کتاب کا نام ''بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک'' رکھا ہے۔ چھوٹی جیل میں جو تکلیفیں ہیں' بڑی جیل میں اس سے کم تو نہیں' جیل کے مکینوں کے پاس فراغت اور فرصت تو ہے ہم وقت کے قیدی ہیں۔ بے وجہ مصروفیات افراتفری اور حرص و ہوس نے لوگوں کو جکڑ رکھا ہے۔ عثمانی صاحب اور ناز صاحب مرزا غالب کے اس شعر میں چھپی حسرت پر غور کریں اور عیش کریں۔

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہے تصور جاناں کئے ہوئے

شاید انہیں اس اعزاز کی خبر نہیں کہ وہ کن لوگوں کی فہرست میں اتفاقاً شامل ہو گئے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان' حسرت موہانی' عبیدالمجید سالک' حبیب جالب' بھٹو صاحب' فیض ندیم' کوثر نیازی اور کیسے کیسے لوگ جیل کے مکین ہوئے۔ کئی لیڈر اور سیاستدان تو ایسے میں خود کو سرکاری مہمان کہا کرتے تھے۔ یہ مہمان نوازی کبھی کبھی مہنگی پڑی۔ انگریزوں کے زمانے میں تو لوگ ملاقات کے لیے دوستوں کو جیل خانے کا ایڈریس دیا کرتے تھے۔ شاعروں ادیبوں نے اسیری کے دوران کئی یادگار کتابیں لکھیں۔ زندانی ادب میں سے کئی تحریریں زندہ ادب میں شمار ہوتی ہیں۔ حسرت موہانی کا یہ شعر ایک مثال بن گیا ہے۔

اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی

ادبی تنظیمیں بنانا اور روایتی طریقے سے ہی زندگی بسر کرنا مقصود تھا تو پھر جیل کی ضرورت کیا تھی۔ ایک زندہ دل آدمی کو عمر قید ہوئی تو اس نے جیل کے دروازے پر ہی اپنی گھڑی اتار کر توڑ دی کبھی تو ایسا ہو کہ وقت ہمارا پابند ہو جائے۔ جیل میں تنہائی بھی میسر ہے اور فرصت بھی ہے۔ سوچنے اور غور کرنے کا بڑا موقعہ ہے کوئی کام کی بات معلوم ہو تو ہمیں بھی بتائیں یہاں دو بڑے لیڈر اور عالم دین مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی جیل یاترا کا ذکر برمحل ہوگا۔ مولانا آزاد سگریٹ کے رسیا تھے اور مودودی صاحب پان بہت کھاتے تھے۔ مولانا آزاد نے جیل کے دروازے پر سگریٹ کا آخری کش لیا اور پھر قید کے دوران نہیں پیا۔ مولانا نے منہ کا پان پیک کے ساتھ پھینک دیا اور پھر نہیں کھایا۔ مولانا آزاد نے جیل میں ''غبار خاطر'' لکھ کر ایک ادبی کارنامہ سرانجام دیا۔ غالباً

KitaabPoint.blogspot.com

مولانا مودودی نے جیل میں ''تفہیم القرآن'' جیسی اہم دینی کتاب کا خاکہ تیار کیا ہوگا۔ یہ لوگ جیل میں بھی اپنے دلوں کا زمانہ بدلنے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ اہل درد و ذوق قیدی اس سوال کا جواب ہی ڈھونڈ نکالیں کہ آخر ہمارا زمانہ کب بدلے گا۔ یوں اصولی طور پر ہم عثمانی صاحب کے مطالبے کی حمایت کرتے ہیں۔ ہماری جیلوں میں کرنے کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ وہاں اگر تخلیقی ماحول بنایا جائے اور علمی و ادبی فضا بنائی جائے تو نتائج بہرحال مختلف ہوں گے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ علمی و ادبی ذوق رکھنے والے افسروں کا طرز عمل اور کارکردگی نسبتاً بہتر ہوتی ہے۔ دفتروں، اداروں، جیلوں اور گھروں کو ایک جیسی جگہ نہیں بنا دیا جاتا تو زندگی اور زندگی نہیں بن سکے گی۔

قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہر خدا آج ذکر یار چلے

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

احمد ندیم قاسمی کا تاریخی اعلان

ہمارے عہد کے نامور شاعر ادیب اور صحافی احمد ندیم قاسمی نے اپنے ادبی جریدے ''فنون'' کے تازہ شمارے کے اداریئے میں اعلان کیا ہے کہ میرا کوئی ادبی گروپ نہیں۔ بلاشبہ یہ ایک تاریخی اعلان ہے مگر بڑی تاخیر سے کیا گیا ہے۔ ندیم صاحب نے کہا ہے کہ میں اس مغالطے کو دور کرنا چاہتا ہوں۔ کیا ندیم صاحب سمجھتے ہیں کہ اس طرح برسوں سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کا طوفان چھٹ جائے گا۔

میں ندیم دوستوں سے محبت رکھتا ہوں' مگر جو خود غرض مفاد پرست اور منافق بقلم خود دوست ہوئے ہیں' ان سے جائز اور ناجائز فائدے اٹھائے' ان کی سربلند شخصیت کو اپنے مطلب کے لیے بری طرح استعمال کیا۔ مجھے معاف رکھا جائے تو میں کہوں کہ ان کا استحصال کیا گیا۔ پھر وہ ندیم دوستی کے دائرے میں اتنے حاوی ہوئے کہ مسلط ہی ہو گئے۔ وہ جو سچے لوگ تھے' چپ چاپ گم سم کبھی ندیم صاحب کو اور کبھی ان کو دیکھتے رہے' کچھ ایک طرف ہو گئے اور کچھ دور چلے گئے' کچھ بہت دور چلے گئے۔ ایک وقت آیا کہ ندیم صاحب کی محفل میں اکثر اوقات لطیفوں کے کچھ سنائی نہ دیا۔

ندیم صاحب کی محبتیں اور مروتیں اپنے دائرے میں کیسے کیسے لوگوں کا ٹھکانہ بنیں۔ وہ لوگ ایک دوسرے کے بھی خلاف ہوئے۔ اخبارات میں بھی ایک دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھ کر جی بھر کے ادبی فائرنگ کی پھر اس کی زد میں جو آ جائے۔

ندیم صاحب نے ادبی گروپنگ سے اعلان بریت کر کے ایک بڑا کام کیا ہے مگر کئی گروپ خود ان کے دوستوں اور عزیزوں کے ہیں۔ وہ اس گروپنگ کے بھی توڑنے کے لیے اقدام کریں۔

کیا ندیم صاحب واقعی نہیں جانتے کہ وہ کون لوگ ہیں' جنہوں نے کبھی انہیں ڈاکٹر وزیر آغا کے مدمقابل اور کبھی فیض کے سامنے بلکہ آمنے سامنے کھڑا کر دیا۔ ندیم صاحب کے اس واضح اعلان کے بعد بھی وہ لوگ ندیم دوستوں کی صف میں موجود رہیں گے۔ بلکہ پہلی صف میں موجود رہیں گے۔ سازشیں کرتے رہیں گے اور کوششیں کرتے رہیں گے کہ ندیم صاحب کی وجہ سے انہیں سرفراز ہونے کے مواقع ملتے رہیں بلکہ وہ اپنے لیے یہ موقع پیدا کرتے رہیں گے۔ ندیم صاحب انہیں اب بھی نہیں روک سکیں گے۔ بلکہ وہ اب بھی ان کی خیر خواہی کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔

KitaabPoint.blogspot.com

منفرد شاعرہ منصورہ احمد نے پچھلے کئی برسوں سے ندیم صاحب کی جو خدمت کی ہے سارے ندیم دوستوں کو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ وہ ندیم دوست ہی ہیں جو ہر وقت اس کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ وہ منصورہ بی بی کو اپنی راہ کا سب سے بھاری پتھر سمجھتے ہیں۔ اب صرف وہی صورت حال میں سچی بات کہنے کا یارہ رکھتی ہے۔ وہ ندیم صاحب کو نادان دوستوں اور دنیادار دوستوں سے بچانے کی اپنی کوشش بھی کرتی رہتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اعلان بھی اس کی ہی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

میری ندیم صاحب سے گزارش ہے کہ وہ اپنے اس بہت خوش آئند اعلان کو ایک تاریخی حقیقت بنائیں وہ بلاشبہ اس وقت برصغیر کی سب سے بڑی ادبی شخصیت ہیں۔ لوگوں نے ان کو متنازعہ بنا کر اپنے آپ کو مقبول بنانے کی کوشش کی۔ دو ایک نے تو اپنے آپ کو ندیم صاحب کے مقابلے کا شاعر اور ادیب سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ اب وہ ندیم دوستی سے بے نیاز ہیں کہ انہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ ندیم کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں جس طرح کچھ خواتین و حضرات نے فیض کو اپنی آڑ بنا لیا تھا۔ کچھ لوگوں نے ڈاکٹر وزیر آغا سے بھی یہی کام لینے کی کوشش کی۔ یہ کوشش کسی حد تک ندیم دوستوں نے کامیاب ہونے دی' کہ یہی ان کے حق میں تھا۔

بلاشبہ ندیم بہت بڑے اور سچے انسان ہیں۔ ان کا وجود ہمارے عہد میں ایک نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی ذات ایک سائبان ہے پھر کچھ لوگ انہیں اپنی چھتری کیوں بنا لیتے ہیں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

جب ڈگریاں ملتی ہیں

ہمارے کالجوں' یونیورسٹیوں میں ایک تقریب ہوتی ہے جسے انگریزی میں کانووکیشن کہتے ہیں اور اردو میں جلسہ تقسیم اسناد۔ بظاہر یہ بڑی اہم تقریب ہے۔ نوجوان تو یوں خوش چلے آتے ہیں جیسے یہ کوئی ذریعہ معاش کا پروانہ ہو۔ جس طرح اس زمانے میں کسی کو کھانڈ کا پرمٹ مل جائے۔ فارغ التحصیل نوجوانوں کو بے پناہ خوشی اس لیے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے پڑھا لکھا تو کچھ ہوتا نہیں اور ڈگری مفت کی۔ یعنی چپڑی اور دو دو۔ البتہ امتحان کے دنوں میں نقل وقل کے انتظام وغیرہ میں کچھ پریشانی تو ہوتی ہی ہے۔ اس کے معاوضے کے لیے یہ بہت بڑی شے ہے۔ طالب علموں کو علم کے علاوہ اور شے کی طلب ہوتی ہے۔ فی زمانہ کتاب ہاتھ میں رکھنا آؤٹ ڈیٹڈ بات ہے۔ اور گھر میں رکھنے کے لیے دوسری اہم چیزوں کے لیے تو جگہ ہوتی نہیں۔ شوپیس کے طور پر رکھی جاسکتی ہیں مگر وہ پھر رکھی ہی رہتی ہیں۔ لائبریری میں کوئی جاتا نہیں وہاں کم از کم کتاب کو سامنے رکھنا تو ضروری ہے۔ ہمارے ایک دوست رضوی صاحب نے جب ایم اے اردو کرلیا تو انہیں ایک استاد محترم نے کہا کہ بھئی تم نے ایم اے تو کرلیا ہے اب دو چار کتابیں بھی پڑھ ڈالو۔ ڈگری کے حصول کے بعد تو ہمارے ہاں پڑھنے لکھنے کا کوئی رواج ہی نہیں۔ یہ تو لڑکوں وڑکوں کا مسئلہ ہے۔ پڑھے ہوؤں کے مسائل اور بہت سے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ علمی زندگی میں عملی رابطوں کی کیا ضرورت ہے۔ علم وعمل میں یہ تفریق کا احساس ہماری زندگی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ہم خود اپنے دشمن بن جاتے ہیں۔ مجھے ایک مغربی نقاد کی بات یاد آرہی ہے کہ ڈگری لینے کے بعد خواہ وہ پڑھنا لکھنا چھوڑ بھی دے مگر اپنے اطوار وانداز سے ہی پڑھنا لکھا نظر آئے تو بھی وہ ایک کامیاب آدمی ہے۔ ہم لوگ اور سب کچھ نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں مگر پڑھا لکھا یا شریف آدمی لگتے ہوئے ہمیں محسوس ہوتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں طالب علم بس طالب علم نہیں ہوتا۔ باقی سب کچھ ہوتا ہے۔ مطالعے کے لیے مخصوص مزاج چاہیے۔ ہمارے نصابوں اور رواجوں میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

گمراہ امتحان سے پرچے دینے کے بعد ہمارے طالب علم سپوتوں کی وہی کیفیت ہوتی ہے جو کسی بور فلم میں تین گھنٹے کے بعد سینما ہال سے نکلتے ہوئے تماشائیوں کی ہوتی ہے۔ جو مزا ہم کسی درمیانے درجے کی فلم دیکھنے میں محسوس کرتے ہیں جو شوق کھیل کے میدان میں ایک سرخوشی پیدا کرتا ہے جو لطف ہم تاش کی بازی یا گپ شپ میں لیتے ہیں۔ اس سے بہت کم دلچسپی پڑھنے لکھنے میں بھی پیدا کر لی جائے تو پھر بھی مسئلہ کوئی نہ ہو۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے لیے حصول علم ایک مجبوری ہے بلکہ ایک خوفزدہ ضرورت ہے۔ خسارے کے

KitaabPoint.blogspot.com

وہم سے بھرے ہوئے کاروبار میں ایک طرح کی انوسٹمنٹ ہے۔

چینی تہذیب کی ایک لوک کہاوت ہے کہ جو شخص تین دن کے لیے مطالعہ چھوڑ دیتا ہے تو اس کی گفتگو میں لطافت اور اس کی شخصیت میں سے نفاست کم ہو جاتی ہے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حصول علم کے لیے چین بھی جانا پڑے تو چلے جاؤ۔ ہم میں سے اکثر چین تو جانے کے لیے تیار ہو جائیں گے مگر وہاں کیا لینے جائیں گے اور کریں گے کیا۔ یہ نہ پوچھئے تو بہتر ہے۔

پرچہ دینے آنے والے نونہالان وطن میں سے اکثر کے خلاف تھانوں میں پرچہ کٹوانے کی نوبت کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔ ان کے بیشتر معاملوں میں اور فوجداری مقدموں میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ ہماری گواہی کی اتنی ضرورت نہیں کہ کالج والوں اور پولیس والوں کا آپس میں پہلے ہی بہت پرانا تعلق ہے۔ آیئے ہم اس جلسے میں واپس چلیں جہاں ڈگریاں تقسیم ہو رہی ہیں۔ جیسے چینی کے پرمٹ ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے باوجود نہ چینی ملتی ہے نہ ملازمت۔ مجھے تو اس قسم کے جلسے میں یہ آرزو چین نہیں لینے دیتی کہ یہ لوگ جو ڈگری لینے آئے ہیں وہ امنگ اور ارادہ بھی لے کر جائیں جو زندگی کے تمام رستوں پر ان کا ہمسفر ہو۔ یہ تو اہلیتوں کا ضمانت نامہ ہے جو آدمی کو اپنی ذات میں زندہ کرتا ہے اور اپنے اردگرد پھیلتی ہوئی کائنات میں زندہ تر کر دیتا ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر ہم نے چودہ پندرہ سال ضائع کر دیئے۔ یہاں سالوں کا کیا رونا کہ صدیاں ہی صائع ہو رہی ہیں۔ یہ نقصان اتنا عظیم اور ایسا عجیب ہے کہ احساس ہی نہیں ہوتا۔ ورنہ ہمارے دو روپے گم ہو جائیں تو دو سال تک ہماری نیند اڑ جاتی ہے۔ وہ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم مومن کا گمشدہ ورثہ ہے۔ ہم نے کبھی اس کی تلاش بھی کی ہے۔ اگر دو کنال کی وراثت کی بات ہو تو دو سالوں تک ایک دوسرے پر خون ناحق کا قرض چڑھاتے رہنا بہت معمولی ہے۔ نجانے ہماری اصل متاع کیا ہے اور کہاں کہاں لٹائی جا رہی ہے۔ علم کوئی کاغذوں کی گٹھڑی نہیں جو کسی کے سر پر رکھ دی جائے اور وہ اسے اٹھائے اٹھائے پھرے۔ یہ تو ایک مسلسل جستجو کا نام ہے۔ دریافت کا ایک لامحدود سلسلہ ہے۔ ساری عمر طالب علم رہنا ہی اصل بات ہے اور طالب علم ہونا ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہمارا مقدر تو کیا مشغلہ بھی نہیں۔ کاش پڑھنا لکھنا ہمارا مشغلہ ہوتا۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

عورت کی حکمرانی.....کچھ ان کی زبانی

سیاسی وسماجی اور علمی وادبی حوالے سے ہم خواہ مخواہ اپنے لیے مسائل کھڑے کر لیتے ہیں۔آج کل ہم اس مسئلے پر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں کہ عورت ملک کی سربراہ بن سکتی ہے یا نہیں۔محترم رفیع اللہ شہاب حسب معمول اس بحث میں بھی شریک ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کالم پہ کالم باندھے ہیں۔ جسے ''منصب حکومت اور مسلمان عورت'' کے نام سے سنگ میل پبلیکیشنز نے شائع کر دیا ہے۔ اس مطالبے سے پہلی بات جو میرے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ یہ ساری بحث منفی ہے۔یہ بحث اگر درست ہے تو کل کلاں یہ مسئلہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ بچوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے انہیں اقتدار میں شریک کیا جائے۔مسٹر بھٹو کے خلاف تیز رفتار تحریک کے دوران ہیجڑے بھی اپنا حصہ ڈالنے کے لیے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔اب وہ اپنے حق حکمرانی کے لیے بھی میدان میں آ سکتے ہیں بلکہ انہیں آنا چاہیے۔حکومت کے حوالے سے بات مساوات کی نہیں نہ حقوق کی ہے۔ جہاں مساوات کی ضرورت ہے وہاں ہم خاموش ہیں۔حکومت تو فرائض کا معاملہ ہے اور اہلیت کی بات ہے۔اس ضمن میں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم ایک فلاحی حکومت کا ذکر کر رہے ہیں۔سیدھے سادھے معاملات کو دانشورانہ' مولویانہ اور متعصبانہ بحث میں الجھا دیا جاتا ہے۔یہاں کسی حدیث کو غریب یا امیر ثابت کرنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔اس طرح کی باتیں ہمارے ہاں ایک غیر سنجیدہ اور غور متعلق رویہ پیدا کر رہی ہیں۔اصل بحث آئینے کی نہیں آئیڈیل کی ہے۔ان موقعوں پر حدیث کے لیے سند کی ضرورت نہیں ہوتی۔اسے فطرت اور عقل کے پیمانے پر پرکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ فطری تقاضوں کے مطابق ایک فلاحی ریاست کے مقاصد کیا ہیں۔اور کون ان کی تشکیل وتکمیل کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔فلاحی حکومت صرف نظم ونسق چلانے کا ادارہ نہیں۔اسے دنیا پر حق کی شہادت بھی دینا ہے۔یہاں تو مرد بھی اگر نااہل اور نابالغ ہو تو قابل قبول نہیں۔اس سلسلے میں عورت اور مرد کا مقابلہ بے معنی ہے۔اگر مساوات کا فارمولا مردوں کے سلسلے میں بھی سامنے ہو تو صرف اسی اصول کی بنیاد پر کہ تمام مرد برابر ہیں۔کیا کسی کمر خمیدہ' بزدل' بدکردار اور بے چہرہ شخص کو حکمران بنایا جا سکتا ہے۔اس ضمن میں بیمار آنکھوں والے اور کشادہ پیشانی والے میں کچھ تو فرق کرنا پڑے گا۔آخر مرد فاعل اور مرد منفعل میں سے کسی ایک کو منصب جلیلہ کا مستحق گردانا جائے گا۔یہاں اگر کوئی بے رحمی یا بے انصافی کا الزام لائے تو وہ بھی بتائے کہ پھر اس مسئلے کا حل کیا ہے۔شیر کی دہشت کی دلیل دینے کے بعد بھی جنگل کی بادشاہی کسی گدھے یا کسی بکری کو نہیں دی جا سکتی۔کیا کسی نے مرغی کو

KitaabPoint.blogspot.com

بانگ دیتے سنا ہے۔ کیا کسی نے سنڈے کا دودھ دھویا ہے۔ نر اور مادہ کے معاملات کی تقسیم فطرت نے کر دی ہے۔ اور ہم فطرت سے جنگ کریں گے تو ذلت ہمیں ہی اٹھانا ہوگی۔ مجھے صبح سویرے چڑیوں کی چوچل بانی میں گیتوں جیسا مزا آتا ہے مگر ہم عقاب یا شاہین کے مقابلے میں کسی سہمی ہوئی چڑیا کو فضاؤں کو سر براہی نہیں سونپ سکتے۔ شاہین کا ذکر آتے ہی رفیع اللہ شہاب جیسے لوگ علامہ اقبال کے خلاف کمر بستہ بلکہ فلم بستہ ہو جائیں گے۔ انہیں مزید تحریک دینے کے لیے میں حضرت علامہ کے کئی اشعار پیش کر سکتا ہوں۔ اس وقت ایک شعر سن لیں۔

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

قرآن وسنت ہمارے لیے ایک قطعی معیار ہے۔ اس کے علاوہ ہم اگر فطرت اور عقل سے بھی رہنمائی لے لیا کریں۔ تو ہمارے بہت سے جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں۔ فطرت نے تمام ذی روح مخلوقات کے حقوق فرائض کی طرف واضح اشارے کر دیئے ہیں۔ پھر حضرت اقبال یاد آ گئے ہیں۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندہ صحرائی یا مرد کہستانی

تاریخ انسانی میں کچھ ایسے لمحے آئے کہ اس صورت حال میں سب کچھ قابل قبول ہو گیا۔ ناگزیر حالت میں جائز اور ناجائز کا امتیاز وقتی طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ بچہ سقہ حکمران بنا۔ التتمش کی بیٹی اور ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی بھی۔ تاریخ کے ایک موڑ پر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ نے اسلامی لشکر کی کمان کی۔ ایک اور موڑ پر مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح نے مایوس ہوتے ہوئے پاکستانیوں کی قیادت کی۔ ام المومنین اور مادر ملت میں ماں ہونا قدر مشترک تھا۔ ہم نے وزیر اعظم کے طور پر بے نظیر بھٹو کو تسلیم کر لیا ہے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو اب ہماری حکمران ہیں۔ اب یہ بات اہم ہے کہ وہ ممکنہ خطرات اور دگرگوں ہوتے ہوئے حالات سے کس طرح برآ ہوتی ہیں۔ صرف عورت ہونے کے ناطے تاریخ انہیں کوئی رعایتی نمبر نہیں دے گی۔ اب ایک یتیم بچی ہونا ان کے لیے ڈھال نہیں بنے گا۔ رفیع اللہ شہاب جیسے قلمکار ان کے عورت ہونے کو دونوں طرح ایکسپلائٹ کرنا چاہتے ہیں۔ اب تک یار لوگوں کو کسی عورت میں عورت ہونا ہی سب سے بڑا وصف نظر آتا ہے۔ وہ اب تک یہ بحث کئے جا رہے ہیں کہ عورت ایک اسلامی ملک کی حکمران ہو سکتی ہے۔ ان کی خدمت میں اطلاعاً عرض ہے کہ کئی مسلم ممالک میں اب عورت ہی حکمران ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

شہاب صاحب نے علامہ الماوردی کے حوالے سے ایک حکمران کے لیے یہ ضروری شرائط بیان کی ہیں۔

1- اسلامی حکمران کا عادل ہونا لازمی ہے تا کہ رعیت کے درمیان انصاف کر سکے۔

2- اس کا دین کی تعلیمات سے واقف ہونا ضروری ہے تا کہ نئے پیش آمدہ معاملات کے بارے میں اجتہاد کر سکے۔

3- اس کے ہوش وحواس قائم ہوں۔ وہ اندھا اور بہرا نہ ہوتا کہ رعیت کے احوال کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔

4- لولا لنگڑا نہ ہوتا کہ اسے حرکت کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

5- ملکی سیاست اور مصالح امت پر اس کی گہری نظر ہو۔

6- بہادر اور شجاع ہوتا کہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کر سکے۔

7- اس کے حسب نسب پر انگلی نہ اٹھائی جا سکے۔

پہلی بات تو اس ضمن میں یہ ہے کہ ان شرائط میں سے کئی غیر ضروری ہیں۔ کوئی ذی شعور قوم کسی اندھے کسی اندھے لولے لنگڑے کو حکمران نہیں بنا سکتی۔ ان شرائط کے بعد شہاب صاحب جو دلیل لائے ہیں وہ یہ ہے کہ اس میں مرد یا عورت ہونے کا ذکر نہیں ہے۔ شہاب صاحب کے اس مزاحیہ طرز استدلال سے قارئین بہت محظوظ ہوئے ہوں گے۔ ان کی خدمت میں اسلامی تاریخ کا یہ واقعہ پیش کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ خاندان عباسی کے ایک خلیفہ کے دور میں ایک عورت نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اسے دربار میں بلایا گیا تو خلیفہ نے اس کے سامنے یہ حدیث پیش کی کہ رسول کریم نے فرمایا میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

اس عورت نے حدیث کے ضعیف ہونے پر زور نہیں دیا بلکہ اسے تسلیم کیا اور کہا۔

یہ حدیث درست ہے مگر اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

میرا خیال ہے کہ اس دلیل کی روشنی میں اب شہاب صاحب کے لیے کوئی رستہ نہیں کہ وہ اس خاتون کے ہاتھ پر ایمان لے آئیں۔ وہ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ ہم حکمرانی کے ضمن میں کسی قسم کی شرطوں کی پرواہ نہیں کیا کرتے۔ ہمارا ایک گورنر جنرل غلام محمد اپاہج تھا۔ یحییٰ خان اکثر مدہوش رہتا تھا۔ سوائے محمد ضیاء الحق کے کسی کو دینی تعلیمات سے رغبت ہی نہ تھی۔ سکندر مرزا سے نواز شریف تک ہم نے کیسے کیسے حکمرانوں کے ساتھ گزارا کیا ہے۔ اب ہم عادی ہو گئے ہیں۔ لہٰذا شہاب صاحب کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اب وہ بذات خود حکمران بن جائیں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

شہاب صاحب کی اس خوش کن دلیل کی روشنی میں ایک بات اور عرض کر رہا ہوں کہ اگر کھانے کے آداب بتائے جائیں کے بیٹھ

KitaabPoint.blogspot.com

کر کھانا کھائیں' آہستہ آہستہ کھائیں' پلیٹ میں اپنے سامنے سے کھائیں۔ تو کیا یہ بتانا بھی ضروری ہوگا کہ کھانا منہ سے کھائیں۔ کیا کچھ لوگ کھانے کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کرتے ہیں۔ کچھ باتیں فطرت اور فراست سے ہر آدمی بلکہ ہر ذی روح کو معلوم ہوتی ہیں۔ اور اس میں مرد اور عورت کا فرق نہیں ہوتا۔

اس کے آگے اپنی بات کو مزید ثابت کرنے کے لیے شہاب صاحب نے علامہ الماوردی کے حوالے سے لکھا ہے کہ قاضی یا جج کے لیے شرائط بیان کرتے ہوئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ عورت جج نہیں ہو سکتی۔ شہاب صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے ہاں اب عورتیں بھی جج بننے لگ گئی ہیں۔ شہاب صاحب یہ ثابت کرنے پر تل گئے ہیں کہ عورت جج بن سکتی ہے۔ وہ علامہ الماوردی کی ایک بات مانتے ہیں دوسری سے انکار کرتے ہیں۔ اصل میں وہی بات مانتے ہیں جو ماننا چاہتے ہیں۔ خانگی معاملات کے سلسلے میں احادیث کو ریاست وحکومت کے درجے پر لے آتے ہیں۔ ہر بات کو اپنے مطلب کے مطابق واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی کتاب علمی ہٹ دھرمیوں سے بھری پڑی ہے۔ سورۃ النساء کی مشہور آیت جس میں مردوں کو ''قوامون'' کہا گیا ہے عربی لغت میں اس کے صاف صاف معانی سربراہ کے بتائے گئے ہیں۔ شہاب صاحب نے اس کا مطلب روزی کمانے والا بتایا ہے۔ اس طرح ان کی بات زیادہ بے وزن ہو جاتی ہے کیونکہ اسلام کسی طرح بھی عورت کی معاشی جدوجہد پر پابندی نہیں لگاتا۔ شہاب صاحب اس بارے میں خود نہیں جانتے کہ وہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ طیش میں آ کر احمد فراز کو ولی اللہ اور سلمان رشدی کو عاشق رسول ثابت کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ وہ جن کو علمائے سو کہتے ہیں ان کا اپنا رویہ کسی طور ان سے مختلف نہیں۔

ایک اور بات جو شہاب صاحب نے بار بار کی ہے وہ یہ ہے کہ اضطراری حالت میں مردار کھانے کی بھی اجازت ہے۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں مگر مردار کھانے کو عادت بنا لینا تو جائز نہیں۔ اب شہاب صاحب اپنے حق میں یہ مصرعہ استعمال کریں گے۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافی لگی ہوئی

بیماری یا بڑھاپے میں لیٹے لیٹے نماز پڑھنا جائز ہے مگر صحت مند اور جوان آدمی کے لیے بستر استراحت کو جائے نماز بنانا قطعاً درست نہیں۔ شہاب صاحب بوڑھے ہو رہے ہیں تو وہ جوانوں کو تو اپنے جیسے کام کرنے پر مجبور نہ کریں۔ لگتا ہے کہ ان کے اندر جوانوں والے کام کرنے کی حسرت بڑھتی جا رہی ہے۔ انہوں نے حالت اضطرار کے لیے جو دوسری مثال دی ہے وہ یہ ہے کہ طبیب (ڈاکٹر) کے لیے بوقت ضرورت جائز ہے کہ عورت کے بدن کا وہ حصہ دیکھے جہاں مرض ہو۔ اس ضمن میں انہوں نے عورت کی جائے مخصوصہ کا ذکر بڑے مزے لے لے کے کیا ہے۔ میں اگر یہ بات لکھتا تو فحاشی کا الزام لگانے والوں میں شہاب صاحب بھی شامل

KitaabPoint.blogspot.com

ہوتے۔اس تذکرے میں شہاب صاحب کی یہ حسرت بھی نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ یہ رعایت صرف ڈاکٹروں کو ہی کیوں حاصل ہے۔ہومیوپیتھی کا ڈپلومہ تو وہ لے سکتے ہیں۔

یہ حدیث بھی بڑے دھڑلے سے شہاب صاحب نے اپنے لیے استعمال کر لی ہے کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔کیا اس ماں کے قدموں تلے بھی جنت ہے جو اپنے پانچ بچوں کو چھوڑ کر اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔اس طرح کی مضحکہ خیز دلیلوں سے شہاب صاحب کیا چاہتے ہیں۔شہاب صاحب کا طرز استدلال سرسید کے اس اسلوب سے بہت کم تر ہے جو انہوں نے انگریزوں کی خوشنودی کے لیے قرآن و انجیل کے حوالے سے اختیار کیا تھا۔شہاب صاحب کے انداز فکر کے لیے زیادہ سے زیادہ متعصبانہ کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے۔انہیں چند ایک مردوں پر بھی غصہ ہے جو گرمیوں میں قمیض اتار دیتے ہیں۔دوسری صورت میں عورتوں کو بھی یہ حق ملنا چاہیے۔ہر بات میں عورت اور مرد کا مقابلہ کیا کیا تماشے دکھائے گا۔

شہاب صاحب کی کئی باتیں ایسی ہیں جنہیں بار بار دہرایا گیا ہے۔اس طرح ایک غیر موثر تکرار کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اگر شہاب صاحب اپنے ان کالموں کو ایڈٹ کر لیتے تو شاید کوئی بات بن جاتی۔ان بے اثر اور بے جواز تحریروں کے مجموعے کو کتاب نہیں کہا جا سکتا۔اس مجموعے میں علمی مزاج کی کوئی لہر نہیں۔چند جذباتی باتوں کی گٹھڑی ہے جو صحیح طرح باندھی بھی نہیں گئی۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

عید کا چاند

سیاست دانوں اور سائنس دانوں کے لیے

عید کا چند ہمارے ہاں ایک محاورے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ عید کا چاند بڑی مشکلوں سے نظر آتا ہے۔ اس کے انتظار میں رمضان کے انتیس تیس روزے بھی رکھنا پڑتے ہیں۔ یہ دیر کے بعد ملنے والے دوست کا خطاب ہے۔ مگر اب عید کا چاند ہمارا قومی مسئلہ بن گیا ہے۔ اب یہ محبوب کی بجائے متنازعہ شخص کے لیے استعمال ہوگا۔ محبوب بھی کم متنازعہ نہیں ہوتا۔

یہ مسئلہ بھی ہماری جگ ہنسائی کا باعث بنا ہوا ہے۔ ہمارے تقریباً تمام تہوار اپنا اعتبار کھو رہے ہیں۔ ہر سال محرم کے دنوں میں شیعہ سنی فساد پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جبکہ کرسمس کے دن عیسائیوں کے لیے اور ہولی یا بسنت کے دن ہندوؤں کے لیے کوئی جھگڑا کھڑا نہیں ہوتا۔ بسنت تو ہم بھی مناتے ہیں۔ اگرچہ ہندو ہمارے کسی تہوار حتیٰ کہ عید میں شامل نہیں ہوتے۔ البتہ عید کے دن نمازیوں پر گولی چلانے کا شغل کر لیتے ہیں۔

ہمارے کئی مسلم ملکوں میں سرکاری طور پر عید کا اعلان نہیں ہوتا۔ بھارت میں ہندوؤں کے بعد سب سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے مگر حکومت عید کے ضمن میں کوئی مداخلت نہیں کرتی بلکہ دلچسپی ہی نہیں لیتی۔ پھر بھی وہاں عید ہر سال منائی جاتی ہے۔ اگر پاکستانی حکومت بھی اس سلسلے میں مہربانی نہ کرے تو بہتر ہو۔ نجانے کیوں ہمارے کچھ لیڈر اور کچھ علماء عید کا چاند نظر آنے نہ آنے کو اپنی ناک کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ صدیوں سے مسلمان عید مناتے چلے آئے ہیں۔ اپنے اپنے شہر اپنی اپنی بستی میں عید ہو جاتی تھی اور بھرپور طریقے سے ہو جاتی تھی۔ اب تو عید کے دن اور چھٹی کے دن میں کچھ خاص فرق نہیں رہا۔ نوبت یہاں تک پہنچنے والی ہے کہ ایک گھر میں عید ہو گی اور سامنے گھر والے روزے سے ہوں گے۔

ایک دفعہ اجلاس کے دوران نماز کا وقت آیا تو قائداعظم نے باقاعدہ یعنی باجماعت نماز کی تجویز مسترد کر دی۔ انہوں نے فرمایا کہ اس طرح لوگوں تک مسلمانوں کے نفاق کا تاثر پہنچے گا۔ ہم دشمنوں کو یہ نہیں بتانا چاہتے ہیں کہ ہم تین چار ہیں۔ جن معاملوں میں ہم ایک ہیں۔ ابھی انہیں کو سامنے لائیں۔ اس عظیم لیڈر کے اندیشے کو اب ہم نے سچ کر دکھایا ہے کہ پاکستان میں متعدد موقعوں پر اجلاس کے دوران وقفہ نماز کے وقت کئی کئی نمازیں ہوئیں۔ شیعہ سنی بریلوی دیوبندی وغیرہ اپنی الگ الگ جماعتیں بنا کر نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ اتحاد بین المسلمین کے ایک مذاکرے کے بعد یہی منظر دیکھنے میں آیا۔ لوگوں نے اس صورت حال سے گھبرا کر

KitaabPoint.blogspot.com

گھروں میں نماز پڑھنا شروع کردی ہے۔اور جماعت کا تصور خواب وخیال ہوتا جارہا ہے۔

یہ تفرقہ حج کے دن مکہ معظمہ میں مٹ جاتا ہے۔ایک موقعہ اور ایک مقام تو ایسا ہے جہاں ہم سب ایک نظر آتے ہیں۔یہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی قوت اور اتحاد کا عظیم الشان مظاہرہ ہوتا ہے۔اگرچہ وہاں بھی کچھ سالوں سے ایک خاص گروہ کی جانب سے جھگڑا پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہیں۔بہرحال اس موقعہ پر ایک امام ہوتا ہے اور ایک ہی جماعت ہوتی ہے۔ہر کوئی اپنے اپنے مسلک کے مطابق نماز پڑھ رہا ہوتا ہے مگر ایک ساتھ پڑھ رہا ہوتا ہے۔

یہاں ایک مسئلہ سوچنے والوں کے لیے پیدا ہوتا ہے کہ حج تو وہی ہے جو کعبۃ اللہ میں ادا ہوتا ہے۔مگر ہمارے ہاں دو دن کے بعد حج ہوتا ہے۔کئی لوگ تو ظہر کی نماز حج کے طور پر پڑھتے ہیں۔یہ ایک مضحکہ خیز صورت حال ہے اگر ہم پوری دنیا کو ایک بستی تصور کریں اور اپنے آپ کو حجاز مقدس کے ساتھ جوڑ لیں۔جب اسلامی مہینہ وہاں شروع ہو۔ہم بھی اس کے ساتھ آغاز کرلیں۔اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔چاند تو دو ایک دن کے بعد ہر کہیں نکل آئے گا۔ورنہ دو دو عیدیں تو پہلے ہی ہمارے ہاں ہوتی ہیں۔اگر ہمارے ہاں عید کے دن کا جھگڑا نہ پڑتا اور ہم رویت ہلال کمیٹی کا فیصلہ منا لیتے تو ٹھیک تھا۔اس کا کیا جائے کہ رویت ہلال کمیٹی والے چاند دیکھ سکیں اور کسی شہر میں چاند نظر آجائے تو پھر کیا ہوگا۔حجاز مقدس میں تو بہرحال ہمارے ملک سے پہلے چاند نظر آئے گا اور ہم کعبۃ اللہ میں ہونے والے اعلان کو اپنے لیے معیار بنالیں تو سارے مسئلے ختم ہوسکتے ہیں۔پھر ہمارے ہاں چاند ایک دن یا دو دن بعد نظر آئے تو کسی طرح کے تنازعے کا احتمال نہ ہوگا۔اس طرح پوری دنیا کے مسلمان ایک ساتھ عید منائیں گے۔ایک ساتھ حج اور قربانی کے فرائض انجام دیں گے۔یہ یکجہتی کا بے مثال مظاہرہ ہوگا اور مسلم اتحاد کی دھاک بیٹھ جائے گی۔اس طرح دوسرے شعبوں میں بھی اتحاد اسلامی کی صورت پیدا ہوگی۔شاید مسلم بلاک کا خواب بھی شرمندہ تعبیر ہوجائے۔ہمارے لیڈر اپنے مسائل کے لیے سال میں کئی بار حجاز مقدس جاتے ہیں اور وہاں رہنمائی لیتے ہیں۔تو اس معاملے میں ان کی رہنمائی کیوں قابل قبول نہیں۔

ایک مسئلہ اسلامی کیلنڈر کا بھی ہے۔اس وقت جو صورت حال ہے تو اسلامی کیلنڈر کی تیاری شروع سال میں ممکن نہیں۔چاند کے نظر آنے اور نہ آنے کی صورت میں ایک دن کی تبدیلی سے پورا کیلنڈر بیکار ہوجاتا ہے۔پوری دنیا میں عیسوی کیلنڈر رائج ہے تو اس کا سبب یہ بھی ہے کہ یہ مقرر تاریخوں کا ایک تسلسل ہے۔مگر اسلامی کیلنڈر چاند کی مہربانی کا محتاج ہے۔ہماری اردو شاعری بھی چاند کی کارستانیوں کے خلافت سراپا احتجاج ہے۔چاند محبوب کے لیے ایک علامت اور محبوب بقول غالب وفا کرنا جانتے ہی نہیں۔سیاست دان بھی کبھی کبھی عوام کے محبوب لیڈر بن جاتے ہیں۔اور وہ بھی وعدہ خلافی اور بے وفائی کا ریکارڈ توڑ دیتے ہیں۔ہمارے اکثر علمائے کرام بھی سیاست دان بن گئے ہیں۔سائنس دان نے عید کا مسئلہ اور گھمبیر کردیا ہے۔اب سائنس دانوں کو اس معاملے میں آگے آنا

KitaabPoint.blogspot.com

چاہیے تاکہ امت مسلمہ اس ذلت آمیز صورت حال سے چھٹکارا پا سکے۔ ایک زمانہ تھا کہ مسلم سائنس دان پوری دنیا کے امام تھے۔ علم کیمیا، علم طبعیات اور علم فلکیات کی بنیادیں مسلمان سائنس دانوں نے رکھی ہیں۔ ''مسلمانوں کا تابناک ماضی'' کے نام سے مولانا حالی نے ایک نظم لکھی ہے جو ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ اس نظم کا آخری بند اس طرح ہے۔

سمرقند سے اندلس تک سراسر انہی کی رصدگاہیں تھیں جلوہ گستر
سواد مراغہ میں اور قاسیوں پر زمیں سے صدا آ رہی ہے برابر
کہ جن کی رصد کے یہ باقی نشاں ہیں
وہ اسلامیوں کے منجم کہاں ہیں

مسلمان سائنس دان رصدگاہوں کے ذریعے ستاروں سیاروں کی رفتار پر نظر رکھتے تھے۔ اور اس طرح آئندہ ہونے والے حالات بھی جان لیتے تھے۔ تو کیا یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ چاند انتیس دنوں کے بعد دوبارہ نکلے گا یا تیس دنوں کے بعد۔ چاند تو زمین کا قریب ترین سیارہ ہے اور زمین کے گرد گردش کرتا ہے۔ اس کی گردش اور رفتار بھی مقرر اور مستقل ہے۔ اب انسان چاند کو تسخیر بھی کر چکا ہے اور اسے اپنا مستقر بھی بنانا چاہتا ہے۔ یوں بھی نظام شمسی کے حوالے سے بہت تحقیق ہو چکی ہے۔ چاند بھی نظام شمسی کا ایک حصہ ہے۔ چاند کے پورے سال کے سفر کا حال بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ سیاروں کی گردش اتنی باقاعدہ اور مستقل ہے کہ ذرا بھر دیر پوری دنیا کو قیامت سے دوچار کر سکتی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں اگر مسلمان سائنس دان چاہیں تو یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو سکتا ہے۔ اس طرح اسلامی کیلنڈر کی تیاری بھی ممکن ہو سکتی ہے مجھے یقین ہے کہ اگر ایٹمی مسئلے کے لیے قدرت ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو پیدا کر سکتی ہے تو کئی اور ایسے لوگ بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے کشش ثقل کے سلسلے میں ریسرچ پر نوبل امن انعام حاصل کیا ہے جو چاند کی گردش سے غیر متعلق موضوع نہیں۔ اگر ڈاکٹر کا اسلام اجازت دے تو وہ یہ کارنامہ کر دکھائیں۔ سائنس کے موضوعات سے میری دلچسپی بہت واجبی ہے۔ مگر میرا دل کہتا ہے کہ یہ ایسا غیر اہم مسئلہ بھی نہیں۔ اس تحقیق کے میدان میں کامیابی کے بعد ممکن ہے فلکیات کے حوالے سے کئی اور حیران کر دینے والی کامیابیاں بھی حاصل ہوں اور تسخیر کائنات کے کئی نئے رازوں سے پردہ اٹھے۔

پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

ممبران اسمبلی جیسے شعرا

ادبستان لوح وقلم کی طرف سے اسلام آباد میں ایک بڑا مشاعرہ تھا جسے کل پاکستان کہا گیا اگر حسن ضامن کو سردار سوز میسر آ جاتے تو یہ عالمی مشاعرہ بن جاتا۔ سردار سوز امریکہ سے آئے ہوئے مستقل مہمان شاعر ہیں۔ وہ جب ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ دو چار دنوں میں امریکہ جا رہا ہوں اگر کبھی وہ گئے تو وہاں بھی پاکستان سے آئے ہوئے مستقل مہمان شاعر ہوں گے۔ کیا کبھی عارضی میزبان بننا بھی انہیں نصیب ہوگا۔ بہرحال یہ ایک قومی مشاعرہ تھا بیگم سرفراز اقبال بڑے شاعروں کی خاطر مدارت میں آگے آگے تھی اس کا بس چلتا تو سب شاعروں کو ہانکتے ہوئے اپنے گھر لے جاتی۔

اس مشاعرے کے مہتمم حسن ضامن تھے لگتا ہے انہوں نے امام ضامن باندھا ہوا تھا وہ محفل میں مسافر لگتے تھے۔ ان کی مدد کے لیے احمد ہاشمی بھی گھوم رہے تھے میزبانوں کے لیے وہ پریشان نہیں تھے کہ وہاں سرفراز اقبال موجود تھیں۔ وہ شاعروں ادیبوں کی مستقل میزبان ہے۔ لاہور سے حسن ضامن کو خالد شریف کی پوری امداد حاصل تھی۔

یہ اسلام آباد کا ایک بڑا ہوٹل ہے یہاں آج کل پنجاب اسمبلی کے ممبران اور مختلف ایجنسیوں کے نمائندے بھرے ہوئے ہیں جیسے بوریوں میں سامان بھرا جاتا ہے۔ آج کل یہ بہت قیمتی سامان ہے ہم کئی لوگوں کو جانتے تھے۔ وہ ہم سے چھپتے پھرتے تھے البتہ ڈاکٹر شفیق بہت محبت سے خود ملے۔ ہم نے سوچا کہ مشاعرہ کرنے والوں کو سامعین کے لیے مشکل پیش نہیں آئے گی۔ آزاد قیدیوں کو اس سے زیادہ اچھی تفریح کہاں ملے گی۔ وہ جو کچھ اسمبلی میں کرتے ہیں یہاں بھی کر سکتے ہیں چنانچہ کچھ شاعروں کی کوششوں سے سہیل ضیاء بٹ اور کچھ دوسرے ممبران کو گھیر کر مشاعرہ ہال میں لایا گیا ایک شاعر نے غزل سنانے سے پہلے ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور دو شعر سہیل ضیاء بٹ کی نذر کیے۔ بٹ صاحب اس طرح کے تحفے سے واقف نہ تھے۔ اس کے باوجود خوش ہوئے۔ کچھ لوگوں نے کھسر پھسر کی ایک آدمی کہیں سے لوٹا بھی اٹھا کے لے آیا اسے سمجھایا گیا کہ آج لفافوں کا دن ہے شاعروں کو بھی لفافے ملیں گے۔ اب ممبران اسمبلی اور شاعروں میں فرق مٹ گیا تھا۔ ہمارے کئی شاعروں پر بالکل ایسے ہی اعتراضات وارد کیے جاتے رہے ہیں۔ ویسے آپس کی بات ہے کہ بہت سے شاعروں ادیبوں کا کردار آج کے ممبران اسمبلی سے مختلف نہیں۔ بس ممبران نے لفافے سے بریف کیس تک کا سفر بہت جلدی کیا ہے جبکہ اہل قلم میں سے یہ صلاحیت اور سعادت چند لوگوں کو نصیب ہوئی ہے اندرون ملک اور

KitaabPoint.blogspot.com

بیرون ملک مشاعرے پڑھنے کے لیے ہمارے کچھ شاعر جو چکر چلاتے ہیں ممبران اسمبلی سن لیں تو چکرا جائیں اور ان کی شاگردی اختیار کر لیں۔ کچھ اہل قلم ان کے استاد بن بیٹھے ہیں البتہ ان کا مقام ٹیوشن پڑھانے والے کاروباریوں جیسا ہے جو اپنے شاگرد کے نخرے بھی برداشت کرتے ہیں کاروباری دور میں یہ تو ہونا تھا۔ جہاں شعراء اور مہمانان کھانا کھا رہے تھے وہاں دیکھنے کو بہت کچھ تھا چنانچہ یہاں گیارہ بج گئے مشاعرہ اس کے بعد ہی ہونا تھا چنانچہ جب آخری شاعر احمد ندیم قاسمی کلام سنانے لگے تو صبح کی اذان بھی سنائی دینے لگی۔ بچی کھچی خواتین نے دوپٹے سر پر لے لیے۔ شبیہ الحسن رضوی کمپیئرنگ کر رہے تھے انہوں نے سماں بندھ دیا ان کی آواز اور یادداشت بہت مضبوط ہے ان دونوں صلاحیتوں کو اداکاری کا رنگ دیکر وہ رنگا رنگی پیدا کرتے ہیں بعض اوقات انہوں نے شاعر کو بلانے میں جو وقت لیا' شاعر نے اتنا وقت کلام سنانے میں نہ لگایا۔ شبیہ الحسن کی غزل بہت اچھی تھی۔ نورین طلعت عروبہ کے اس شعر پر بہت داد ملی۔

جس روز میں ماں بنی اس روز سے مجھ کو
لگنے لگی اچھی مجھے ماں اور زیادہ

مشاعرے میں تالیاں بجا کر داد دی گئی ضمیر جعفری نے جب یہ مصرعہ پڑھا۔

تالیاں بجتی ہیں اکثر احمقانہ بات پر

تو بڑی دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔

احمد فراز کی دونوں غزلیں خوبصورت تھیں۔

ایک مطلع یوں تھا:

اس نے نظر نظر میں ایسے بھلے سخن کئے
میں نے تو اس کے پاؤں میں سارا کلام رکھ دیا

آواز آئی کہ آپ کا کلام اسی جگہ کے لیے موزوں ہے۔ احمد فراز سے لوگوں کو محبت ہے ایک من چلے نے بے تکلفی کرتے ہوئے کہا کہ آپ کا نام احمد خراب ہونا چاہیے۔

کراچی کے کچھ وضع دار شاعروں کو دیکھ کر شبنم شکیل نے کہا کہ یہ دہلی کا یادگار مشاعرہ ہے مشاعرے کے دوران شاعروں نے ایک دوسرے سے کاغذ کی پرچیوں کے ذریعے مکالمہ جاری رکھا۔ کوئی پرچی کسی خاتون کے پاس چلی جاتی تو تھانے میں پرچہ کرانے

KitaabPoint.blogspot.com

کی نوبت آ جاتی۔ اب لوگوں نے بسمل صابری کی بجائے شہناز صابری کو بلانا شروع کر دیا ہے۔ مشاعرے کا آغاز احمد ہاشمی نے کیا تھا۔ پھر تسنیم فاطمہ تسنیم نے خوب تقریر کی۔ پھر شبیہ الحسن نے تقریریں کیں۔ ہال میں شمیم اکرام الحق اور غضنفر ہاشمی بھی تھوڑی دیر کے لیے آئے مگر ان پر کمپیئر کی شاید نظر ہی نہیں پڑی۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

خوش پور میں ایک دن

ایک مکمل مسیحی بستی خوش پور میں شام اتر چکی تھی۔ ایک شفاف ویرانی اور خالص اداسی ماحول میں گھل مل رہی تھی۔ ہم گرجا گھر (چرچ) کے احاطے میں سائمن صاحب کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایک خاصی بوڑھی عورت نے اپنے بچوں کی عمر کے سائمن صاحب کو کہا

فادر جی سلام!

میں حیران ہوا، پھر حیران ہوا۔ دوہری حیرانی میرے اردگرد کھڑی ویرانی سے ٹکرا کر دم توڑ گئی۔ رشتے کسی طرح اپنے رنگ بدلتے ہیں۔ بلکہ رنگ پہنتے ہیں۔ فادر ہونا ایک رشتہ ہے۔ ایک منصب بھی ہے۔ مسٹر سائمن ایک نوجوان پادری ہیں جو خوش پور کے چرچ کے معاملات کے انچارج ہیں۔ ایک واضح بے تکلفی ان کے رویہ میں ہے۔ جو بالعموم مذہبی لوگوں میں نہیں ہوتی۔ زندگی میں کشادگی پھیلتی جا رہی تھی۔

یہاں ہمیں فادر خالد رشید عاصی لے کے آئے تھے۔ خالد سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ فادر پہلی ملاقات میں ہمارا دوست ہو گیا تھا۔ داڑھی والا مسیحی عالم اچھا خاصا مولوی نظر آتا ہے۔ حیران نہ ہوں تو کہوں کہ میرے ایک مسیحی دوست کا نام اعجاز اللہ ہے۔ کون مانے گا کہ خالد رشید عاصی کسی مسلمان کا نام نہیں۔ مسیحوں میں بھی مولویوں کی کمی نہیں۔ مگر خالد تو شاعر ہے۔ ادیب ہے حوصلے اور حکمت والا آدمی ہے۔ مذہبی دنیا میں ایسے کھلے دل و دماغ والے آدمی ہوں تو یہ دنیا کچھ اور شاندار اور جاندار ہو جائے۔

شاید خالد رشید عاصی ہم سے مل کر خوش ہوا تھا۔ وہ ہمیں بھی خوش کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ ہمیں خوش پور لے آنے میں کامیاب ہوا۔ میں اعجاز اللہ نذیر قیصر اور ڈاکٹر جاوید جان فیصل آباد کے مسیحی سنٹر میں پہنچے۔ وہاں سے فادر خالد رشید کے ساتھ چلے شہر سے باہر کھیتوں کے درمیان لیٹی ہوئی دبلی پتلی سڑک استراحت کے موڈ میں تھی۔ ہماری کار کے علاوہ ایک آدھ مسافر بس دو ایک ٹریکٹر کچھ عورتیں اور مرد اور بس۔ ابھی سے تازگی اور فرحت ہم سے لپٹنے لگی تھی۔ خالد کی باتیں مزیدار تھیں۔ گہری اور سچی۔

میں سوچ رہا تھا کہ جہاں صرف عیسائی رہتے ہیں۔ کیسے رہتے ہوں گے یہ تجربہ کیوں کیا گیا۔ جبکہ وہ بظاہر ہماری طرح رہتے ہیں۔ خوش پور پاکستان میں ہے۔ یہ نام کچھ معنی خیز ہے۔ ہمارے ملک میں ابھی خوشیوں کا گہوارہ کہیں نہیں۔ اہتمام اور انتظام سے

KitaabPoint.blogspot.com

خوشیاں تیار کی جاسکتی ہیں۔ مگر انسان خوش نہیں رہتا۔ یہ ناخوشی ضروری بھی ہے۔ ورنہ خالد شاعر کیسے ہوتا۔ ادب کیوں لکھتا۔ ایسا ایسا فقرہ اس سے سرزد ہوتا ہے کہ آدمی ششدر رہ جاتا ہے۔ اس بستی کے رنگ خالد کی باتوں میں رقص کر رہے تھے۔ ایک بستی اس کے دل میں بھی ہے۔ یہ بستی اجڑتی رہتی ہے۔ اس کے دل میں دھول کے پھول کھلتے ہیں۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کی نذر کرتا رہتا ہے۔

پوپ نے کہا تھا کہ پاکستان میں دو شہر ہیں۔ کراچی اور خوش پور۔ یہ بھی کسی نے کہا تھا۔ خوش پور آتے ہوئے مجھے کچھ کچھ لگا کہ جیسے میں یروشلم میں داخل ہو رہا ہوں۔ خوش پور ۱۹۰۱ء میں فادر فلیکس نے بسائی تھی۔ تب وہ کتنا تنہا ہوگا۔ جس طرح چرچ کے احاطے میں مقدس مریم کی بت تنہا کھڑا ہے۔ دودھ سے زیادہ سفید لباس میں اس عظیم عورت کے اردگرد کئی چراغ جل رہے تھے مگر ہر چراغ اکیلا تھا۔ کئی عورتیں مودب بیٹھی تھیں مگر ہر عورت اکیلی تھی۔ میں ایک پراسرا ماحول میں اس پرکشش اور پروقار خاتون کی خدمت حاضر ہوا ایک پاکیزگی ہر طرف برسنے لگی۔ مجھے لگا جیسے مجھے مہربان مریم نے بے نام نعمتوں کا تحفہ عطا کیا ہو۔

یہ بستی بیسویں صدی کی ہم عمر ہے ہمسفر بھی ہوگی۔ ۹۳ برسوں میں بھی اس کی آبادی دس ہزار تک اب پہنچی ہے۔ چھ سات سال پہلے فادر ایوب فرانسس کی دعوت پر یہاں منو بھائی آئے تھے۔ دس گھر مسلمانوں کے بھی ہیں۔ ایک مسجد ہے مسجد میں لاؤڈ سپیکر ہے۔ وہ صرف پانچ دفعہ دن میں بولتا ہے اور جمعے کے دن چھ بار۔ پاکستان میں مسیحی اقلیت ہیں مگر اس بستی میں مسلمان اقلیت ہیں۔ جن مسیحی دوستوں سے میری ملاقات ہوئی وہ مجھ سے بھی زیادہ پاکستانی ہیں۔

صبح سویرے میں فادر سائمن کے ساتھ مشترکہ عبادت میں شریک ہوا۔ ان لوگوں میں جا کے جو میرے ہم مذہب نہ تھے دعا میں شریک ہو کے بڑا مزا آیا۔ خدا انسانوں میں ہے یہ معاملہ پھر ایک بار کھلا کہ مذہب انسانوں کے لیے ہے۔ انسان مذہب کے لیے نہیں۔ جتنے لوگ عبادت کے لیے آئے تھے سب غریب لوگ تھے۔ مسجدوں میں بھی غریب زیادہ ہوتے ہیں۔ دس ہزار کی بستی میں سے ایک سو مرد عورتیں تھیں جو گرجا گھر (چرچ) میں تھیں۔ ایک بوڑھا جو بہت غریب لگ رہا تھا اس کی عقیدت دیدنی تھی عقیدہ بھی اس کے پاس ہے ہمارے پاس نہ عقیدہ ہے نہ عقیدہ ہے۔

مذہب کی تبلیغ زوروں پر ہے اور ابلاغ ختم ہوتا چلا جا رہا ہے مجھے تو تبلیغ کے لیے نکلے ہوئے مسیحیوں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ کیا اس طرح کی تبلیغ سے ظلم کا ازالہ ہوگا۔ کیا پوپ اعظم بوسنیا کی زمین پر ہونے والے ظلم و ستم کو رکوا سکتا ہے۔ عظیم تبلیغی جماعت کے امیر کشمیر میں ہونے والی بربریت کو کس طرح روکیں گے۔ کیا ظالموں پر اپیلیں کوئی اثر کرتی ہیں۔ متکبر کے سامنے عاجزی جرم ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

فادر خالد رشید لکھتا ہے تو لگتا ہے اور نا مطمئن لوگوں کا ساتھ دے رہا ہے۔ وہ اپنے اندر تڑپتا ہوا آدمی ہے۔ وہ سوچتا ہے اور اس کی سوچوں میں سچ فریاد کرنے لگتا ہے۔ یہاں ادبی انجمن ادارہ شعور کے تحت مجلسیں ہوتی ہیں لوگ مل بیٹھتے ہیں اور وہی کچھ کرتے ہیں جو ہم کرتے ہیں۔ نوید والٹر نے ایک چھوٹے سے اکٹھ میں کمپیئرنگ کرتے ہوئے متاثر کیا۔ اس کی اور گمیلی ایل قمر ڈوگرا کی غزلیں اچھی تھیں۔ این عقیل نے نذیر قیصر اور فادر خالد رشید کی غزلیں گا کے سنائیں۔ نوید کو نذیر قیصر کا سارا کلام یاد ہے اس نے سماں باندھ دیا۔ کسی نے کہا کہ یہ پاکستان کا روم ہے۔ ابھی تو یہ ایک تہذیبی روم (کمرہ) ہے البتہ یہ ایک مختلف گھر ہے مگر شاید بے گھری ہمارا مقدر ہے سو ہم چلے آئے۔

ڈاکٹر جان جوزف نے اس کے بارے میں کہا۔ خالد رشید عاصی نے مسجد' مندر اور گرجا گھر پر انسانی دلوں کی برتری کو دہرایا ہے۔ یہ بلھے شاہ کی روایت ہے۔ ان باتوں سے قاضی جاوید کو خلیل جبران یاد آیا۔ مجھے واصف علی واصف ڈاکٹر خیال اور خالد حنیف بھی یاد آیا۔ خالد رشید عاصی کی چند باتیں۔ خاموشی کو اپنے اندر حاملہ ہونے دو یہ حکمت کو جنم دے گی۔

آسمانوں پر نہیں دھرتی پر رہنا سیکھیں

بہت سے مسائل ہیں جنہیں چھوڑ دیا جائے تو خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔

جب ہم مساوات کی بات کرتے ہیں تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہیں۔

عورت عورت کی دشمن نہ ہوتی تو مرد اتنا طاقتور نہ ہوتا۔

عزت دار وہی ہے ہے جو دوسروں کی عزت کرے۔

یوم مئی..... جس دن سرمایہ دار مزدوروں کے جلسے میں مہمان خصوصی بن کر آتا ہے۔

ہر وہ کام مشکل ہے جو کرنے کو جی نہ کرے۔

کتے سے وفاداری سیکھو مگر کتا نہ بنو۔

غریب سے محبت اچھی بات ہے غربت سے نہیں۔

ڈکٹیٹر ہمیشہ مذہب یا نظریے کا سہارہ لیتے ہیں۔

سننا' سنانے سے بہتر ہے

کاش انسانی زندگی ایک ٹیپ ریکارڈر ہوتا کہ انسان اپنی پسند کے دنوں کی کیسٹ لگاتا رہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

سارے لوگوں کو پتہ جائے لگ جائے کہ محبت نہ کرنا جرم ہے۔

خدا نے آنکھوں کی صورت میں انسانی چہرے پر دو کشکول رکھ دیے ہیں۔

معاف کرنا خوب ہے معاف کر کے بھول جانا خوب تر۔

ہر شخص کے پاس کوئی نہ کوئی خزانہ ہے۔

فیصلہ کرنا مشکل ہے مگر فیصلہ کرنا اچھا ہے

ہمارا خدا ایک ہے پھر بھی تیرا خدا اور ہے میرا خدا اور۔

مثبت سوچو زندگی اچھی گزر جائے گی۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

امریکہ سے دوستی یا پوری دشمنی

جب یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا تو الیکشن ہو چکے ہوں گے۔ نہ جانے اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ ہم اس اونٹ کو بیٹھنے ہی نہیں دیتے۔ بیٹھے گا تو پتہ چلے گا کہ کس کروٹ بیٹھا ہے۔ اب تو لگتا ہے کہ سیاست اور حکومت کا اونٹ پاگل ہو گیا ہے۔ اس پر بیٹھے ہوئے لیڈر بھی بوکھلائے ہوئے ہیں۔ اونٹ کا جس طرف جی چاہتا ہے بھاگ اٹھتا ہے کوئی ٹھکانہ نہیں کوئی منزل نہیں۔ لوگ اونٹوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھ دیکھ کر تنگ آ گئے ہیں۔ لتاڑے بھی لوگ ہی جاتے ہیں۔ ظاہر ہے اونٹ پر بیٹھے ہوئے لوگ تو نہیں لتاڑے جائیں گے۔

اس سے پہلے بھی کسی الیکشن کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس الیکشن کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ نقصان ہی ہوگا۔ اب نقصان کی تشریح ہم کیا کریں کہ ہمارے سب سے بڑے آزادانہ منصفانہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے بعد ملک ٹوٹ گیا۔ دوسرے الیکشنوں کے بعد تو اسمبلیاں ہی ٹوٹتی رہیں۔ اب کے ہمارا خیال ہے کہ اسمبلی نہیں ٹوٹے گی کچھ اور ٹوٹے گا۔ ٹوٹنے والی شے کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ اللہ اس ملک کو بچائے مگر جب تک خودغرض' مفاد پرست اور وطن دشمن سیاست دان موجود ہیں اس ملک کے لیے اندیشے اور واہمے بھی موجود رہیں گے۔

اب کے بھی اسمبلی میں تقریباً وہی لوگ پہنچے ہیں جو اس سے پہلے پہنچتے رہے ہیں تو پھر کسی اچھے نتیجہ کی امید حماقت ہے۔ اس بات پر کبھی کسی نے غور کیا ہے کہ ہر بار وہی لوگ اسمبلی میں بیٹھے ہوتے ہیں جن کے بارے میں ساری دنیا جانتی ہے کہ انکا ملک وقوم کی ترقی' خوشحالی' سلامتی اور ناموس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم لوگ بھی ان ہی کو منتخب کرتے ہیں۔ یقین کریں کہ ہر حلقہ میں کوئی نہ کوئی' ایک آدھ آدمی ان سے بہت بہتر امیدوار ہوتا ہے۔ مگر لوگ انہیں گھاس ہی نہیں ڈالتے ووٹ ڈالنا تو بہت دور کی بات ہے۔ شریف' مہذب اور صاحب درد لوگوں کی ہمیشہ ضمانتیں ضبط ہوتی رہی ہیں۔ ٹھیک ہے اگر لوگ اپنی قسمتوں کا ضامن کرپٹ لوگوں کو ہی بناتے ہیں تو کیا کیا جائے۔ یہ المیہ بھی قابل غور ہے کہ لوگوں کے پاس کوئی چوائس ہی نہیں ہوتا۔ بات کم بہتر یا زیادہ بہتر کی ہوتی تو بھی خیر تھی۔ معاملہ بدتر اور بدترین کا ہوتا ہے تو پھر لوگ بے زار ہو کر بدتین ہی کو منتخب کر لیتے ہیں چنانچہ ہماری اسمبلی میں ایسے ہی لوگوں کا جمعہ بازار لگا ہوا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

آخر کس سے گزارش کریں کہ خدا نے آپ کو موقع دیا ہے اس ملک کو ذلت' رسوائی اور تباہی بلکہ واہی تباہی سے بچالیں اور دوبارہ ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہماری تقدیر کی زنجیر نہ دیں جو اس زنجیر سے صرف یہ کام لینا جانتے ہیں کہ انہیں اپنے پالتو کتوں کے گلے میں ڈال لیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ آخری موقع ہے۔ اس کے بعد جو ہمارے ساتھ ہونے والا ہے وہ کبھی نہیں ہونا تھا۔ خدانخواستہ اگر اس ملک کو کچھ ہو گیا تو پھر وہ کچھ ہوگا کہ لوگ قیامت کا انتظار چھوڑ دیں گے۔ ایک قیامت تو اس وقت دیکھی گئی تھی جب یہ ملک بنا تھا۔ ایک قیامت اس وقت دیکھیں گے جب یہ ملک خدانخواستہ نہیں رہے گا۔

میں جو اس ملک میں پیدا ہوا اسی ملک میں مرنا چاہتا ہوں۔ یہ کتنی بدنصیب اور بے یقینی کی بات ہے کہ میرے جاننے والے ایک پاکستانی شہری کی قبر پر فاتحہ کسی اور ملک میں جا کر پڑھیں یہ ملک ظالم سیاست دانوں کی کاروباری جولانگاہ بنا رہا تو پھر یہ کسی نہ کسی دشمن کے ارادوں کی چراگاہ بن جائے گا۔

نگران وزیراعظم معین قریشی صاحب نے اس ملک میں جو بات کی ہے اور جو کام کیا ہے اس میں اچھے دنوں کی خوشخبری کی خوشبو آتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے سیاست دان امریکہ سے دوستی بھی رکھتے ہیں اور امریکہ سے دشمنی بھی رکھتے ہیں۔ یہ دونوں کام ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ یہ بہت بڑی منافقت ہے اور ہمارے سیاست دان اللہ کے فضل سے بہت بڑے منافق ہیں۔ جس بھی سیاست دان یا حکمران نے منافقت چھوڑی اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا یا صفحۂ اقتدار سے ہٹا دیا گیا۔ اب تو ان دونوں صفحوں پر کچھ اور لکھنے کے لیے جگہ ہی باقی نہیں چنانچہ اب اگر کچھ اور لکھا گیا تو کسی اور صفحہ پر لکھا جائے گا۔ میں بڑے درد سے کہہ رہا ہوں کہ وہ صفحہ ہماری کتاب میں نہیں ہوگا۔ سو اگر کوئی لیڈر امریکہ سے دوستی کرنا چاہتے ہیں تو انہیں کرنے دیجئے یا پھر ایسا حکمران لائیں جو امریکہ سے صرف دشمنی کرے۔ اس کا بھی کچھ نہ کچھ نتیجہ نکلے گا۔ رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔ دوستی بھی رسک ہے دشمنی بھی رسک ہے۔ سو میری گزارش ہے کہ آؤ دوستو کوئی ایک رسک لے ہی لیں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

سرگم ٹائم میں بے ادبیاں

فاروق قیصر آج کل اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی تیاریوں میں ہے اور اس کے لیے کئی چور دروازے دریافت کر چکا ہے۔ شاید اس نے اپنے من پسند لوگوں کو سمگل بھی کرنا شروع کر دیا ہو اس کے بغیر تو ہم کہیں داخل نہیں ہو سکتے۔

ایک امریکی' روسی' چینی اور پاکستانی چاند پر جانے کے حوالے سے گفتگو کر رہے تھے۔ امریکی نے کہا کہ ہم اپالو پر بیٹھ کر چاند پر جا پہنچے ہیں روسی نے کہا کہ ہم بھی ایک راکٹ بنانے والے ہیں' چینی نے کہا کہ ہم جو ایک ارب کے قریب ہیں ایک دوسرے کے کندھوں پر چڑھیں گے تو چاند پر اتریں گے۔ پاکستانی کہنے لگا کہ جی ہم تو سمگل ہو کر چاند کی سیر کر آئیں گے۔

بلاشبہ سرگم ٹائم ایک معرکے کا ٹی وی پروگرام ہے۔ ٹیلی ویژن پر جو دکھاوے کے شو ہوتے ہیں۔ ان میں نعیم بخاری اور معین اختر کے نازنخروں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ دونوں اپنی ذات کے دائرے سے نکلتے ہی نہیں۔ انور مقصود کے پروگراموں میں طنز کے پردے میں ایک دانائی ہوتی ہے مگر لگتا ہے کہ انور مقصود کہیں ضرب لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر ہر ضرب کاری ضرب کلیم نہیں ہوتی۔ ردعمل اگر ردی عمل بن جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔

فاروق قیصر جانتا ہے کہ طنز میں رمز بھی ہوتی ہے۔ بس اس کی ایک رمق ہمیں سرگم ٹائم کے پروگراموں میں دکھائی دیتی ہے۔ اس کے لکھے ہوئے فقروں میں فکر ہوتی ہے جو فکرمندی بھی بنتی ہے مگر ہمیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تو ہر اچھی بری بات پر ہنس دیتے ہیں اور بس یہ سمجھتے ہیں کہ اس پر غور کرنا کسی اور کی ذمہ داری ہے۔ اس طرح کے لوگ ملتے نہیں ملتے ہیں تو وہ بھی باتیں ہی کرتے ہیں۔ کوئی ذرا سی گہری بات کرے تو لوگوں کو غوطے آنے لگتے ہیں۔ فاروق قیصر بھی کبھی کبھی اپنے ناظرین کو غوطہ دیتا ہے۔ ہم ڈوبنے سے بہت ڈرتے ہیں۔ کنارے پر ہجوم بڑھتا جاتا ہے کیا کریں کہ ہمارے دریا بھی ہمارے دوست نہیں رہے۔

دل دریا تے سمندروں ڈونگے کون دلاں دیاں جانے ہو

میں تو سرگم ٹائم کے اس پروگرام کی بات کرنے لگا تھا جس کا عنوان تھا ''ادب اور اکیسویں صدی'' ظاہر ہے فاروق قیصر نے یہ پروگرام کوئی ہمارا ادب کرنے کے لیے تو نہیں کیا تھا۔ اس کی بے ادبیاں اچھی لگیں مگر دو ایک باتیں اچھی نہیں بھی لگیں۔ سو ہم بھی کچھ بے نیازیاں کرنے لگے ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

یہ بات تو درست ہے کہ ہر شاعر ادیب چاہتا ہے کہ وہ ٹی وی پر ڈرامہ لکھے اس کے بعد ہی اسے کچھ شہرت مل سکتی ہے۔ چنانچہ اب ڈرامہ نگاروں کی ایک فوج پیدا ہو رہی ہے۔ پہلے جس طرح ایک ٹھیک ٹھاک شاعر ہونے کے لیے کچھ محنت کرنا پڑتی تھی۔ شاعر بھی کم تھے چنانچہ اکا دکا شاعر نکل آتے تھے۔ جب ٹی وی پر ڈرامے کم ہوتے تھے تو دو ایک آدمیوں کی شہرت مل گئی۔ اب روزانہ دو سے زیادہ ڈرامے لگتے ہیں۔ پی ٹی وی ۲ اور ایس ٹی این کو بھی شامل کریں تو یہ تعداد خوفناک حد تک زیادہ ہے۔ چنانچہ اب ٹی وی ڈرامہ بھی کسی شہرت کی شارٹ کٹ نہیں رہا۔ اس کے باوجود بھیڑ چال جاری ہے۔ اس میں کچھ قصور ناظرین اور قارئین کا بھی ہے کہ وہ کسی ادیب شاعر کو گھاس نہیں ڈالتے جب وہ چھوٹا موٹا ڈرامہ نگار بنتا ہے تو اس سے آٹو گراف لینے پہنچ جاتے ہیں۔

سرگم ٹائم میں ہمارے ایک معروف ڈرامہ نگار کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا۔ کسی کو پتہ نہیں کہ کون ڈرامہ نگار مشہور شاعر بھی ہے۔ شاعر کے سر کا سٹائل بھی صاف چغلی کھا رہا تھا کہ کس کی بات ہو رہی ہے۔ اوپر سے اسلام علیکم وعلیکم اسلام بھی کیا گیا تو جناب اس پر احتجاج کرتے ہیں۔

تنقید نگار ناراض موچنا صاحب تشریف لائے ان کے ہاتھ میں تیر تھا۔ سرگم کو معلوم نہیں کہ یہ ہماری ایک بڑی پارٹی کا انتخابی نشان ہے۔ آج کل حسن رضوی کو یہ شعر بہت یاد آ رہا ہے

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

یہ جو سیاسی صاحب ہیں انہوں نے پہلے کسی پروگرام میں نہیں کہا کہ سرگم صاحب آپ یہاں کس کس کو بلاتے ہیں۔

صبا پرویز کی اداکاری اچھی ہے۔ وہ شوپیس بنی ہیں تو سرگم ٹائم شوروم بن گیا ہے۔ ادبی دنیا میں زیادہ تر خواتین شوپیس ہی ہیں۔ جو جینوئن ہیں ان میں سے بھی اکثر شوشا میں رہتی ہیں۔ وہ اداکاری اور گلوکاری کرتی ہیں فنکاری بھی کرتی ہیں اور کامیاب رہتی ہیں۔ مس شوپیس کا یہ فقرہ دو معنی بلکہ سو معنی ہے۔

بچپن سے ہی بڑی عزت ہے ہماری

کسی ڈرامے کی کامیابی پر اداکاروں اور اداکاراؤں سے یہ فقرہ بہت سننے میں آتا ہے۔ بڑی عزت دی ہے جی اللہ نے۔ انہیں اللہ کو بیچ میں لانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ شہرت کے لیے اب عزت کا لفظ استعمال ہونے لگا ہے۔ بری شہرت بھی ہوتی ہے مگر بری عزت نہیں ہوتی۔ اب لوگ عزت کے لفظ کو بھی بدنام کرنے لگے ہیں۔ فقرے بازی اچھی تھی۔ ہماری اہل قلم بھی فقری بازی ہی

KitaabPoint.blogspot.com

کرتے ہیں۔ساری بازیاں ہار چکے ہیں' شہناز کا قہقہہ بھی بعض اوقات فقرے جیسا کام کرتا ہے۔

اک میں اک توں
باقی سارے فٹے منہ

یہ ادیبوں کی عمومی ذہنیت ہے اور خصوصی ذہنیت یہ ہے کہ پبلشر نے پچھلی کتاب کے پیسے نہیں دیئے۔ بے چارے بے روزگار شاعر شاعری کے شوپیس کی سجاوٹ کے لیے کام کرتے ہیں کچھ شاعر و ادیب ایسے ہی کام افسر اہل قلم کے لیے کرتے ہیں کسی کی جھوٹی تعریف میں لکھنا اور کسی کے لیے لکھ کر دینا ایک جیسے کام ہیں۔ پروگرام میں پڑھا گیا ایک شعر ادیبوں شاعروں کی زندگی کی مکمل نمائندگی کرتا ہے۔

اب ہمیں کوئی نہیں پڑھتا
زندگی اک کتاب کی سی ہے

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

ہماری بے بسی اور بے حسی

ایک محفل تھی۔ نجانے کس کے لیے تھی۔ وہاں حفیظ تائب موجود نہ تھے جبکہ اس شخص کی موجودگی ایک آسودگی سی پیدا کر دیتی ہے۔ پھر اس محفل میں ان کے ذکر کی خوشبو تھی۔ آج کل محفلوں پر ان لوگوں کا قبضہ ہے جنہیں ادب کا قبضہ گروپ کہا جا رہا ہے۔ حفیظ تائب کا نام ہماری دنیا میں برکت کی ایک علامت بن گیا ہے۔ اس شخص کا کمال ہے کہ قبضہ گروپ بھی اس کی عزت کرنے پر مجبور ہے۔ یہ لوگ ایسے کام مجبور ہو کر کرتے ہیں ورنہ سارے کام وہ مائل ہو کر کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو ملکی وسائل پر قابض ہیں وہ بھی انہی کے یار دوست ہیں۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔

نعت کے حوالے سے ایک موقعہ بنایا گیا اور حکومت پنجاب کی طرف سے غالباً چار لوگوں کو زر نقد سے نوازا گیا۔ ان چاروں میں حفیظ تائب نہیں تھے۔ ان معاملوں کی حفیظ تائب کو کوئی پرواہ نہیں۔ یہ میرا دکھ ہے اور میں دکھ بیان کرنے میں مصلحتوں کا شکار نہیں ہوتا۔ نوازے جانے والے لوگ شکار ہونے اور شکار کرنے کی اہلیت کو اپنے دل میں رلا ملا چکے ہیں۔ سینکڑوں لوگ صرف سیر و تفریح کے لیے امریکہ انگلستان چلے جاتے ہیں۔ کسی بیماری کے اندیشے میں مبتلا ہو کر کئی چکر لگا آتے ہیں۔ جسے وہ طبی معائنہ کا نام دیتے ہیں۔ یہ سارے لوگ مل کر بھی اس شخص کے برابر نہیں ہو سکتے۔ جو شاد باغ کے ایک چھوٹے سے گھر میں ایک اذیت میں مبتلا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ وہ کسی بھی اذیت کو اذیت نہیں سمجھتا۔

محفل میں جسٹس الیاس نے حکمرانوں ''افسرانوں'' اور سیاست دانوں کو کھری کھری سنائیں۔ جسٹس الیاس خود بھی والہانہ پنس نے نعتیں لکھتے ہیں۔ اس دن وہ مجھے بہت اچھے لگے۔ انہوں نے کہا کہ حکمرانوں اور افسروں نے حفیظ تائب کے لیے میری بات کو بھی درخود اعتنا نہیں سمجھا۔ حفیظ تائب نہیں ہوں گے تو یہ واویلا کریں گے۔ بیانات دیں گے اور بس۔ بڑے افسر اور حکمران کے نابالغ بیٹے کو چھینک بھی آ جائے تو فوری طور پر اسے بیرون ملک کسی بڑے ہسپتال میں شفٹ کر دیا جاتا ہے اور حکومت کے لاکھوں کروڑوں روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ جسٹس صاحب تو ملک کے مخیر حضرات پر بھی برس پڑے کہ وہ بھی یہ کار خیر صرف اپنے مطلب اور اپنی کاروباری مصلحتوں کے لیے کرتے ہیں۔ جسٹس صاحب کی جذباتی تقریر سے سناٹا چھا گیا۔ یہ سناٹا اب ہمارے دلوں میں اتر رہا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

میں گریٹ عمران خان کے کینسر ہسپتال کی تعمیر ایک کارنامے سے کم نہیں سمجھتا۔ اس ہسپتال کے بنتے بنتے نجانے کیا سے کیا ہو جائے گا۔ اس کی تکمیل میں تاخیر بھی ہمارے سرمایہ داروں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ ورنہ عمران خان کے ہسپتال کو یہ تاریخی اعزاز حاصل ہوتا کہ یہاں داخل ہونے والا پہلا مریض اس ملک کا سب سے بڑا نعت گو شاعر ہوتا اور وہ شفایاب ہوتا۔

ایک تقریب حفیظ تائب کے اعزاز میں نبیلہ رحمٰن نے منعقد کی تھی۔ سب اہل قلم اس لڑکی کے شکر گزار ہیں۔ اس محفل میں سب سے خوبصورت مضمون ڈاکٹر آفاق احمد نے پڑھا۔ ڈاکٹر آفاق حفیظ تائب کے معالج بھی ہیں۔ وہ کینسر کے حوالے سے بہت علم رکھتے ہیں۔ یوں بھی وہ صاحب علم آدمی ہیں۔ بہت اچھے شاعر ہیں۔ اتنی اچھی پنجابی نثر کم لوگ لکھ سکتے ہیں۔

انہوں نے اپنے مضمون میں بھی حفیظ تائب کی بیماری اور ان کے صبر استقامت کی بات کی تھی۔

ڈاکٹر آفاق نے ہی بتایا ہے کہ دو روز پہلے حفیظ تائب میرے پاس ''انمول'' میں آئے تو میں پریشان ہو گیا کیونکہ اب ان کا کینسر اس اسٹیج پر پہنچ گیا ہے کہ ان کا علاج پاکستان میں ممکن نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اب یہاں کچھ نہیں ہو سکتا تو تائب بولے کہ اب تو جو کچھ ہونا ہے اپنے وطن میں ہی ہوگا۔ تائب صاحب کی اس بات میں اندیشوں اور یقینوں کی بات کتنی گہری ہو گئی ہے۔ نجانے ہمارے وطن میں کیا ہونے والا بلکہ کیا سے کیا ہونے والا ہے۔ تائب صاحب کہنے لگے کہ میں 63 برس کا ہونے والا ہوں۔ ان کے اس فقرے میں کتنی محبتوں، کیسی کیسی عقیدتوں اور کیا کیا نسبتوں کی آرزو تڑپ رہی تھی۔ آقا و مولا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی 63 برس کی عمر میں وفات پائی تھی۔ حفیظ تائب سچے عاشق رسول ہیں۔ ان کے جذبوں میں ہمکنار ہونے اور بے کنار ہونے کا اضطراب ایک ساتھ رقص کرتا رہتا ہے۔ تائب صاحب علمی و ادبی دینی و دنیاوی حلقوں میں بے حد احترام رکھتے ہیں۔ ان کو فراواں عزت مندی نصیب ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنے بے شمار کرب کو قرب میں بدل لیا ہے اور بے قراریاں سرشاریاں بنتی چلی گئی ہیں۔ یہ جو کینسر کے حوالے سے جسمانی اذیت ہے ان کے لیے ناقابل برداشت ہے مگر وہ یہ حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر آفاق نے بتایا کہ تھوڑے عرصے میں ان کی اس اذیت میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔ اس لیے انہیں بیرون ملک بھیجنا ضروری ہو گیا ہے۔ دردلکشا والے صاحب طرز ادیب نگران وزیر اعلیٰ پنجاب شیخ منظور الٰہی کے ساتھ میں نے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر شاید ان کی نگرانیاں جانفشانیاں بن گئی ہیں۔ ورنہ ہم نے تو کسی وزیر اعلیٰ کے ساتھ رابطے کے لیے کبھی کوئی کوشش تو کیا خواہش بھی نہیں کی۔ چلیے جب شیخ صاحب نگران وزیر اعلیٰ نہیں ہوں گے تو ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ حنیف رامے سے بھی تو کسی ادبی محفل میں ہو ہی جاتی ہے۔ میں شیخ صاحب سے حفیظ تائب کی بات کرنا چاہتا تھا اس سے پہلے بھی وہ تائب صاحب کے لیے اپنی بے اختیاریاں نچھاور کر چکے ہیں

KitaabPoint.blogspot.com

جس کے لیے تائب صاحب شکر گزار رہتے ہیں۔ شیخ صاحب تب کہتے تھے کہ اس ملک میں کسی سچے آدمی کے لیے کچھ نہیں ہوگا۔ اب بھی یہی فقرہ شیخ صاحب کہہ دیتے۔ کیا ہماری حکومتیں صرف جھوٹوں کے کام آتی ہیں۔

میں پورے خلوص کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ حفیظ تائب جیسی بیش بہا زندگی کے سامنے حکمرانوں کی بے حقیقت حیثیت پرکاہ کے برابر بھی نہیں۔ حفیظ تائب کے شعر پڑھ کر لوگ دل میں ایسی ہی سرشاری محسوس کرتے ہیں جو درود شریف پڑھ کر ملتی ہے۔

حکومتیں کروڑوں روپے بے مقصد خرچ کر دیتی ہیں۔ ابھی جو الیکشن ہوں گے ایک ایک حلقے میں کروڑوں روپے پانی کی طرح بہا دیئے جائیں گے۔ بڑے بڑے صنعت کار بھی کروڑوں روپے فنڈز پیش کر دیں گے۔ ہمارے ملک میں سینکڑوں الیکشن ہوں تو بھی حفیظ تائب جیسا ایک آدمی نصیب نہیں ہو سکتا۔ ایسا آدمی کسی بھی مہذب ملک میں ہوتا تو اب تک کیا کچھ نہ ہو گیا ہوتا۔ مہذب ملکوں میں ایک بچی کو بچانے کے لیے سارے وسائل اور ذرائع استعمال کر لیے جاتے ہیں۔ ہم ذرا سوچیں کہ ہم کتنے مہذب ہیں۔

یہ سب کچھ میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں۔ خدا کی قسم مجھے حفیظ تائب نے ہمیشہ یہ سب کچھ لکھنے سے منع کیا مگر میرے پاس تو جذبوں بھرے لفظ ہیں اور کچھ نہیں۔ وہ تو صبر کا پہاڑ ہیں۔ اب حکمرانوں اور سرمایہ داروں سے اپیلیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ جو حاکموں کا حاکم (احکم الحاکمین) ہے اس کے سامنے بھی ہم کیا اپیل کریں گے کہ وہ اپنے محبوب کے سچے عاشق کی کیفیات کو خوب جانتا ہے۔ کاش کوئی کرامت ہوتی۔

امام محمد شرف الدین بوصیری کو فالج ہوا۔ انہوں نے ایک نعتیہ قصیدہ لکھا جو قصیدہ بردہ شریف کے نام سے معروف ہے۔ بوصیری صاحب کو خواب میں رسول کریم اکی زیارت ہوئی۔ انہوں نے بوصیری صاحب سے قصیدہ سنانے کی فرمائش کی۔ قصیدہ سننے کے بعد انہیں اپنی چادر عطا کی۔ صبح ہوئی تو بوصیری صاحب شفایاب ہو چکے تھے۔ حفیظ تائب نیا قصیدہ بردہ شریف کب لکھیں گے۔ **الھم صلی علی محمد**

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

قائداعظم کی سفارش

پنجاب اسمبلی کے سامنے والے چوک میں ٹریفک پولیس والے ایک گاڑی کو روکتے ہیں اور کاغذات دکھانے کا حکم دیتے ہیں۔

سپاہی اپنے افسر کے ساتھ مایوسی کے لہجے میں بات کرتا ہے۔

سر اتفاق سے کاغذات پورے ہیں اور اب تک تقریباً سو گاڑیوں میں سے یہ پہلی گاڑی ہے۔

عجیب عجیب احمق آدمی ہو' کہاں پورے ہیں کاغذ۔ افسر سپاہی پر ناراض ہوتا ہے اور یہ خفگی گاڑی والے پر بھی پھینکتا ہے۔

جناب کاغذات کہاں پورے ہیں۔ ایک کاغذ کم ہے۔

گاڑی والا حیران ہوتا ہے۔ جناب کاغذات پورے ہیں' کون سا کاغذ کم ہے؟

آپ سمجھیں نا۔ ضروری کاغذ تو ہے نہیں ان میں۔

افسر سپاہی کو آنکھ مارتا ہے۔ بھئی اسے سمجھاؤ یہ تو واقعی شریف شہری ہے۔

سپاہی ایک طرف لے جا کر گاڑی والے کو سمجھاتا ہے شہری پچاس روپے کا نوٹ کاغذات پر رکھتا ہے۔

اب ہوئے نا پورے کاغذات۔

قائداعظم کی تصویر کچھ اور سنجیدہ ہو جاتی ہے۔ یہ بھی کہتے سنا گیا ہے پولیس والوں کو کہ جناب ہم جتنی قائداعظم کی سفارش مانتے ہیں کسی اور کی نہیں مانتے۔

لوگوں کا پولیس اور ٹریفک پولیس پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ اچھے لوگ بھی اس شعبے میں ہیں مگر نجانے کیوں عام لوگ تھانے والوں سے نہ انصاف کی توقع رکھتے ہیں نہ رحم کی۔ شاید یہ بات بھی کس حد تک صحیح ہو کہ ٹریفک کے پچاس فیصد سے زائد مسائل ٹریفک پولیس کے پیدا کردہ ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بہت کم لوگ ٹریفک کے اصالوں کی پاسداری کرتے ہیں مگر میں نے ایک سپاہی کو موٹر سائیکل والے کا چالان کرتے ہوئے دیکھا کہ تین آدمی موٹر سائیکل پر بیٹھے تھے۔ میں نے خود اس سپاہی کو ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد کئی دفعہ ایک موٹر سائیکل پر تیسرے آدمی کے طور پر بیٹھ کر جاتے ہوئے دیکھا۔

آج ٹریفک پولیس والے بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہے ہیں کہ انہوں نے کوئی معرکہ سر کیا ہے۔ ایک ایم پی اے کی کالے شیشوں

KitaabPoint.blogspot.com

والی کار کو روکا ہے۔ ٹریفک پولیس والے بتائیں کہ اس سے پہلے انہوں نے کتنی ایسی گاڑیوں کا چالان کیا ہے جو ٹریفک رولز کی خلاف ورزی کر رہی تھیں اور ان پر ایم پی اے کی تختی لگی ہوئی تھی۔ خواہ اندر کوئی اور آدمی بیٹھا ہوا ہو۔ ہمارے ملک میں ٹریفک پولیس کا صرف یہ فرض ہے کہ وہ اپنے حکام کو گزرتے دیکھیں تو انہیں سیلوٹ ماریں۔ وزیراعظم اور وزیراعلیٰ کے لیے راستہ بنائیں وہ راستوں کے مالک ہیں۔ منزل سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ وہ چھوٹے موٹے وزیروں شذیروں اور ممبروں کی پرواہ نہیں کرتے' بس انہیں چالان نہیں کرتے..... اس کے علاوہ بھی کچھ لوگوں کا چالان نہیں کرتے۔ ان کا تو بالکل نہیں کرتے جو ان کی جیب گرم کر دیں۔ اس سے پہلے میں نے اپنے ایک کالم میں لکھا تھا کہ یہاں تھانے بکتے ہیں..... بلکہ اس کے علاوہ کئی دفاتر کا بھی سودا ہوتا ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح بلڈنگوں' سڑکوں کے ٹھیکے دیئے جاتے ہیں۔ ٹریفک پولیس والے کئی چوک بھی خریدتے ہیں۔ اس کے علاوہ لوگوں کے لیے مشکلات پیدا کرنا بھی ان کا مشغلہ ہے۔ ابھی وزیراعظم ائیرپورٹ سے بھی روانہ نہیں ہوئے ہوتے مگر گورنر ہاؤس تک تمام چوراہوں پر لوگوں کو روک دیا جاتا ہے۔ ایسا وزیراعظم نے ہرگز نہیں کہا ہوتا۔ مگر ٹریفک والے اپنی اتھارٹی کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔

جب ٹریفک پولیس کے اے ایس آئی کو حوالات میں بھیجا گیا تو لوگوں کو کوئی افسوس نہیں ہوا۔ انہیں ایس پی ٹریفک کے تبادلے کا بھی افسوس نہیں ہوا مگر آئی جی کو نکال باہر کرنے پر حیرت ہوئی۔ اسے بھی کسی حد تک خوشگوار حیرت ہی کہا جا سکتا ہے کہ کسی شعبے میں اگر کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو ذمہ دار افسر اعلیٰ ہی ہے۔ ریلوے کے حادثے پر جنرل منیجر کو نکال باہر کیا گیا۔ اس پر بھی لوگوں کو خوشی ہوئی۔ اصل میں لوگ تقریباً تمام محکموں کے افسروں سے اتنے تنگ ہیں اور ان کی کھلم کھلا دھاندلیوں اور بدعنوانیوں سے اتنے واقف ہیں کہ انہیں کوئی سزا ملے اور ان کا قصور ہو یا نہ ہو' خوشی ہوتی ہے کہ ابھی یہ ان کے جرائم کے مقابلے میں کم سزا ہے۔

المیہ یہ ہے کہ ایم پی اے صاحبان سے بھی کوئی ہمدردی لوگوں کو نہیں ہوئی۔ لوگوں کو خوشی ہوئی کہ کسی اہل کار نے ان کو بھی ہاتھ ڈالا ہے۔ ورنہ یہ خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا' لوگ ان کے مقابلے میں پولیس کے اس تھانیدار کی زیادہ حمایت کرتے ہیں جس نے ایک مثال تو قائم کی کہ قانون کی خلاف ورزی کوئی بھی کرے گا' پکڑا جائے گا۔ انہیں پکڑنے کی کوشش بھی اچھی لگی ہے جہاں لوگ پولیس والوں کے خلاف وزیراعلیٰ کی فوری کارروائی پر خوش ہیں' اسی طرح قانون کی خلاف ورزی کرنے والے ایم پی اے کے خلاف بھی کارروائی ہونی چاہیے تھی۔ اگر اس وقت ایم پی اے صاحب تھانیدار کو قانونی کارروائی کرنے دیتے تو ان کی نیک نامی ہوتی۔ ہمارے عوامی نمائندوں میں ایسے اوصاف ہونے چاہئیں جو لیڈروں کا امتیاز ہے۔ ممبر اسمبلی کو شاید زیادہ احساس

KitaabPoint.blogspot.com

تھا کہ میں کوئی غیر معمولی مخلوق ہوں۔ بات بات پہ کہنا' ہر کسی سے کہنا "تمہیں پتہ نہیں میں ایم پی اے ہوں" یہ رویہ مناسب نہیں۔

ایک دفعہ شیر جنگل کی سیر کو نکلا اور پانی بادشاہی کو آزمانا چاہا۔ ایک چوہے سے پوچھا میں کون ہوں؟ اس نے ہاتھ باندھ کے جواب دیا۔ جناب! آپ جنگل کے بادشاہ ہیں۔ لومڑی نے اور کئی جانوروں نے با آواز بلند یہ بات دہرائی۔ اتنے میں ایک ہاتھی آیا اور زوردار ٹکر شیر کو دے ماری۔ شیر بے چارہ قلابازیاں کھاتا ہوا دور جا گرا۔ ذرا سنبھلا تو ہاتھی سے کہا کہ اگر تجھے پتہ نہ تھا کہ میں جنگل کا بادشاہ ہوں تو کسی سے پوچھ ہی لیا ہوتا' اتنی جلدی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ٹریفک کے اے ایس آئی کا بھی اتنا ہی قصور ہے کہ اس نے جلد بازی کی۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

عمران خان کے ہسپتال میں

ایک زمانہ تھا کہ لوگ عمران خان سے ملنے کی خواہش کرتے تھے۔ اب عمران خان لوگوں سے ملنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ کس موقع پر کیا عمل کرنا ہے اور ردعمل کیا ہونا چاہیے۔ وہ بے عملی کو بالکل ناپسند کرتا ہے۔ اس نے کھیل کو زندگی جیسی اہمیت دی اور زندگی کے کھیل کو ایک نئی زندگی دینے کی آرزو کو ارادہ کیا۔

وہ بے پناہ قوت ارادی کا آدمی ہے۔ وہ ایک بے نیاز آدمی ہے۔ وہ چندہ جمع کرنے بھی ایسے نکلا ہوا ہے جیسے میدان میں اترتا تھا۔ وہ مانگتا ہے مگر اپنے لیے تو نہیں مانگتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس بھی جو کچھ ہے وہ سب کا ہے۔ اس نے جھولی پھیلائی تو یہ خالی جھولی نہ تھی۔ ایک کروڑ روپے وہ گھر سے لے کر نکلا ہے۔ پھر لوگ اس کے اردگرد اکٹھے ہوئے۔ اس کے ساتھ ہاتھ ملانے کو ٹوٹ پڑے۔ ہر ہاتھ اس کے لیے پھیل گیا۔ میں نے سکولوں کالجوں کے لڑکوں لڑکیوں' چھوٹے چھوٹے بچے بچیوں کو اپنے والدین سے لڑتے ہوئے دیکھا کہ وہ تو پورے پانچ سو روپے لے کر جائیں گے۔ عمران کان کے آٹوگراف لیں گے۔ اس کے ساتھ فوٹو گراف بن گیا تو نعمت مل جائے گی۔

عمران خان نے مشہور ہونے' مقبول ہونے اور محبوب ہونے میں فرق مٹا دیا ہے۔ ایک عجیب طلسم اس کی شخصیت میں ہے۔ اگر مبالغہ نہ ہو تو کہوں کہ قائداعظم کے بعد عمران خان جتنا مقام کسی کو نہیں ملا۔ صاحبان اقتدار کرسی سے اترتے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ نظر ہی تب آتے ہیں جب کرسی پر ہوتے ہیں۔

فلمی ہیرو پردہ سکرین سے ہٹتے ہیں تو زیرو ہو جاتے ہیں۔ کھلاڑی میدان سے نکلتے ہیں تو کہیں کے نہیں رہتے۔ عمران خان ایک شعبے میں سابق ہو کر بھی ہر کسی سے سبقت لے گیا ہے۔

ہمارے ہاں استعفیٰ دینے کا رواج نہیں۔ عمران خان نے اپنے طور پر یہ بھی کیا۔ پھر ساری قوم نے غم کیا اور اسے استعفیٰ واپس لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کو لوگ بے قرار رہتے ہیں۔ وہ خود ان کے درمیان پہنچ گیا ہے۔ ہمارے فنکاروں نے اس کے لیے کام کرنا فخر جانا ہے۔ دانش مندوں نے پہلے بھی اس کے ساتھ رابطے کو ایک سٹیٹس سمجھا تھا۔ اب بھی اسے تھوڑا بہت چندہ دے کر اپنے آپ کو بڑا بنانے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے۔ پہلے بھی وہ عام لوگوں کا محبوب تھا اب بھی انہی کا محبوب ہے۔ وہ اس کے

KitaabPoint.blogspot.com

لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں ل۔ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی نے اس کے لیے کئی پروگرام کیے۔ دلدار بھٹی نے کئی سٹیج سنبھالے۔ وہ ان دنوں کا ذکر بہت اپنائیت سے کرتا ہے۔ وہ دلیپ کمار کا بھی ماننے والا ہے۔ شاید دلیپ کمار ہی ایسا آدمی ہے جو برصغیر پاک و ہند میں عمران خان کے ساتھ کھڑا ہو سکتا ہے۔

حیرت یہ ہے کہ ابھی تک اہل قلم کے ساتھ عمران خان کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ اس دکھ کا اظہار اشفاق احمد نے کیا۔ انہوں نے کہا کہ اب ہم مکمل ارادوں کے ساتھ عمران خان کے ساتھ ہیں۔ عمران خان کو کسی نے خیال نہ دلایا تھا۔ یہ کام بھی ہم سخن ساتھی کے صدر توفیق بٹ نے دکھایا۔ خیال تھا کہ کچھ ہم سخن ساتھی ہوں گے جو عمران خان کی موجودگی میں شوکت خانم میموریل کینسر ہسپتال دیکھیں گے۔ عمران خان کے سرگرم سیکرٹری عنصر جاوید نے اس کے علاوہ بھی اہل قلم کو بلا لیا۔ صحافی بھی آ گئے۔ پورا قافلہ بن گیا۔ اشفاق احمد' ڈاکٹر سلیم اختر' بشریٰ رحمان' اصغر ندیم سید' طارق فاروق' عطاء الحق قاسمی' دلدار بھٹی' جاوید اقبال' ریحانہ' علیم مشہدی' نازلی طارق یوسف' عالمگیر' ڈاکٹر سعادت سعید' انجم یوسفی' یونس خان' علیم مشہدی اور کئی دوسرے لوگوں نے شرکت کی۔

ایک ویرانے سے گزرتے ہوئے ہم وہاں پہنچے جہاں ایک بستی آباد ہو رہی ہے' ایک نو تعمیر منظر میں کوئی تقدیر بن رہی ہے۔ ہم شہر سے باہر نکلے' رستے میں کم کم آدمی ملے۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو کئی قافلے اپنے ہم سفر پائے۔ عمران خان کی ذات میں غیر معمولی صلاحیتیں تو ہیں وہ کچھ غیر مرئی صفات کا آدمی بھی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ویرانیوں سے کئی حیرانیوں کا ظہور ہو گا۔

ہم جونہی ہسپتال کے احاطے میں پہنچے تو کہیں سے نکل کر عمران خان بھی آ گیا۔ اس دن سردی بہت تھی۔ وہ آیا اس نے سادہ سی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اور اس پر ایک عام سی گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ ہم سب جو تہذیبی اور تکلیفی رشتوں کا پرچار کرنے والے کہلاتے ہیں ہم سب سے زیادہ تہذیب کی تصویر صرف وہی لگ رہا تھا۔ وہ کمپلیکس فری آدمی ہے۔ اسے اپنے برتر ہونے کا احساس ہے مگر اسے احساس برتری نہیں کہا جا سکتا ہے۔ احساس برتری احساس کمتری کا بڑا بھائی ہے۔ عمران خان اکیلا ہے۔ اس کا کوئی بھائی نہیں۔ اسے اپنے پاکستانی ہونے کا اتنا شدید اور گہرا ادراک ہے کہ ایسے میں قائداعظم کی شباہت اس کے وجود میں وجد کرنے لگتی ہے۔ ان دنوں وہ کھل کر بلکہ کھل کھلا کر اسلام کی بات کر رہا ہے۔ محمد علی باکسر کا قائل ہے کہ وہ اسلام دشمنوں کے سامنے ڈٹ گیا۔ وہ اسلام کو سمجھنا چاہتا ہے۔ جس طرح قائداعظم نے سمجھا تھا۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ اسلام ایک اعلیٰ اور سیدھا سادہ مذہب ہے۔ اسے وہ لوگ اچھے نہیں لگتے جو اسلام کا نام لیتے ہیں اور فلاحی کام سے کتراتے ہیں۔

اہل قلم کے ساتھ عمران خان کی ملاقات بے تکلفانہ رہی۔ وہ سب لوگوں کو ساتھ لے کر چلا اور ہسپتال کی عمارت کا ایک جائزہ لیا۔

KitaabPoint.blogspot.com

وہ ایک ایک شے کی وضاحت کر رہا تھا۔ ایسے میں اس کا چہرہ سچی شادمانی سے تمتما رہا تھا۔ کامیابی سے پہلے کامیاب ہونے کا یقین زیادہ دل آویز ہوتا ہے۔ کھیل کے میدان میں جانے سے پہلے عمران کی ذات میں کئی میدان قائم ہو جاتے تھے۔ اس کی قیادت میں استقامت کا ایک تاثر ہے۔ جس میں تاثرات گھلتے رہتے ہیں۔

اس کا ہسپتال تو ابھی تعمیر ہو رہا ہے مگر وہ یہ ہسپتال اپنے دل میں تعمیر کئے پھرتا ہے۔ عمران کی تمکنت بتا رہی تھی کہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ ابھی ہسپتال کے اردگرد وسعتیں اور کشادگیاں عمران خان کی ہم سفر ہیں اور وہ اپنی آرزوؤں کا ہمراز ہے۔ عمارت مکمل ہونے والی ہے۔ مگر عمران اب زیادہ منتظر نہیں رہنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ کام تو ہوتا رہے گا۔ ہم اصل کام کا آغاز بھی کرنے والے ہیں۔ یہ کوئی اعلان نہیں عمران اعلان کرنے والوں اور دعویٰ کرنے والوں جیسا نہیں۔ خدا اسے بس اپنے جیسا رکھے۔ وہ اوریجنل آدمی ہے۔ فطری آدمی ہے۔ سچا اور گہرا ہے وہ بات کم کرتا ہے کم بات کرنے والے بولتے ہیں تو اپنا ارادہ نافذ کرتے ہیں۔ ادیبوں کے اس اجتماع میں عمران خان کی باتوں میں فکر، فکر مندی نہیں بنی۔ فکر مندی پھیلانا ہمارے اہل قلم کا شیوہ ہے۔ عمران خان کے لہجے میں دکھ تھا مگر اس کے چہرے پر صرف حوصلہ لکھا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ کچھ اخبار والوں نے لکھا کہ میں نیا مکان بنا رہا ہوں اور ہسپتال کی تعمیر میں غفلت ہو رہی ہے۔ مجھے کوئی بتائے کہ میرا وہ مکان کہاں ہے۔ آپ ہماری مدد کریں مگر یہ کیا کہ نہ تو خود کام کرتے ہیں نہ کسی کو کام کرتے دیکھ سکتے ہیں۔ عمران خان کو اس بات کا بھی افسوس تھا کہ یہ بات اڑائی گئی کہ یہاں غریبوں کا علاج نہیں ہو سکے گا۔ اس نے حسب معمول بہت پکے انداز میں کہا کہ دنیا میں کہیں غریبوں کا علاج ہوتا ہے یا نہیں میرے ہسپتال میں غریبوں کا علاج ضرور ہوگا۔ یہ کریڈٹ انشاء اللہ ایک مسلمان ملک کو حاصل ہوگا۔

ظاہر ہے کہ پورے ملک کے مریض اس ہسپتال سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ دلدار بھٹی نے پہلے یہ بتا دیا تھا کہ یہاں ڈاکٹروں کو ٹریننگ بھی دی جائے گی۔ وہ پورے ملک میں پھیلیں گے اور اس ٹیکنالوجی سے لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ دلدار نے بہت خوبصورت کمپیئرنگ کی۔ یہ کمپیئرنگ کے علاوہ کچھ اور تھا کہ آج دلدار نے چھوٹی چھوٹی کئی تقریریں کیں۔

عمران خان نے بتایا کہ یہاں ریسرچ کا کام بھی ہوگا۔ ہم اپنے وسائل سے بھرپور استفادہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں عمران خان پر بھروسہ ہے کہ وہ ہمیشہ کامیاب کوشش کرتا ہے۔ بعد میں اشفاق احمد نے اس بات کو اس طرح آگے بڑھایا کہ یہاں جو ریسرچ ہوگی اس کے نتیجے میں کینسر کا علاج دریافت ہوگا۔ اس کا سہرا بھی عمران خان کے سر ہوگا۔ ہمارے ہاں بے شمار نعمتیں بکھری پڑی ہیں۔ نعمتیں رازوں کی طرح ہیں۔ اب رازوں کے ساتھ ہماری دوستی نہیں رہی۔ راز یونہی تو منکشف نہیں ہو جاتے۔ اس کے لیے

KitaabPoint.blogspot.com

اپنے اندر بھی اترنا پڑتا ہے اور باہر بھی نکلنا پڑتا ہے۔ عمران خان کے پاس کئی راز ہیں بلکہ ایک ہی راز ہے ایک راز ہو تو پھر کئی رازوں تک رسائی ممکن ہو جاتی ہے۔ کچھ ہے اس شخص کے پاس جو اس عہد میں کسی کے پاس نہیں۔ کرکٹ اور ہسپتال تو اس کے پڑاؤ ہیں' منزلیں کہیں اور ہیں۔ عمران خان کی اہل قلم سے ملاقات ایک یادگار واقعہ بن گئی ہے۔ اسے معلوم ہے اہل قلم درد کی بات کرتے ہیں۔ عمران خان درد کو ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ عمران خان نے بتایا کہ کینسر کی آخری سٹیج پر مریض کو جو درد ہوتا ہے' وہ ناقابل بیان ہے۔ اس وقت اس کے چہرے پر جو جھلک تھی وہ بھی ناقابل بیان تھی۔ ان لمحوں میں کوشش کی جاتی ہے کہ مریض کو درد سے نجات مل جائے۔ عمران نے بتایا کہ ہمارے ہاں وہ پین کلر (درد کو دور کرنے والی دوا) بھی نہیں ہے اور باہر سے منگوانے میں بہت دشواریاں ہیں۔ اس طرح کی چیزیں تو ہمارے ہاں تیار ہونا چاہئیں۔

ہمیں یقین ہے کہ عمران کی بدولت پاکستان کو کئی نیک نامیاں ملیں گی۔ ہمارے ہاں جاڑی بوٹیوں پر پوری دیانت اور محنت سے کام ہو تو شاید بہت بڑی اور بہت اچھی خبریں سننے کو مل جائیں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

سکندر بی اے کو سلام

تحریک پاکستان ایسا عظیم الشان تاریخی واقعہ ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ بے مثال وقت کی کوکھ سے بڑے بڑے آدمی پیدا ہوئے جن کا رتبہ خلوص اور استقامت ہمارے لیے مشعل راہ ہے مگر یوں ہوا کہ پاکستان بننے کے بعد اکثر لوگ گوشہ نشینی اختیار کر گئے۔ مہاجرین کی آمد و رفت، قتل و غارت، لوٹ مار، الاٹمنٹوں کے چکر پرمٹوں کے معاملات اور مسلسل کرپشن کے زیر اثر لوگ بددل ہو گئے، حتیٰ کہ سیاست و حکومت بھی اس کاروبار میں شریک ہو گئی۔ ایک دل جلے شاعر نے یہاں تک کہہ دیا۔

منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

پاکستان میں ایک اور ہی گروہ اقتدار اور وسائل پر قابض نظر آیا۔ وہ لوگ بالکل نظر انداز ہو گئے جنہوں نے پاکستان بنانے میں اپنی کوششیں شامل کی تھیں۔ تحریک پاکستان کو بہانہ بنا کر فائدہ اٹھانے والے اجنبی چہروں والے لوگ تھے۔ پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ پر بھی بڑا برا وقت آیا۔ اسے اقتدار کی سیڑھی بنا لیا گیا۔ مسلم لیگ کئی دھڑوں اور ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ چنانچہ ہمیں سقوط مشرقی پاکستان کا سانحہ بھی دیکھنا پڑا۔ ایک وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنے سامنے پاکستان بنتے دیکھا۔ ایک ہم ہیں کہ ہم نے پاکستان کو ٹوٹتے دیکھا۔ ستم ظریفی ہے کہ یہ دن انہیں بھی دیکھنا پڑا جن کی زندگی میں 14 اگست 1947ء بھی آیا تھا۔ انہی لوگوں میں سے ایک سکندر زمان بی اے بھی تھے۔ اس زمانے میں تحریک پاکستان کا کارکن ہونا اعزاز تھا اور تعلیم یافتہ ہونا بھی ایک افتخار تھا۔ گنتی کے لوگ ایم اے بی اے تھے۔ چنانچہ یہ ڈگریاں جو آج کل ریوڑیوں کی طرح بیچی جا رہی ہیں تب ایک پہچان بنی ہوئی تھیں۔

سکندر خان نیازی ایک درویش منش انسان تھے۔ ساری عمر اپنی دھن میں گزار دی۔ اپنے ملنے والوں کو بھی کبھی نہ بتایا کہ اس خوبصورت آدمی کے سینے میں کتنا خوبصورت دل تھا۔ انہوں نے اس وقت بھی کچھ نہ بتایا جب حکمران تحریک پاکستان کے کارکنوں کو پورے ملک میں ڈھونڈنے نکلے ہوئے تھے اور ان کی عزت افزائی سے اپنے آپ کو معزز کر رہے تھے۔ اس ضمن میں ممتاز محقق اور دانشور ڈاکٹر صفدر محمود کی انتھک کوششیں بھی ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ یہ سارا پروگرام انہی دنوں بنا جب وہ پنجاب کے سیکرٹری اطلاعات تھے۔ میرے خیال میں عالم اسلام کی قیادت کے لیے بھی ایک انٹرنیشنل تحریک پاکستان کا آغاز ہی بکھرے ہوئے اور پسے ہوئے مسلمانوں کی امنگوں کا آئینہ بن سکتا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

ایک تو گلہ یہ ہے کہ جب تحریک پاکستان کے کارکنوں کو میڈل دیئے جا رہے تھے تو بھی ایسے لوگ سرگرم ہو گئے جو ہر زمانے میں صرف مفادات کی جھولی پھیلائے رہتے ہیں۔ سکندر خان نیازی جیسے انسان کو دیر بعد یہ میڈل ملا۔ حیرت ہے کہ پہلی صف میں کھڑے لوگوں پر ہماری نظر کیوں دیر سے پڑتی ہے۔

سکندر خان نے تحریک پاکستان میں جو گراں قدر خدمات سرانجام دیں' بہت پہلے ان کا اعتراف اسلامیہ کالج لاہور کی ایک شاندار تقریب میں ہوا' جس میں جناب لیاقت علی خان اور سکندر خان نیازی کو مجاہد پاکستان کا خطاب دیا گیا۔ سکندر خان واقعی مجاہد تھے۔ انہیں اس دستے کا سالار مقرر کیا گیا تھا جو قائداعظم کی حفاظت کے لیے 1946ء میں بنایا گیا تھا۔ جب دشمنوں کی طرف سے قائداعظم پر حملے کا پروگرام بنایا جا رہا تھا۔ قائداعظم نے ان نوجوانوں سے کہا کہ وہ آرام کریں۔ میرا محافظ خدا ہے مگر سکندر خان اور دوسرے نوجوان تو اپنا فرض پورا کر رہے تھے۔ قائداعظم جب اپنے کمرے سے نکلے ان نوجوانوں سے ہاتھ ملاتے۔ لان میں زمین پر ان کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ قائداعظم کے ساتھ ان کی تصویریں شائع ہو چکی ہیں۔ جب شملہ کانفرنس ہوئی اور قائداعظم کی حفاظت کے لیے رضا کاروں کی ضرورت پیش آئی' قائداعظم نے کہا کہ لاہور سے سکندر خان نیازی اور ان کے ساتھیوں کو بلوایئے۔ قائداعظم کا یہ اعتماد ہی سکندر خان کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ یہ سب تفصیلات اس کتاب میں موجود ہیں جو حکیم آفتاب حسن قریشی نے ''کاروان شوق'' کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں تحریک پاکستان کے کارکنوں کے حالات درج ہیں۔ سکندر خان سیدھے سادے مسلمان اور خالص پٹھان تھے۔ سادہ مزاج' سادہ دل کم آمیز بے غرض تھے۔ اونچے لمبے سکندر خان قائداعظم کے ساتھ تصویر میں بہت خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کے بارے میں کہا گیا کہ زندگی میں نہ سہی مرنے کے بعد انہیں قوم یاد کرتی ہے۔

مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

مگر افسوس یہ ہے کہ اب مرنے کے بعد ہم اپنے اچھے لوگوں اور محسنوں کو یاد نہیں کرتے۔ سکندر خان نے جس خاموشی سے زندگی بسر کی اسی خموشی سے فوت ہوئے۔ شاید ہسپتال کے اس وارڈ میں جہاں ان کا انتقال ہوا' سوائے ان کے اپنے بیٹوں کے کوئی رونے والا نہیں تھا۔

میانوالی میں ان کا جنازہ بہت بڑا تھا' مگر وہاں بھی کوئی قابل ذکر سیاسی لیڈر نہ تھا۔ توقع تھی کہ اس موقع پر تحریک پاکستان کے ساتھ محبت کرنے والے جناب غلام حیدر وائیں اور تحریک پاکستان کے کارکنوں کی سیاست کرنے والے جناب نواز شریف کی طرف

KitaabPoint.blogspot.com

سے جناب سکندر خان نیازی کو یاد رکھا جائے گا مگر ان کی طرف سے کوئی تعزیتی پیغام تک نہ آیا۔ جانے والوں کو یاد رکھنا قوموں کی زندگی بڑھانے کا سبب بنتا ہے۔ سکندر خان نیازی جیسے لوگ کبھی صلے کی کوئی تمنا بھی دل میں نہیں رکھتے۔ ان کے لیے اپنی آرزو ہی کافی ہوتی ہے مگر آرزوؤں کا چراغ بجھنے نہ دینے کے لیے یادوں کی بستی کو ویران نہیں ہونا چاہیے۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے

میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

نہ آزاد، نہ کشمیر

آزاد کشمیر اور سردار عبدالقیوم خان لازم وملزوم ہو چکے ہیں۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے آزاد کشمیر کے ساتھ سردار صاحب کا ذکر سنتے آ رہے ہیں۔ وہ آزاد کشمیر کے سابق صدر ہوتے ہیں کبھی سابق وزیر اعظم۔ وہ آزاد کشمیر کے کچھ نہ ہوں تو عجیب محسوس ہوتا ہے۔ انہیں بھی یقیناً محسوس ہوتا ہوگا۔ وہ صدر آزاد کشمیر تھے تو یہ عہدہ اصل منصب لگتا تھا۔ نجانے انہیں کیا سوجھی کہ وہ یہ عہدہ چھوڑ کے وزیر اعظم بن گئے۔ صدر کا عہدہ آئینی طور پر وزیر اعظم سے زیادہ باوقار ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ صدر فضل الٰہی چوہدری جیسا نہ ہو۔ جب کبھی بھارت کا صدر ہندو نہ ہو کوئی مسلمان یا سکھ ہو تو اس بے چارے کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ پارلیمانی نظام میں بادشاہوں اور صدروں کے پاس اختیارات نہیں ہوتے۔ مگر مہذب قوموں کے لوگ ان کی عزت تو کرتے ہیں۔ ان سے محبت بھی کرتے ہیں۔

جن دنوں گیانی ذیل سنگھ صدر بھارت تھے تو کافی عرصے تک سابق صدر سنجوا ریڈی کا تاثر باقی رہا۔ حالانکہ آدمی وہ بھی ریڈی میڈ تھے ذیل سنگھ دل کے آپریشن کے لیے باہر گئے۔ آپریشن تھیٹر میں تمام انتظامات مکمل ہونے کے بعد ان سے پوچھا گیا۔

آر یو ریڈی؟

تو انہوں نے جھٹ کہا: ''نو آئی ایم ذیل سنگھ''

کچھ لوگ انہیں حسب معمول ذیل سنگھ اور مندرجہ ذیل سنگھ بھی کہتے ہیں۔ انہی کا کمال تھا کہ ان کے دور میں سکھوں کے مذہبی دربار امرتسر کے گولڈن ٹمپل پر حملہ کیا گیا۔ بھارت میں صدر کو راشٹر پتی کہتے ہیں، شوہر کو پتی کہتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک لطیفہ چلا ہوا تھا۔ ایک لڑکی اپنے پتا جی یعنی والد محترم سے جھگڑ رہی تھی کہ میں تو اس آدمی سے شادی کروں گی جو میری نوکری کرے۔ ہر حکم بلا چون وچرا مانے۔ میری جوتیاں صاف کرے اور وہی جوتیاں کھا کے اف نہ کرے۔ باپ نے یہ سن کر کہا: بیٹی تمہیں پتی چاہیے یا راشٹر پتی چاہیے؟

جب صدر قیوم کے وزیر اعظم ممتاز راٹھور صاحب ہوئے تو صورت حال تقریباً وہی ہو گئی جو صدر اسحاق اور بے نظیر بھٹو کے درمیان بن گئی تھی۔ راٹھور صاحب نے اپنی لیڈر بے نظیر بھٹو کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا۔ بے نظیر بھٹو کے اقتدار سے الگ ہونے کے بعد بھی ان کا رویہ وفادارانہ رہا۔ مگر ان کی کئی سیاسی حرکتیں دلچسپ ہیں۔

کوئی پاکستانی لیڈر یہ حیثیت حاصل نہیں کر سکا جو سردار قیوم کو آزاد کشمیر میں حاصل ہے۔ کسی قوم میں کوئی آدمی تو رہنے دیا جائے

KitaabPoint.blogspot.com

جو سب کا لیڈر بن سکے۔ بھارت میں یہ مقام اہل کشمیر نے حاصل کیا۔ وہاں ایک کشمیری خاندان نے حکومت کی۔ نہرو' اندرا اور راجیو۔ راجیو بھی کشمیری ہی کہلائے۔ جب سیاسی وراثت بیٹوں کی وساطت سے چلے گی تو یہ ہوگا ویسے راجیو لگتا بھی کشمیری تھا۔ پاکستان میں بھی وزارت عظمیٰ ایک کشمیری کے ہاتھ میں ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی روشنی میں آزاد کشمیر میں سیاسی افراتفری خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔

مل کے رہو مثل حروف کشمیر

اگر سیاسی سانجھ کی کوئی صورت نہ بنی تو کسی کشمیری سیاست دان کی ساکھ بحال نہ رہ سکے گی۔ ایک کشمیری لیڈر شیخ عبداللہ تھا۔ جس میں قومی سطح کے لیڈر کے اوصاف تو تھے' مگر اس نے کشمیر کی تقدیر کا سودا کر کے سب کچھ گنوا دیا۔ پھر کشمیر کی حکمرانی کا ٹھیکہ ویسے ہی لوگوں کو ملتا رہا۔ انہوں نے کمشیر کا وہی حال کیا جو ہمارے ہاں ٹھیکیدار سڑک بناتے وقت کرتے ہیں۔ لیکن یہ راز کیا ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت نے شیخ عبداللہ کی بجائے کشمیر کے راجہ سے بات کرنا مناسب سمجھا۔ پھر قیام پاکستان کے بعد شیخ عبداللہ اور قائداعظم کے درمیان بات چیت نہ ہونے دی گئی۔ پروفیسر علم الدین سالک نے اپنے شاگرد شیخ عبداللہ کے لیے ذمہ داری قبول کی مگر ان کے گھر پر سی آئی ڈی بٹھا دی گئی۔ قائداعظم نے کہا کہ کشمیر میری جیب میں ہے۔ پھر بقول ان کے اپنے' ان کے جیب سے کھوٹے سکے نکلے۔ اس حوالے سے ہمیں لیاقت علی خان دولتانہ اور خان عبدالقیوم خان آف پشاور سے بڑے شکوے ہیں۔ اس ڈر سے کہ کہیں مذاکرات کی کامیابی کی صورت میں قائداعظم شیخ عبداللہ کو کشمیر کا وزیراعلیٰ نہ بنا دیں' ہمارے کچھ سیاست دانوں نے کشمیر ہی گنوا دیا۔ ادھر نہرو اور شیخ عبداللہ کے مذاکرات کامیاب ہو گئے۔

سردار قیوم' کشمیر کی قسمت کے ستارے بنے ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں لاہور میں ایک پریس بریفنگ کے دوران انہوں نے وہی باتیں کیں جو پچھلے چالیس برسوں سے کرتے آ رہے ہیں۔ سیاست دان تو بیانات بدلنے کو مہارت سمجھتے ہیں۔ سردار قیوم ایک ہی بیان دیئے جا رہے ہیں۔ اللہ کرے سردار قیوم کشمیر کی آزادی کی تحریک کو تاریخ بنانے میں کامیاب ہوں۔ برصغیر میں کوئی تحریک جب تک تحریک پاکستان کا انداز اختیار نہ کرلے' کامیابی ممکن نہیں۔ ایک منچلے کی بات بھی سردار قیوم تک پہنچانی ہے۔

آزاد کشمیر نہ آزاد ہے' نہ کشمیر ہے

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

سیاست میں وراثت

ہمارے مشرق میں والد اگر بڑا آدمی' امیر آدمی' جاگیردار آدمی' افسر آدمی ہو تو اس کا فائدہ صرف اس کی اولاد کو ہوتا ہے۔ ہمارے ممبران اسمبلی وزیر شذیر اور صدر وغیرہ کا فائدہ بھی ان کی اولاد کو ہی پہنچتا ہے۔ دوست بھی فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ ایک گروہ مفاد پرستوں کا ہے' وہ اپنی ''صلاحیتوں'' کے بل بوتے پر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمارے ہاں سیاسی سلسلہ چلتا ہے' وہ اپنی ''صلاحیتوں کے بل بوتے پر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمارے ہاں سیاسی سلسلہ چلتا ہے' جس طرح پیری مریدی میں سلسلے چلتے ہیں۔ ایک آدمی ولی ہو جائے تو پھر ولایت پشت در پشت سفر کرتی ہے اور اب تو روحانیت کا میدان بھی کاروباریوں سے بھر گیا ہے۔ (الا ماشاء اللہ) گدی نشین اور مسند نشین میں فرق مٹ گیا ہے۔ جب سے پیروں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا ہے۔ رہی سہی کسر بھی نکل گئی ہے۔ اقبال نے کہا تھا۔

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

ویسے تو وراثت کی اہمیت پوری دنیا میں ہے لیکن ہماری مشرقی روایات میں وراثت کو کچھ زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بادشاہوں کے بیٹے بادشاہ بنتے چلے آئے۔ جمہوری طرز حکومت میں بھی بادشاہت کے بڑے دلچسپ انداز موجود ہیں۔ کوئی مارشل لائی صدر ہوا یا وزیر اعظم ہوا۔ حاکمانہ لحاظ سے کوئی کم نہ ہوا۔ بادشاہوں کے دور میں اور انگریز حکمرانوں کے دور میں جو اختیارات افسروں اور کلرکوں کو حاصل تھے' آج انہیں وہی اختیارات حاصل ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ افسر کا بیٹا افسر ہوتا ہے اور کلرک کا بیٹا کلرک۔ کلرک بادشاہ سے کسی کو واسطہ پڑا ہو تو اس کی افسری کا علم ہو جائے گا۔ یوں تو لوگ اسمبلی کے ممبران بھی اسی لیے بنتے ہیں کہ افسری کریں گے۔ افسروں سے کام نکلوائیں گے۔ افسروں سے عام آدمی کام کام نہیں لے سکتا انہیں مل بھی نہیں سکتا یعنی کام کہہ بھی نہیں سکتا۔ یہی عام لوگ یعنی ووٹر کام کے لیے اسمبلی کے ممبروں کو کہتے ہیں پھر وہ وزیروں سے کہتے ہیں۔ تماشا یہ ہے کہ ہمیشہ وزیر کا بیٹا قومی اسمبلی کا ممبر ہوتا ہے۔ اس معاملے میں احتیاط اتنی ہے کہ صوبائی اسمبلی کے ممبر کا بیٹا صوبائی اسمبلی کا ممبر ہوتا ہے۔ اسی طرح سی ایس پی کا بیٹا سی ایس پی اور پی سی ایس کا بیٹا پی سی ایس' مزید اسی طرح فوجی کا بیٹا فوجی' فوجی افسر کا بیٹا فوجی افسر' امیر کا بیٹا امیر' غریب کا بیٹا غریب۔

KitaabPoint.blogspot.com

کبھی کبھی ہوتا ہے کہ ہزاروں میں ایک آدمی اپنے باپ کے موروثی سلسلے کو توڑ ڈالے ورنہ یہ چکر صدیوں سے چل رہا ہے۔ موچی کا بیٹا موچی' نائی کا بیٹا نائی' کوئی ایسا آدمی کچھ اور بن جائے تو یہ اتفاق بھی محض اتفاقاً ہی ہوتا ہے۔

ہماری اسمبلیوں میں اب تک ایک سے لوگ پہنچ رہے ہیں۔ صرف 1970ء میں کچھ فرق پڑا تھا جسے 1973ء میں بھٹو صاحب نے خود ہی برابر کر دیا اور پھر وہی چہرے تھے جن کی آنکھوں میں ذہانت نہ تھی۔ وہ وہی کچھ کرتے ہیں جو ان سے پہلوں نے کیا۔ یعنی جو ابا جان نے بڑے بھائی جان نے کیا۔ حد یہ ہے کہ اگر ابا جان حزب اختلاف میں تھے تو یہ بھی حزب اختلاف میں ہیں۔ ابا جان ہمیشہ حکومتی پارٹی میں تھے تو یہ بھی حکومتی پارٹی میں ہیں۔ خان ولی خان کا وہی موقف ہے جو خان غفار خان کا تھا۔ بینظیر بھٹو کی تقریباً وہی سیاسی عادات ہیں جو ذوالفقار علی بھٹو کی تھیں۔

یہ سیاسی موروثیت صرف پاکستان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں مقبوضہ کشمیر میں فاروق عبداللہ وہی کچھ کر رہے ہیں جو شیخ محمد عبداللہ کرتے رہے۔ بھارت میں بھی نہرو خاندان نے اقتدار کو چھ مارا یہ موروثیت بیٹی سے چلی مگر پھر اندرا نے یہ گوارا نہ کیا اور راجیو کو میدان میں آئیں۔ لوگ بھی تو بہت سادہ ہیں۔ وہ موروثیت کو شاید قسمت کے ساتھ منسلک کرتے ہیں۔ اب سونیا گاندھی کے لیے بے تاب ہو رہے ہیں۔ سونیا بھی سیاست دان لگتی ہیں وہ انہیں کچھ اور بے تاب کرنا چاہتی ہیں۔ یہ عورتوں کا ایک پرانا حیلہ بھی ہے۔ بیویوں نے بھی سیاسی عروج کے مزے لوٹے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ شوہر نامدار قتل کر دیئے جائیں۔ مسز بندرانائیکے' مسز خالدہ ضیاء' مسز اکینو کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ امریکہ میں صرف کینڈی برادران سیاسی موروثیت کی ذیل میں آ سکے ہیں۔ بھائیوں میں سیاسی ورثے کی دوسری مثال سعودی عرب کے فرماں رواؤں کی ہے۔

آخر میں بلا تبصرہ ایک واقعہ سن لیں۔

ایک دیہات میں ایک غریب بچہ اپنی ماں سے پوچھ رہا تھا کہ ہمارے نمبردار سے پہلے کون نمبردار تھا۔ ماں نے جواب دیا اس کا باپ۔ بچے نے پوچھا اور اس نمبردار کے بعد کون بنے گا۔ ماں نے جواب دیا۔ اس کا بیٹا۔ بچے نے پوچھا اس کے بعد' تو ماں نے کہا اس کا بیٹا۔ بچے نے پوچھا اس کے بعد تو ماں نے کہا، یہ سارے مر جائیں تو پھر بھی تو نمبردار نہیں بن سکتا۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

اب خدا بھی ہمارے ساتھ نہیں

اب سے کچھ عرصہ پہلے علامہ اقبال نے خود سے یا خدا سے شکوہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

اقبال ملت اسلامیہ کا ایسا شاعر ہے کہ جس کی نظر بیک وقت مسلمانوں کے ماضی' حال اور مستقبل پر تھی۔ چنانچہ ان تینوں زمانوں میں مسلمانوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ بادل ہوں نہ ہوں برق گرتی رہتی ہے۔

مسلمانوں نے مسلمانوں کے خلاف جہاد کیا۔ اس میں غیروں کی سازش شامل تھی۔ غیروں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی۔ اس میں اپنوں کی سازش شامل تھی۔ مسلمانوں کو جب بھی جس طرح ذلیل کیا گیا۔ اس کامیاب کوشش میں کہیں نہ کہیں سازشی منصوبے بنا رہے تھے۔ اس حقیقت کے لیے پوری تاریخ گواہ ہے جو اس ضمن میں کبھی کبھی وعدہ معاف گواہ بھی بن جاتی ہے۔ کئی مورخین اور عدالتوں کے جھوٹے گواہوں میں ذرہ بھر فرق نہیں ہوتا۔ اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے والے تاریخ کا روشن پہلو بھی نہیں دیکھتے۔ وہ تاریخ کو تاریک بنا لیتے ہیں۔

ہم نے خود تاریخ لکھی' کبھی لہو سے کبھی اشکوں سے لکھی۔ کبھی لہو اور آنسو ملا کر کچھ لکھا جو تاریخ بن گیا۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ تاریخ ہمیشہ ہمارے مقابلے میں انتقام بن کر کھڑی ہو جاتی ہے اور ہم زمانے والوں کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

آج جو کچھ بوسنیا کے مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے وہ کچھ عرصہ پہلے اس سے ذرا کم عراق کے مسلمانوں کے ساتھ ہو چکا ہے بلکہ ہو رہا ہے۔ کچھ اور پہلے جائیں تو اتنا کہنا کافی ہے کہ میدان کربلا عراق میں واقع ہے۔ یزیدیوں نے اپنی تاریخ دہرائی مگر حسینیوں نے کیا کیا؟

قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں

البتہ مظلومیت کی لاج بچوں نے رکھ لی۔ ان کی لاشیں خوف زدہ رستوں پر لتھڑے ہوئے پھولوں کی پتیوں کی طرح بکھرتی رہیں۔ ہوا نے بھی انہیں اڑا کر رستے سے ہٹانے سے انکار کر دیا۔

لبنان میں کیا ہوا' اردن میں کیا ہوا۔ برصغیر میں کیا ہوا۔ مشرقی پاکستان میں کیا ہوا۔ مقبوضہ کشمیر میں کیا ہو رہا ہے؟ سوچا جائے تو

KitaabPoint.blogspot.com

شمالی افریقہ کے کالوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ تیسری دنیا کے لوگ جو کچھ بھی ہوں' یورپ امریکہ والوں کے لیے جیسے مسلمان ہیں' اصل جرم تو محروم ہونا ہے مظلوم ہونا ہے اور مسلمانوں سے زیادہ مظلوم' محروم اور کوئی قوم نہیں۔ کوئی اس عذاب میں مثبت دلچسپی لینے والا تھا نہ ہے۔ بنیادی حقوق جمہوریت آزادی کے علمبردار شاید مسلمان کو انسان نہیں سمجھتے۔ مسلمانوں سے انہیں کیا چڑ ہے کیا خوف ہے۔ لمحہ فکریہ ہے' المیہ ہے بلکہ اب تو سانحہ بن گیا ہے۔

مسلمانوں کا خدا تو قرآن میں انسانوں سے مخاطب ہے۔ مسلمانوں کا پیغمبر رحمت اللعالمین ہے۔ اسلام سلامتی کا سندیسہ ہے۔ پھر آخر دنیا والے مسلمانوں کو کیوں مٹا دینا چاہتے ہیں اور حد یہ ہے کہ مسلمان بھی پہلے والے مسلمان نہیں ہیں۔ آج کل مسلمانوں کی دو قسمیں ہیں برائے نام اور بدنام..... پہلے ایک نعرہ بنا تھا۔ اسلام خطرے میں ہے۔ اب یہ نعرہ ہے کہ مسلمان خطرے میں ہے۔ ہمارے حکمرانوں اور سیاست دانوں کے لیے یہ دونوں باتیں صرف سیاسی حربے ہیں۔ ایسا وقت آ گیا ہے کہ ہم اگر اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنا چاہیں تو مشکل ہے کوئی ہمیں غیر مسلمان ثابت کرنا چاہے تو یہ اور بھی مشکل ہے۔ اس وقت ہم کیا ہیں؟ کون ہیں اور کیوں ہیں؟ بس یہ کہ ہم بڑی مشکل میں ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ یہودی ہم سے بھی بڑے خطرے میں تھے۔ اب وہ عالم اسلام اور بنی نوع انسان کے لیے ایک خطرہ بن چکے ہیں اور خطرے کی جمع خطرات ہے۔

بوسنیا میں قتل و غارت کے دوران مسلمانوں سے نہیں پوچھا جاتا کہ تم شیعہ ہو سنی ہو بریلوی ہو وہابی ہو۔ یہ بھی نہیں پوچھا جاتا کہ تم مسلمان بھی ہو کہ نہیں؟ بس تمہارا نام مسلمانوں والا ہے۔ مگر فرقہ واریت کو ہوا دینے والے لہو کی زد میں آ جائیں تو پھر کبھی ان کے خیالات اور عزائم میں تبدیلی نہیں آئی۔ مسلمانوں کی تقدیر بدل جائے گی تاریخ بدل جائے گی بلکہ ہماری تاریخ مٹانے کے منصوبے بن رہے ہیں۔

یہ واقعات تو کئی ملکوں میں ہوئے کہ حملہ آوروں نے سامنے کھڑے شخص سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے وہ شخص بالکل ان جیسا تھا۔ انہی کی زبان بولتا تھا۔ انہی جیسے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا نام بتایا تو گولی اس کے جسم کے آر پار چلی گئی تھی۔ لہو گرا۔ دکھ یہ ہے کہ اس لہو نے بھی اس کا نام زمین پر لکھنے سے انکار کر دیا۔ حملہ آور سب کچھ روند کے جا چکے تھے۔ اس شخص کا نام اس کے دل میں رہ گیا اور فضا میں بکھر گیا۔ نہ دل ہمارے ساتھ ہیں نہ فضا ہمارے ساتھ ہے۔ تو پھر ہمارے ساتھ کون ہے؟ شاید ہم خود اپنے ساتھ نہیں ہیں تو ہمارا خدا بھی ہمارے ساتھ نہیں ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

مجھے ایک بزرگ صحافی حمید جہلمی نے بتایا کہ انکے گھر میں ایک بلی اپنے بچے کے ساتھ رہتی تھی۔ سارا ماحول اس کے والہانہ پیار سے سرشار تھا۔ بچہ مر گیا تو بلی افسردہ ہوگئی۔ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ وہ اپنے بچے کی لاش اٹھا کے پودوں میں چھپ گئی اور چپکے سے روتی رہی۔ ہم نے اس خیال سے کہ بچے کی لاش بدبو دینے لگے گی' اسے اٹھایا اور دور پھینک دیا مگر بلی بھی ساتھ چلی اور وہیں جا کر بیٹھ گئی ہم تو آ گئے مگر وہ کب تک وہاں بیٹھی رہی یہ ہمیں معلوم نہیں۔ بوسنیا میں خون ناحق خون ارزاں یعنی خون مسلم کی پھواروں میں بھیگی ہوئی ماں ایک بلی جتنی قسمت بھی نہیں رکھتی۔ وہ صرف ایک مسلمان عورت ہے جس نے ایک مسلمان بچے کو جنم دیا ہے۔ اس کا بچہ اس کے سامنے تڑپتا ہے مگر وہ اسے اٹھا کے اپنے ویران سینے سے نہیں لگا سکتی۔ وہ اپنے بچے کی لاش کہیں چھپا بھی نہیں سکتی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسے ایک ضبط کئے ہوئے آنسو کی طرح اپنی آنکھوں میں چھپا لیتی۔ وہ کتنی بدقسمت ہے۔ جس قوم کی مائیں اپنے بچوں کی لاشوں سے چمٹ کے رو نہ سکیں' انہیں گلے سے لگا کر کون روئے گا۔ وہ رونا نہیں بھولیں مگر ان کے آنسوان سے بھی زیادہ بے بس ہیں۔ سنتے تھے کہ آنسوؤں میں بلا کی طاقت ہوتی ہے۔ بہتے ہوئے لہو میں بے پناہ جلال ہوتا ہے۔

بوسنیا والو! تمہیں دیکھ کر ہماری ہمت بھی جواب دے رہی ہے۔

یہ مظلومیت کی انتہاء ہے کہ آنسو اور لہو اس درجے پر پہنچا دیا جائے۔ پھر اس کے بعد عذاب آتا ہے یا انقلاب' عذاب تو آ چکا ہے انقلاب کب آئے گا؟ یہ سوال ہے اور جواب گم ہے۔ ہم مسلمان ایک گمراہ قوم ہیں مگر ہر بار دشمن کہیں نہ کہیں ہمیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شاید یہ ہمارے گم ہونے کی ایک نئی کہانی ہوتی ہے۔ کچھ تو ہے کہ ہم گم تو ہوتے ہیں۔ پوری طرح گم نہیں ہوتے۔

کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں
مانا وہ تب و تاب نہیں اس کے شرر میں

جو چیز تلاش کرنے والی وہ تب و تاب ہے مگر ہم پہلے شرر تو تلاش کر لیں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

ماں کا انصاف

ایک تصویر شائع ہوئی جس میں وزیراعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو اپنی بیٹی بختاور کے آنسو پونچھ رہی ہیں' اسے چپ کراتے ہوئے ممتا ان کے چہرے پر پوری طرح مچل رہی ہے۔ اس لمحے وہ ایک لیڈر اور سیاست دان نہیں صرف اور صرف ماں ہیں۔ اگر وزیراعظم کی حیثیت سے بھی وہ تھوڑی سی ممتا اپنے اندر پیدا رکھتیں تو قوم کا بڑا بھلا ہوتا ہے۔ آج بھی غریب لوگ حکمرانوں کو مائی باپ کہتے ہیں مگر تاریخ میں بہت کم ایسا ہوا کہ کسی حکمران نے عوام کو اپنی اولاد سمجھا ہو۔ عورت بہترین استاد ہوتی ہے۔ وہ حکمران بھی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ خدمت کرنے کا جذبہ فطری طور پر عورت کے خمیر میں رکھ دیا گیا ہے۔ کہاوت ہے۔

ہر کہ خدمت کرد' مخدوم شد

خدمت کرنے والے سچے حکمران ہوئے مگر عورت نے اپنے اندر عورت کو قتل کر دیا ہے۔ میرے خیال کے مطابق آدمی دو دفعہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک اپنی ماں کے پیٹ سے اور دوسری دفعہ اپنی عورت کے دل سے۔ عورت کے اندر بیک وقت کئی عورتیں ہوتی ہیں۔ ماں' بیٹی' بہن' بیوی اور کئی عورتیں۔ ان سب عورتوں میں ایک عورت مشترک ہوتی ہے۔ وہ ہے محبت کرنے والی ہستی۔ کرنے والا ہی محبوب ہوتا ہے۔ اس لیے کائنات میں عورت سے زیادہ محبوب چیز اور کوئی نہیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو لیڈر ہیں۔ لوگوں نے انہیں ووٹ دے کر وزیراعظم بنایا۔ کیا وہ صرف بختاور کی ماں ہیں۔ اس ملک میں لاکھوں بختاوریں ہیں جو رات دن روتی رہتی ہیں اور ان کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں۔ جن شہروں میں گھروں سے بچوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیتی ہوں وہاں کبھی سلامتی اور رحمت کا نزول نہیں ہوتا۔ بچے تو سب کے سانجھے ہوتے ہیں۔ وہ کسی تفریق کو نہیں مانتے۔ غریب بچے بھی اسی طرح شاہانہ سوچ رکھتے ہیں جس طرح امیر بچے مگر جب تفریق بچوں کے ذہن میں بھی آگ لگا دے تو پھر ان شعلوں کو بجھانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔

مزدور عورتیں بچوں کو سامان کی طرح گٹھڑی میں باندھ کر کندھے سے لٹکا لیتی ہیں اور سارا دن کام کرتی ہیں۔ وہ بچوں کے رونے کی آوازیں سنتی ہیں مگر ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ انہیں چپ کرا سکیں۔ بچے ماں کے پیار سے محروم رہ جاتے ہیں اور ان کی شخصیتیں ادھوری ہوتی ہیں۔ وہ زندگی کو ایک مکمل کیفیت میں کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارے لاکھوں بچے ایسے بھی ہیں جو دن بھر ہوٹلوں پر برتن دھوتے ہیں مگر پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ وہ دکانوں پر مکینک بننے کی کوشش میں اپنی ایک خواہش بھی دل میں زندہ

KitaabPoint.blogspot.com

نہیں رکھ سکتے۔ وہ سکول کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ وہ کتاب کا صفحہ نہیں کھول سکتے۔ وہ سڑکوں پر کھیل کود نہیں سکتے۔ وہ گھر میں بھی وقت نہیں گزار سکتے۔ ان بچوں کا قصور یہی ہے کہ یہ غریبوں کے گھروں میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ماں باپ کے پیار سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کے نصیب میں جھڑکیاں' گالیاں اور تھپڑ ہوتے ہیں۔ وہ رونا بھی بھول جاتے ہیں۔ وہ کیسے روئیں کہ کوئی انہیں چپ کرانے والا نہیں ہوتا۔

جب وزیروں امیروں کے بچے ان کے ساتھ دوروں پر جاتے ہیں اور ان کی تصویریں بھی اخباروں میں چھپتی ہیں تو دنیا کا کوئی آدمی ان بچوں کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ جنہوں نے اپنے ہی شہر کا کوئی تفریحی مقام بھی نہیں دیکھا ہوتا۔ رشتے اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔ اب تو ماں کا رشتہ بھی مشکوک ہو گیا ہے۔

یہ خبر تو برسوں کے بعد آتی ہے کہ کسی ماں نے بچے کے لیے جان قربان کر دی مگر اس طرح کی خبریں اکثر پڑھنے کو ملتی ہیں کہ سات بچوں کی ماں اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی۔ اس المیے پر غور کرنا چاہیے ورنہ یہ روایت بھی ختم ہو جائے گی کہ دکھ اور تکلیف کے موقع پر خدا یاد آتا ہے یا ماں یاد آتی ہے

ماواں ٹھنڈیاں چھاواں

ہماری ایک روایت یہ بھی تھی کہ پورے گاؤں میں ایک کی ماں سب کی ماں ہوتی تھی۔ عظیم عورتوں نے کبھی اپنی بچوں اور دوسرے بچوں میں فرق نہ کیا تھا۔ اب تو ماں اپنے بچوں کے لیے بھی وقت نہیں نکال سکتی۔ ایک تو مجبوری ہے اور دوسری مصروفیت ہے جو جدید زندگی نے ہمیں عطا کی ہے۔ بچے نوکروں کے پاس ہیں اور ماں فنکشن میں گئی ہوئی ہے!

آخر کیا وجہ ہے کہ قائداعظم کے بعد کوئی سربراہ مملکت نہ تھا جسے لوگ اپنے باپ کی طرح سمجھتے اور فاطمہ جناح کے علاوہ کسی کے لیے ماں کا خطاب نہ ہوا؟ ماں کا پیار ایک اٹل حقیقت ہے۔ ماں کا انصاف بھی ہوتا ہے۔ پیار اور انصاف میں کوئی فرق نہیں ماں جب دیکھتی ہے کہ اس کے ایک بیٹے کے پاس بہت روپے ہیں تو اس سے لے کر اپنے اس بیٹے کو دے دیتی ہے جس کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ اگر معاشرے میں ماں کا پیار اور ماں کا انصاف نافذ کر دیا جائے تو ایک مثالی ماحول قائم ہو جائے۔ ماں جس طرح گھر کو چلاتی ہے پورے ملک کو اس طرح چلایا جائے تو کوئی مسئلہ باقی نہ رہے۔ بے نظیر بھٹو صاحبہ بھی ساری بختاوروں کی ماں بن کر سوچیں۔ شاید قوم خوش بخت ہو ہی جائے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

شکریہ لیڈی ڈیانا اور معذرت

برطانیہ کی ہونے والی متنازعہ ملکہ لیڈی ڈیانا پاکستان آ کے چلی بھی گئیں مگر ابھی تک ان کی باتیں ہو رہی ہیں۔

جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

سروقد لیڈی صاحبہ سچ مچ شہزادی ہیں۔ ہم تو اپنے ہاں گوری چٹی لڑکی کو شہزادی سمجھتے ہیں۔ اتفاق سے ہی ہماری لڑکیاں گوری ہوتی ہیں۔ مجھے تو سانولا رنگ پسند ہے کہ یہ مشرق کا رنگ ہے جبکہ ہماری عورتیں سانولے ہونے کی بدقسمتی سمجھتی ہیں اور خود کو گورا کرنے کے لیے ہزار جتن کرتی ہیں۔ میک اپ کے ذریعے شہزادی بننے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ مغرب میں ہر لڑکی قدرتی طور پر گوری ہوتی ہے۔ قدرت ان لوگوں پر بہت مہربان ہے۔ ہماری جوان بلکہ اچھی خاصی جوان لڑکی کو بمشکل گوری کہتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ صدر ایوب کے زمانے میں ملکہ الزبتھ پاکستان آئی تھیں۔ ان کی پذیرائی زیادہ ہوئی تھی۔ دو پٹھانوں نے ان کو دیکھا تو بڑے حیران ہوئے۔ ایک نے کہا بڑی سرخ سوہنی ہے۔ دوسرا بولا گڑ بہت کھاتی ہوگی۔ پٹھانوں کے لیے تب گڑ ہی سب سے بڑی نعمت تھی۔ ہماری نظر میں نعمتیں آج بھی ایسی ہی ہیں بلکہ ایسی ویسی ہی ہیں۔

پذیرائی تو لیڈی ڈیانا کی بھی بڑی ہوئی ہے۔ لوگوں نے ان کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں۔ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ لیڈی صاحبہ بہت خوبصورت ہیں۔ مغرب زادیوں کو دیکھ کر ان کے حسن کی تعریف کی جائے تو وہ خوش ہوتی ہیں بلکہ شکریہ بھی ادا کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی عورتیں خوش ہوتی ہیں بلکہ اتنی کوش ہوتی ہیں کہ گالیاں نکالنا شروع کر دیتی ہیں۔ لیڈی ڈیانا تو بہت باکمال خاتون ہیں۔ ہر وقت ہنستی مسکراتی ہوئی کھلتی کھلکھلاتی ہوئی۔ وہ جس طرح سے گزر گئیں' فضائیں جھوم اٹھیں۔ راتوں رات سڑکیں ٹھیک ہو گئیں۔ گندگی اٹھالی گئی۔ سارے منظر سج گئے۔ دیر تک علاقے آباد اور شاد دکھائی دیتے رہے۔

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

اصل میں غیر ملکی معزز مہمانوں کو صرف وہاں لے جایا جاتا ہے جو بہترین علاقے ہیں۔ لیڈی ڈیانا کو سانده کلاں لے جاتے' چنگڑ محلے لے جاتے جہاں اب بھی بارش کا پانی کھڑا ہوگا۔ ساڈی گلی آ ماہیا۔ وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل آئیں جو ان کے دادا سسر کے عہد کی

KitaabPoint.blogspot.com

یادگار ہے۔ کنیئرڈ کالج گئیں۔ یہاں صرف شہزادیاں یعنی امیر لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ کوئی غریب لڑکی کتنی خوبصورت ہو اسے شہزادی کون کہے گا۔ ویسے آپس کی بات ہے کہ شہزادی صاحبہ کو کسی کچی بستی میں بھی لے جاتے اور وہ مزدور عورتوں اور میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑوں والی لڑکیوں سے بھی ملتیں۔ انہیں یہ تاثر ملتا کہ پاکستان غریب اور ان پڑھ لوگوں کا ملک ہے۔ جو لوگ لیڈی ڈیانا کی سکرٹ پر اعتراض کر رہے تھے انہوں نے ان لڑکیوں کے بارے میں سوچا ہے جن کے پاس جسم چھپانے کو کپڑا نہیں ہے۔ سیدہ عابدہ حسین سے مل کر اور مال روڈ سے گزرتے ہوئے لیڈی صاحبہ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر نہ گئی ہوں کہ پاکستان ایک ترقی یافتہ اور ماڈرن لوگوں کا ملک ہے۔ بے نظیر بھٹو کی عدم موجودگی کو لیڈی ڈیانا نے محسوس کیا۔ خاقان خاور کا شعر ہے۔

یہ تو جنت کا نمونہ ہے انہیں کیا کہیے
گھر کے وہ گوشے جو مہماں کو دکھائے نہ گئے

ہم لیڈی ڈیانا کے شکر گزار ہیں کہ ان کی وجہ سے یہاں بڑی رونق رہی مگر ہم ان سے معذرت خواہ بھی ہیں کہ لاہور میں شاہی مسجد والے واقعے کے بعد کچھ بدمزگی بھی ہوئی۔ پتہ نہیں کس بے وقوف نے انہیں شاہی مسجد دیکھنے دکھانے کا مشورہ دے دیا۔ ہم بھی کیا کریں کہ ہمارے پاس معزز مہمانوں کو دکھانے کے قابل اور کوئی جگہ ہی نہیں۔ کچھ مغلوں کی بنائی ہوئی عمارتیں ہیں' کچھ انگریزوں کی' کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج اور گورنر ہاؤس انگریزوں کا شاہی قلعہ اور شاہی مسجد مغلوں کی۔

ویسے تو مسجد ہمارے طرز تعمیر کی وسعتوں اور عظمتوں کی نشانی ہے۔ یہ صرف نماز ادا کرنے کی جگہ نہ ہوتی تھی۔ یہ اسلامی تہذیب کا گہوارہ اور اسلامی ریاست کا مرکز تھی۔ لیڈی ڈیانا بھی شاہی مسجد میں تشریف لے گئیں اور مسلمانوں کی کشادہ نگاہی سے متاثر ہوئیں۔ انہوں نے اپنے رواج کے مطابق لباس پہنا ہوا تھا۔ یہ لباس سبز رنگ کا تھا جو ہمارے قومی پرچم کا رنگ ہے۔ ہمارے لوگوں نے اس بات کو نہیں سراہا۔ اس بات پر تنقید کی کہ انکے گھٹنے نظر آ رہے تھے۔ اندازہ کریں کہ ہمارے لوگوں کی نظریں کہاں ہوتی ہیں۔ ہم میں سے کوئی دھوتی باندھ کر انگریزوں کے گرجا گھر میں چلا جائے تو وہ قطعاً برا نہیں منائیں گے۔

مولانا عبدالقادر آزاد کو بھی برا بھلا کہا جا رہا ہے۔ انہوں نے لیڈی صاحبہ سے ہاتھ کیوں ملایا۔ مولانا آزاد کے سیاسی معاملات و نظریات سے مجھے بحث نہیں کرنا لیکن یہ بات افسوس ناک ہے کہ دوسرے کئی لوگوں نے لیڈی صاحبہ سے ہاتھ ملایا۔ یہ منظر ٹی وی پر بھی دکھایا گیا۔ کسی کو اعتراض نہ ہوا پھر مولانا آزاد نے کوئی مختلف جرم تو نہیں کر دیا۔

ایک داڑھی والے سائیکل سوار کی کسی کے ساتھ ٹکر ہو گئی تو اسے بہت برا بھلا کہا گیا کہ داڑھی رکھی ہوئی ہے اور ٹکر ماری دی۔ اس

KitaabPoint.blogspot.com

نے کہا جناب یہ داڑھی ہے بریکیں تو نہیں۔ ہم نے اچھے برے کاموں کے لیے مختلف لوگوں کے لیے مختلف معیار کیوں قائم کیے ہوئے ہیں۔ مولانا آزاد نے لیڈی صاحبہ کو چادر تحفہ دی بلکہ چادر اوڑھا دی یہ تو ہماری روایات میں سے ہے کہ ہم گھر آئی خواتین کو دوپٹہ یا سر کی چادر دیتے ہیں۔ مولانا اور کیا کرتے۔ لیڈی صاحبہ کو چوڑیاں تحفے میں دیتے۔ قرآن کا تحفہ بھی ایک اچھی روایت ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ اس وقت لیڈی صاحبہ پورے لباس میں نہ تھیں اور کیا مولانا آزاد نے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ لیڈی صاحبہ پاک صاف ہیں۔ بتایا جائے کہ آخر یہ اطمینان کس طرح ممکن ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن ہر زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ لیڈی صاحبہ از خود بھی قرآن کہیں سے لے کر پڑھ سکتی ہیں۔ اس وقت انہیں کون روک سکے گا کہ وہ باوضو ہیں یا نہیں۔

مولانا آزاد کے خلاف جو بیان دیئے گئے ہیں کہ ان کی زد میں لیڈی صاحبہ بھی آ گئی ہیں جو مقدمہ مولانا آزاد کے خلاف دائر کیا گیا اس میں لیڈی ڈیانا بھی فریق ہیں۔ وہ یہ سوچتی ہوں گی کہ کیا دنیا کی سب سے بڑی مہمان نواز قوم کا یہ طرز عمل ان کی روایات کے مطابق ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ عدالت نے مقدمہ خارج کر دیا اور مقدمہ دائر کرنے والے کو دو ہزار روپے جرمانہ بھی کر دیا۔ یہ دو ہزار لاکھوں میں سے ایک پاکستان عورت کو ملنا چاہیے جس کے سر پر چادر نہیں جس کے گھر میں قرآن نہیں۔

ہمارے کچھ لوگ ایسے موقعوں پر شور مچاتے ہیں اور ایمان خطرے میں محسوس کرتے ہیں ورنہ ہمارے ہاں دن دیہاڑے عورتوں کی جبری آبروریزی کے واقعات ہوتے ہیں اور کسی طرف سے صدائے احتجاج بلند نہیں ہوتی۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

بچپن کی محبت کو.....

پچھلے دنوں بچوں کا عالمی دن منایا گیا۔ میں سوچتا رہا کہ کیا یہ دن ہمیں منانے کا حق ہے۔ ہم جو دن مناتے ہیں دراصل اپنا مذاق اڑاتے ہیں۔ ہمارے بس کنڈیکٹر، پولیس والے اور دوسرے لوگ ہفتہ خوش اخلاقی کا بیڑا غرق کرتے ہیں۔ یہ دن منانے کا رواج بھی ہمارے ہاں مغرب والوں کی وساطت سے پڑا ہے۔ ہم اندھا دھند ان کی تقلید کرتے ہیں۔ مگر اس کی حیثیت ایک رسم سے آگے نہیں بڑھتی۔ جب اس طرح کوئی فائدہ نہیں ہوتا تو ہم بغیر سوچے سمجھے اہل مغرب کو برا بھلا کہتے ہیں اور اپنی محرومیوں کے لیے جھوٹی تسلی کا اہتمام کرتے ہیں۔ مغرب والے ہمارے ہی کئی میدانوں میں ہم سے آگے نکل گئے ہیں۔

بریڈفورڈ انگلستان میں ایک پاکستانی صبح سویرے اپنے بچوں کو سکول چھوڑنے جا رہے تھے تو میں بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ میں نے دیکھا کہ تمام کاریں آہستہ چل رہی تھیں جبکہ ٹریفک میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ یہ وقت بچوں کے سکول جانے کا ہے۔ چنانچہ سڑک خالی بھی ہو تو لوگ آہستہ ڈرائیونگ کریں گے۔ اس کے مقابلے میں اپنے ہاں صبح کے وقت جو افراتفری اور نفسانفسی ہوتی ہے، اس سے ہم سب واقف ہیں۔ مغربی ممالک میں سکول کی عمارت سے بہتر عمارت نہیں ہوتی۔ وہاں طالب علموں کو تمام سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ انہیں بہترین ماحول مہیا کیا جاتا ہے۔ اب ذرا اپنے سکولوں کی حالت ملاحظہ کریں تو ہمیں اپنے آپ سے شرم آئے گی۔ اکثر سکولوں میں ٹاٹ اور درختوں کی چھاؤں تک نہیں۔ سایہ دیوار بھی نہیں۔ دیوار ہی نہیں ہوتی تو سایہ دیوار کہاں سے آئے گا۔ ایسی جگہوں پر ڈپٹی کمشنر اور اسسٹنٹ کمشنر کے ریسٹ ہاؤس دیکھیں تو زندہ رہنا بھی ایک جرم محسوس ہونے لگتا ہے۔ ان سکولوں کے بچوں کو چھوڑیں۔ سکول کے اساتذہ کو حقیر ترین مخلوق سمجھا جاتا ہے اور استانیوں کو دل بہلانے والی گڑیاں بنا لیا جاتا ہے۔ ٹاؤن کمیٹیوں کے چیئرمینوں اور اسسٹنٹ کمشنروں کے گٹھ جوڑ سے جو کچھ ہو رہا ہے اس کے تصور سے ہی روح لرز جاتی ہے۔

ہمارے بچے ہنسنا بھول گئے ہیں۔ کھیلنا بھول گئے ہیں۔ ایک وہم ان کی رگوں میں اتر گیا ہے۔ بچپن بھولپن کا نام ہے مگر پیدا ہوتے ہی جو تماشہ وہ دیکھتے ہیں۔ ایک ناراض سنجیدگی ان کی آنکھوں میں گھر بنا لیتی ہے۔ جب معصومیت اور فطرت کے احتجاج کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو پھر اس بستی کو عذاب سے نہیں بچایا جا سکتا۔ میں بار بار مغرب اور مشرق کا موازنہ نہیں کرنا چاہتا۔ یہ میرا موضوع بھی نہیں۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر کسی مغربی ملک میں کئی بچہ گٹر میں گر کر ہلاک ہو جاتا تو اس کی لاش ملنے سے پہلے

KitaabPoint.blogspot.com

حشر بپا ہو جاتا۔ یہاں کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ بریڈ فورڈ میں ایک پالتو کتے نے ایک بچی کو زخمی کر دیا تو پارلیمنٹ کی کارروائی روک کر اس واقعے پر بحث کی گئی اور فوری طور پر اس طرح کے کتوں کے گھروں میں رکھنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس بچی کی تصویریں اور انٹرویوز شائع ہوئے اور کئی ہفتوں تک لوگ اور لیڈر اس کی عیادت کو آتے رہے۔ یہاں گٹر میں مرنے والے بچے کے گھر میں کوئی اہلکار گیا ہے؟ ایک بدنصیب ماں کی فریادیں سننے کا وقت کس کے پاس ہے۔ ایک بچہ اسی دن موت کا لقمہ بنا جب ہم بچوں کا عالمی دن منا رہے تھے۔

کہتے ہیں بچے ہمارا مستقبل ہیں۔ ہمارے بچوں کا حال زار دیکھ کر ہم اپنے مستقبل کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ بچے جو ورکشاپوں' ہوٹلوں' اور اڈوں پر سارا سارا دن کام کرتے ہیں اور مالکوں کی زیادتیاں برداشت کرتے ہیں۔ وہ ہمیں ہمارے مستقبل کا آئینہ دکھاتے ہیں۔ اس طرح کا ہر آئینہ اس قدر دھندلا گیا ہے کہ ہم اپنا چہرہ بھی نہیں پہچان سکتے۔ ہم اپنی ہر پہچان بھلا بیٹھے ہیں۔ بچے من کے سچے۔ جھوٹوں کی نگری میں انہیں اپنے بچے ہونے کا احساس ہی نہیں رہا۔ شفیق الرحمٰن کا یہ مشہور فقرہ سن کر اب حیرت نہیں ہوتی۔ بچے اچھے ہوتے ہیں مگر ان میں ایک خرابی ہے کہ وہ بڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑے ہو جاتے ہیں مگر کبھی بھی بڑائی اور سچائی کے معانی ان کے سمجھ میں نہیں آنے دیئے جاتے۔ نہ بچہ ہونے میں کوئی لطف رہا نہ بڑا ہونے میں کوئی خوشی رہی۔ جن گھروں سے بچوں کے رونے کی آوازیں آتی ہیں۔ ان سے عقوبت خانے کہیں بہتر ہیں۔ زندہ قومیں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اور نشوونما کو کسی بھی دوسرے کام سے زیادہ اہم سمجھتی ہیں۔ ہمارے ہاں ابھی تک اہم اور غیر اہم فیصلہ ہی نہیں ہوا۔

مصنوعی اور جھوٹی بہشت کے مزے لوٹنے والوں نے وہ محسوسات بھی برباد کر دیئے جو ہر بچے کا فطری حق ہے۔ پیدا ہوتے ہی ہم اسے فکر معاش میں لگا دیتے ہیں یا مقابلے کی دوڑ میں شامل کر دیتے ہیں۔ اس زمین پر بہشت کے باشندے کو بھی اغراض اضطراب اور انتشار کے جہنم میں پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ عرصہ عمر جو بے نیازی' بے خبری' بے غرضی کا زمانہ ہے۔ وقت سے پہلے برباد کر دیا جاتا ہے۔

میرے عظیم رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے بچے اچھے لگتے ہیں کہ وہ مٹی سے کھیلتے ہیں۔ وہ روتے ہیں۔ وہ لڑتے ہیں تو فوراً من بھی جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بڑے ہو کر بھی بچپن کی یاد دل میں محفوظ رکھی جائے۔ وہ بھولپن بے ساختگی باقی رہے جو زندگی کی اصل ہے۔ ہمیں کیا ہو گیا ہے۔ ہم نفرتیں اور کدورتیں کتوں کی طرح اپنے لہو میں پالتے ہیں۔ ایک دوسرے کو معاف نہیں کرتے۔ میرے خیال میں تو تمام سیاست دانوں کو سکول میں داخل کیا جائے تاکہ وہ ان صفات سے آشنا ہو سکیں جو بچوں کا

KitaabPoint.blogspot.com

سرمایہ ہیں مگر ہمارے سکول تو بچوں سے خالی ہیں۔ یہاں جو مخلوق پڑھتی ہے انہیں جو کچھ مرضی ہے کہہ لیں۔ بچہ نہیں کہہ سکتے۔ بچپن کی محبت کو دل سے نہ جدا کرنا۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

ہم توہین عدالت کے مجرم ہیں

ایک زمانے میں لاہور ہائی کورٹ کے عیسائی چیف جسٹس جسٹس اے آر کارنیلسن کا نام بہت معروف اور محترم ہوا۔ ایک صاحب کردار اور صاحب کمال جج کے طور پر ان کی بڑی عزت ہوئی۔ ہمارے لیے قومی افتخار کی پہچان اکا دکا آدمی بنتے ہیں۔ ہم کسی اہل آدمی کو اس کا مقام دینے میں ہمیشہ ہیرا پھیری کرتے ہیں۔ یہ ایک عجیب کریڈٹ ہے جو ہمارے حصے میں آیا ہے۔ شکر ہے کہ تب کسی مولانا کی طرف سے یہ فتویٰ بھی سنائی نہ دیا تھا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی ایک عدالت عالیہ کا چیف جسٹس مسلمان نہیں۔ گستاخی نہ ہو تو کہوں کہ کارنیلسن صاحب کا کردار و عمل سچے مسلمانوں جیسا تھا۔

کارنیلسن صاحب سی ایس پی افسر تھے اور اسی طرح عدالت کے مناصب پر فائز ہوئے جس طرح ایم آر کیانی اور کئی دوسرے اس مقام پر پہنچے۔ حیرت کی بات یہ ہے' بلکہ خوفناک حیرت کی بات یہ ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے پاس پورے پاکستان میں ایک انچ زمین کی ملکیت نہیں تھی۔ پاکستان میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اصل میں پاکستان ایسے ہی لوگوں کا ہے' لیکن یہ لوگ غریب مزدور اور بے وسیلہ ہیں۔ یہ کارنیلسن صاحب کو کیا ہوا کہ ساری عمر اتنے بڑے بڑے عہدوں پر رہ کر بھی کچھ نہ بنایا۔ ان کے زمانے میں سی ایس پی افسر زیادہ بڑا افسر ہوتا تھا۔ وہ جج بھی رہے۔ ہم افسروں اور ججوں کو دیکھتے ہیں پھر ان کی طرف دیکھتے ہیں۔ ہمیں خدا کی قدرت یاد آتی ہے۔ شکر ہے قائداعظم کے بعد کسی شعبے میں ایک آدمی مل جاتا ہے جس کی مثال دے کر ہم عزت مند ہوتے ہیں ورنہ اب تو زندگی ایک توہین آمیز گالی بنتی جا رہی ہے۔

پچھلے چند برسوں سے پنجاب میں بالخصوص اور پاکستان میں بالعموم میڈ ریس (پاگلوں کی دوڑ) لگی ہوئی ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے قومی اخبارات میں ایک فہرست شائع ہوئی تھی جس میں بہت سے افسروں کے نام تھے۔ جنہیں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں پلاٹ عطا ہوئے تھے۔ آخر ایسے دور افتادہ مقام پر کسی کو مکان بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہاں تو یادش بخیر اعجاز الحق بھی سال میں آدھ بار جاتے ہیں جہاں سے وہ ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوئے۔ پتہ چلا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں 5000 کا پلاٹ لے کر دس لاکھ میں بیچا جائے گا اور انہیں خریدنے والے ٹوبہ ٹیک سنگھ کے شہری ہوں گے۔ اکثر لوگ بے چارے تو 5000 میں پلاٹ خریدنے کی ہمت نہ رکھتے ہوں گے۔ اپنے شہر میں کئی لوگوں کے پاس ایک انچ زمین نہ ہوگی۔ کیا یہ لوگ اپنے وطن کی زمین پر کوئی حق نہیں رکھتے۔ کیا پاکستان چند

KitaabPoint.blogspot.com

لوگوں کا ہے جو سیاست دان ہیں جو افسر ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو انگریزوں کے پروردہ ہیں۔

سی ایس پی ہونے کی صورت میں شاید کارنیلسن صاحب کمشنر بھی رہے ہوں۔ ایک سابق کمشنر کے پاس 62 پلاٹس ہیں' دو کوٹھیاں ہیں اور دو پٹرول پمپ ہیں۔

پاکستان میں ان دنوں کون سا ایسا افسر ہے جس کے پاس بے شمار پلاٹس اور دولت کے انبار نہیں ہیں۔ پھر یہ کارنیلسن صاحب کیسے افسر تھے کہ ہوٹل کے ایک کمرے میں زندگی کے باقی دن بسر کرتے رہے۔ یہ عجیب افسر تھے۔ بھلا افسر ایسے ہوتے ہیں؟ کار نیلسن صاحب جج بھی تھے اور بھی بہت جج صاحبان ہیں۔ اب میں کیا کہوں۔

ایک عدالت میں سماعت کے دوران ایک مدعی خاتون نے بات شروع کی۔ وہ غصے میں تھی۔ غریب مظلوم اور مجبور آدمی کے پاس یہی چیز ہوتی ہے جو وہ کھا سکتا ہے۔ غصہ کھانا غم کھانے سے بہتر نہیں۔ دونوں غذاؤں کا غلط اثر اس کی اپنی جان پر ہوتا ہے۔ عورت بولی۔

یہ میرا مخالف' وکیل بلیک میلر ہے۔ ججوں کا ایجنٹ ہے۔ بدمعاش ہے' جھوٹا ہے' رشوت کے دھندے میں ملوث ہے۔

پھر اس نے ملزم کے بارے میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔ جج صاحب گھبرا گئے۔ انہوں نے فوراً سرکاری وکیل کو حکم دیا کہ اس خاتون کو چپ کراؤ ورنہ میں تم سب کو توہین عدالت میں اندر کر دوں گا۔

سو جناب میں توہین عدالت کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ اس سے اندازہ کر لیں کہ ایک عدالت کا معمولی اہلکار کروڑوں روپے کا مالک ہے۔ وہ سینٹر بھی بن چکا ہے۔ ہمارے ایک بڑے سیاست دان کا قیام لاہور میں انہی کے گھر میں ہوتا ہے۔ ہمارے افسروں کا گٹھ جوڑ سیاست دانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہمارے ججوں کے عہدو پیمان بھی سیاست دانوں کے ساتھ بنے ہوئے ہیں۔ ہماری بڑی عدالتوں کے اکثر فیصلوں پر سیاست دان اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے بعد مراعات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ سیاست دانوں کے بارے میں کیا بات کی جائے کہ جو کچھ وہ قومی اسمبلی میں ایک دوسرے کے خلاف کہہ رہے ہیں وہ افسوس ناک ہی نہیں شرمناک بھی ہے۔ وہ سب ایک جیسے ہیں۔

جسٹس کارنیلسن نے ایک نجی ملاقات میں کہا تھا کہ ہماری بدقسمتی میں عدالتوں کا ہاتھ بھی ہے۔ انہوں نے کہا کہ دوسرے کئی فیصلوں کے علاوہ جو فیصلہ پہلی بار اسمبلی ٹوٹنے پر مولانا تمیز الدین اسپیکر اسمبلی کی رٹ پر کیا گیا تھا ہمارے لیے تباہ کن تھا۔ ایک اپاہج گورنر جنرل غلام محمد کے حق میں جسٹس منیر نے فیصلہ دے کر ہماری سیاسی تاریخ کو زیروزبر کر دیا۔ یہ الفاظ ایک باوقار اور دیانت دار

KitaabPoint.blogspot.com

جج کے ہیں۔ میں نے ان کی بات دہرائی ہے۔

یہ باوقار جج کسمپرسی کے عالم میں مرجاتا اگر رانا اعجاز احمد ایڈووکیٹ اپنے ساتھیوں سمیت ان کی عیادت نہ کرتے۔ پھر ہائی کورٹ میں رٹ دائر نہ کردیتے۔ رانا صاحب نے ہمیں مکمل شرمندگی سے بچالیا ہے۔ چیف جسٹس کے حکم پر سیکرٹری ہیلتھ نے فلیٹیز ہوٹل میں ڈاکٹروں کی ٹیم بھیجی اور اب وہ سروسز ہسپتال میں ہیں۔

اصل میں افسران کی مجبوری یہ ہے کہ جب تک کوئی معاملہ انتظامی حدود میں نہ آجائے وہ کوئی اقدام کرتے ہی نہیں۔ اصل میں وہ انتظامی افسر ہیں۔ اس معاملے میں بڑے مستعد ہیں۔ اگر انتظامیہ کا بندہ ذرا سا بیمار ہو تو فوراً ساری سرکاری مشینری حرکت میں آجاتی ہے۔ مثلاً پچھلے دنوں ایک صوبائی وزیر کے بیٹے کو گردے کی تکلیف ہوئی اسے فوراً سے پہلے لندن بھجوایا گیا۔ اس پر سولہ لاکھ روپے خرچ آئے۔ ہمارے افسران اپنے السر کا علاج کرانے میں امریکہ جاتے ہیں۔ وہ بہت قیمتی لوگ ہیں۔ باقی لوگ تو کیڑے مکوڑے ہیں۔ کارنیلسن صاحب کا احسان قوم پر ہے۔ افسروں کو اس سے کیا فائدہ ہے۔ کارنیلسن صاحب تو اس حال میں بھی کہہ رہے ہیں کہ میں نے جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا۔ بڑے بڑے عہدوں پر فائز لوگ سوچیں کہ وہ کونسا فرض ادا کر رہے ہیں۔ اپنے وسائل اور اختیارات کے ناجائز استعمال سے دولت کمانا اور خلق خدا کو ذلیل کرنا بہت بڑا فرض منصبی ہے اور ہمارے افسران بڑے فرض شناس ہیں۔ جسٹس کارنیلسن صاحب ہم آپ سے شرمندہ ہیں اور اسی طرح زندہ ہیں جیسے توہین عدالت کا ارتکاب کر رہے ہوں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

کشور ناہید کے لیے کلمہ خیر

شریف جنجوعہ' کشور ناہید اور مصطفیٰ قریشی نے بڑا کام کیا کہ حبیب جالب کے اہل خاندان کے لیے چھ لاکھ روپیہ جمع کر لیا۔ انہوں نے مرحوم کے پسماندگان کے لیے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا۔ باقاعدہ ٹکٹ رکھے۔ ٹکٹ کتنے بکے ہوں گے کہ الحمراء ہال میں تھوڑے سے لوگ تھے جو کچھ ہوا کشور ناہید کی محبت اور محنت سے ہوا۔ مشاعرے میں شرکت کے لیے منتظمین کی پسند و ناپسند کا معاملہ اس موقعہ پر اہمیت نہیں رکھتا۔ کارڈ پر امجد اسلام کا نام ہے اور شہزاد احمد کا نہیں جن لوگوں نے یہاں بھی اپنا کام دکھایا۔ وہ بھی قابل معافی ہیں۔ بہت سے شاعر پہنچ گئے اور حبیب جالب کے لیے اپنی محبت نچھاور کی۔ بلا تخصیص سب کو موقعہ دیا گیا۔ اب تو حبیب جالب پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہونا چاہیے۔ وہ خود بھی اجارہ داریوں کے خلاف تھا۔ فیض احمد فیض کو بھی کچھ خاص لوگوں کی ملکیت بنایا جا رہا ہے ورنہ فیض اور جالب جیسے لوگ تو قومی سرمایہ ہیں۔

حبیب جالب نے زندگی بھر کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے۔ ان کی اہلیہ نے اپنے نامور شوہر کی رفاقت کو ثابت کر دیا جب نواز شریف ان کے پاس تعزیت کے لیے گئے اور کسی خدمت کے لیے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میرے شوہر نے کبھی حاکموں سے کچھ قبول نہ کیا تو میں کیسے اپنے سامنے شرمسار ہو جاؤں۔ حبیب جالب نے موت کے بعد اپنی استقامت کو قائم رکھا۔

اس طرح کی موت کے بعد دو باتیں شدت سے محسوس ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا کبھی سچے بہادر اور صاحب انا لوگوں سے خالی نہیں ہوتی۔ حبیب جالب کے جنازے میں شرکت کے وقت مجھے اپنے زمانے کی عظمت کا احساس ہوا تھا۔ دوسری بات یہ کہ کسی سچے پیارے بڑے آدمی کے چلے جانے پر لوگ اس سے ایسے غافل بھی نہیں ہو جاتے۔ اسے یاد رکھتے ہیں۔ اسی کے لیے زیادہ درد محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس کے گھر والوں کے لیے اپنی محبتوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ دنیا درد والے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ حبیب جالب کے لیے میں نے سب شاعروں اور ادیبوں کے دلوں میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا درد یاد دیکھا۔

کشور ناہید کا ایک وصف ہے کہ وہ اپنی اہل قلم برادری میں سے مصیبت زدہ آدمی کی ہر ممکن مدد کے لیے ہر طرح تیار رہتی ہیں۔ حبیب جالب کے لیے انہوں نے وہ کچھ کیا جو کسی دوسرے نے نہیں کیا۔ اس اچھے کام کے لیے ہم سب پر کشور کا شکریہ واجب ہے۔

مصطفیٰ قریشی ایک ممتاز اداکار ہیں۔ وہ ذوق و شوق والے آدمی ہیں۔ مجھے کچھ محفلوں میں قریشی صاحب کی گفتگو سننے کا موقعہ

KitaabPoint.blogspot.com

ملا۔جس کشادگی اور عمدگی سے انہوں نے بات کی' میں حیران ہوا اور خوش بھی ہوا۔میرا خیال ہے کہ ادبی محفلوں کی طرف ان کا دھیان کشور کے کہنے پر ہوا ہوگا۔ساغر صدیقی کی برسی پر مصطفیٰ قریشی کی تقریر جرات رندانہ کا شاہکار تھی۔

میں شریف جنجوعہ صاحب کے بارے میں کچھ نہیں جانتا مگر جالب کے لیے انہوں نے جو ذمہ داری قبول کی میرے دل میں ان کی بے پناہ عزت پیدا ہوئی ہے۔وہ ذاتی طور پر بھی شاعروں کو فون کرتے رہے۔اس کے علاوہ مخیر حضرات سے چندہ اکٹھا کرنے کے لیے ان کی محنت اس دور میں ایک انجانی کیفیت کا باعث ہے۔اس طرح کے کاموں کے بعد خود آدمی کے اپنے دل میں جو کیفیت گھلتی ہے' بس وہی سب سے بڑا حوصلہ ہے۔اس جدوجہد میں منو بھائی بھی ان دوستوں کے ساتھ ساتھ رہے۔ان تین لوگوں کے شکریئے کے لیے تو شاید الفاظ ابھی بنے ہی نہیں۔جنہوں نے اپنا نام ظاہر کرنے سے انکار کر دیا۔اور دو سال تک جالب کے گھر والوں کو دو دو ہزار روپے دیتے رہنے کی حامی بھر لی۔ایک آدمی نے جالب کی بچیوں کے مکمل جہیز کی ذمہ داری قبول کر لی۔اس طرح کے اور بھی واقعات دیکھنے میں آئے۔شاید اس لیے انسانیت پر ایمان غیر متزلزل نہیں ہوتا۔حبیب جالب نے تو اپنے وقت کے سب سے بڑے جابر کو للکارا تھا۔

میں نہیں مانتا میں نہیں مانتا

زندگی میں اور موت کے بعد لوگ اسے مانتے ہیں اور اسے جانتے ہیں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

دیارِ حجاز میں اردو کا راز

یہ حج کا مہینہ ہے۔ اس مہینے میں دیارِ حجاز میں دنیا بھر کی رونقیں سمٹ آتی ہیں۔ دنیا کے ہر کونے سے مسلمانانِ عالم مکہ مکرمہ اکٹھے ہوتے ہیں۔ پھر حاضری کو حضوری بنانے کے لیے مدینۃ النبی جاتے ہیں۔ اس بات کا ملال ہے کہ ہم اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا پائے۔ یہ موقع دنیا کی کسی اور قوم کو اس طرح میسر نہیں ہے۔ اس طرح اتحاد بین المسلمین کا عظیم مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ اجتماع مختلف رنگوں، نسلوں اور قوموں کے مسلمانوں کی اقوامِ متحدہ کب بنے گا۔ یہ اصل میں مسلم بلاک کے قیام کی ایک خوشخبری بھی ہے مگر برس ہا برس سے صرف خوشخبری ہے۔ ہم شاید اپنے آپ سے بچھڑ گئے ہیں۔ مسلمان اپنے ترقی پسند کردار سے غافل ہو گئے ہیں۔

میرے ذہن میں یہ خیال آیا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس وقت دنیا کے بیشتر ملکوں میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کوششیں تیز تر ہو گئی ہیں۔ یہ بھی لگتا ہے کہ آئندہ تابندہ میں تہذیبی و تخلیقی، سیاسی و سماجی، فوجی اور فلاحی، تعمیری اور تکنیکی حوالوں سے پاکستانی ہی دنیا بھر کے مسلمانوں کی قیادت کریں گے۔ مگر اس سے پہلے پاکستانیوں کو اس کا اہل ثابت کرنا ہوگا۔ میں دوسرے شعبوں کے اس حوالے سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ ادبی اور تخلیقی سطح پر دنیا بھر میں جو کام اردو زبان و ادب کے حوالے سے ہو رہا ہے وہ بے حد حوصلہ افزا ہے۔ انگلستان، امریکہ، جرمنی، ہالینڈ، ناروے، ڈنمارک اور دوسرے غیر مسلم ملکوں کے علاوہ مسلم ممالک ترکی، ایران، عرب امارات، انڈونیشیا، عراق، مصر اور سعودی عرب میں بھی اردو زبان و ادب کو رواج دینے کا کام ہو رہا ہے۔ یہاں سے سب سے زیادہ سرگرمیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ اجتماعات اور تقریبات ہوتی ہیں اور ایک ایسی فضا بنتی ہے جس میں یگانگت اور یکجہتی تو ہوتی ہی ہے مگر اس کے علاوہ دنیا بھر کے مسلمانوں سے ربط و ضبط کی صورت حال بھی پیدا ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی دوسری زبانوں میں بھی کام ہو رہا ہے مگر جتنا کام اردو زبان و ادب کے سلسلے میں ہو رہا ہے، وہ بے مثل ہے۔

سعودی عرب میں بھی بہت سے پاکستانی موجود ہیں۔ وہاں ادبی تقریبات ہوتی ہیں۔ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ دوسرے ملکوں کے علاوہ سعودی عرب میں یہ ماحول زیادہ اچھے اثرات کا حامل ہو سکتا ہے۔ سعودی عرب مسلمانوں کے لیے ایک مرکزی شہر ہے۔ تہذیبی اور تخلیقی مقام پر بھی اگر اسے مرکزیت حاصل ہو جائے تو اس کے اثرات دور رس ہو سکتے ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

آج کل دیار حجاز میں بہت ادبی سرگرمیاں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ نصیر احمد ناصر کے خوبصورت شعری مجموعے ''دسمبر اب مت آنا'' اور ''زرد پتوں کی شال'' اسلام آباد سے شائع ہوئے ہیں۔ ''دسمبر اب مت آنا'' لیو بکس والوں نے شائع کیا ہے۔ اس موقع پر عرش صدیقی کی مشہور نظم ''اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے'' یاد آ جاتی ہے۔ ناصر کی نظم ''ایک مختلف درد کی تصویر'' سامنے لاتی ہے۔

نصیر احمد ناصر ایک حساس اور منفرد لہجے کے شاعر ہیں۔ گزشتہ دہائیوں میں ابھرنے والے جدید شاعروں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں کے تراجم انگریزی اور روسی زبان میں ہوئے ہیں۔ ان کا تعلق کھاریاں سے ہے۔ وہ آج کل سعودی عرب کے شہر ریاض میں مقیم ہیں۔

ڈاکٹر عباس اسدی مسجد نبوی کے حرم کی توسیع و تحویل کرنے والی کمپنی میں چیف میڈیکل آفیسر ہیں۔ اس ضمن میں ایک کتاب ''مدینۃ النبی' کل اور آج'' شائع ہوئی ہے جو اس موضوع پر ایک انوکھی کتاب ہے۔ اسدی صاحب کا شعری مجموعہ ''متاع ہنر'' بھی شائع ہو چکا ہے۔

مشتاق شاد کا شعری مجموعہ ''ریگ رنگ'' بھی چھپا ہے۔ 300 سے زائد صفحات پر مشتمل یہ شعری مجموعہ دوریوں کی تاثیر اور تنہائیوں کی تعبیر کے امتزاج سے سجا ہوا ہے۔ امجد اسلام امجد نے اس مختلف شعری مجموعے کا ایک روٹین دیباچہ لکھا ہے۔ البتہ محسن نقوی کے فلیپ کا یہ جملہ قابل غور ہے۔ مشتاق شاد نے خیالوں میں چمکتی دمکتی ریت پر جذبوں کی دھنک کے ساتوں رنگ چھڑک کر اسے سونا بنانے کی کوشش کی ہے۔

ساحل پر کوئی ریت کا گھر بھی نہیں میرا
میں خیمہ حباب نہ دیکھوں تو کیا کروں

سعودی عرب میں ایسی تنظیمیں ہیں جو اردو زبان و ادب کے فروغ اور ایک دوسرے سے علمی روابط کے لیے کام کر رہی ہیں۔ ایک تنظیم پاکستان سوسائٹی آف جرنلسٹس بھی ہے جس کے زیر اہتمام پچھلے دنوں ایک تقریب ہوئی۔ جس میں اسحاق رانا' جاوید اختر' حسین نظیر' جعفری کے علاوہ اوورسیز رائٹرز فورم کے سید یونس اعجاز پاکستان فورم کے سید شاہد علی' پی پی پی کے آصف زمان ڈار' مسلم لیگ کے محمد اسماعیل خان نے بھی خطاب کیا۔ جاوید اختر جاوید کی خطابت نے بڑا رنگ جمایا۔ جاوید روزنامہ پاکستان کے اعزازی نمائندے ہیں۔

سید یونس اعجاز نے بتایا کہ اب سعودی عرب میں ایک پاکستانی ماحول بھی بن رہا ہے۔ اس کے لیے علمی و ادبی سرگرمیوں نے بڑا

KitaabPoint.blogspot.com

کردار ادا کیا ہے۔ اس ضمن میں اوورسیز رائٹرز فورم کے شعبہ خواتین کی سربراہ ادیبہ اور شاعرہ ریحانہ روحی کی خدمات قابل تعریف ہیں۔

یونس اعجاز کا یہ شعر کس قدر بامحل اور بامعنی ہے۔

اس کوچے کی خاک بن جاؤں
یہ بھی مٹی کس ٹھکانے لگے

سعودی عرب میں علمی اور ادبی سرگرمیاں ایک بڑے کام کی آغاز ہیں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

ٹی وی کے مظلوم پروگرام

پاکستان ٹیلی ویژن کے دفاتر اور سٹوڈیوز میں ہر وقت کلب لائف کا گماں گزرتا ہے۔ رونقیں ہی رونقیں' آزادیاں ہی آزادیاں۔ یہ کیفیت وہاں عمومی ماحول میں دکھائی دیتی ہے۔ جو باہر کے لوگوں کے لیے خصوصی صورت حال ہے۔ ٹی وی پروگراموں کے دوران مختلف مراحل پر بہت مداخلت ہوتی ہے۔ جو کبھی کبھی بے جا بھی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ پروڈیوسر کی اپنی مداخلت بھی اکثر اوقات غیر ضروری ہوتی ہے۔ پروڈیوسر دو دھاری تلوار پر چل رہا ہوتا ہے۔ شوقین مزاجیوں میں بھیگے ہوئے مرد عورتوں کے درمیان مطلق العنان بادشاہی اور افسران بالا اور حاکمان اعلیٰ کے سامنے غیر مشروط محکومیت کی آمیزش پروگراموں کی پیشکش میں صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ ڈرتے رہنا ڈراتے رہنا ذلیل وخوار ہونا اور ذلیل وخوار کرنا پروڈیوسروں کا مشغلہ بھی ہے اور مسئلہ بھی ہے۔

ایسے میں اکا دکا شاعر ادیب پروڈیوسر پھنس جائے تو اسے اچھوت بنا دیا جاتا ہے۔ ایک جنرل منیجر کے پاس اپنی نئی کتاب لے کر پروڈیوسر گیا تو اس نے کہا اچھا تو تم بھی گئے کام سے۔ افسر شاہی اور دوسرے تقریباً تمام محکموں میں اس طرح کے آدمی کو حقیر نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ادبی ذوق یا کسی بھی آرٹ کا شوق علمی اداروں کے اہلکاروں کا بنیادی وصف ہونا چاہیے مگر اکثر لوگ اس سے یکسر عادی ہوتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں جانتے۔ پڑھنے لکھنے سے انہیں کوئی شغف ہی نہیں ہوتا۔ کسی موضوع پر علمی گفتگو سے انہیں چڑ ہوتی ہے۔ وہ ایسی صحبت کو پسند کرتے ہیں جہاں بس مزا آتا رہے۔ ستم یہ ہے کہ ٹی وی پروڈیوسروں کے انتخاب کے لیے کوئی معیار مقرر نہیں۔ چنانچہ تعلیمی اداروں کی طرح نشریاتی اداروں میں بھی نالائق اور نااہل لوگوں کا میلہ لگا ہوا ہے۔ اس پر مزید ارزیادتی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو حضرت علامہ سمجھتے ہیں بلکہ انہیں یہ سمجھایا جاتا ہے اور یہ بات فوراً ان کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ دیہاتی تعلیمی اداروں میں طلبہ اپنے استاد کو جو سمجھتے ہیں۔ اسی طرح کا طرز عمل پروڈیوسروں سے کام لینے والے خواتین وحضرات اختیار کرتے ہیں۔ خوشامد کے دوران ان کا حال وہی ہوتا ہے جو ہمارے وزرائے کرام کا اس وقت ہوتا ہے جب ان کے پاس ضرورت مند آتے ہیں۔ مطالعہ اور متخلیہ کو یہ لوگ بالکل غیر ضروری چیز خیال کرتے ہیں۔

میں ان پروڈیوسروں کی عزت کرتا ہوں جنہوں نے اپنے شعبے میں کمال دکھائے۔ ایسے لوگوں کی بھی یہاں کمی نہیں۔ چنانچہ ایسے ادارے اصطبل بن جاتے ہیں جہاں گھوڑے گدھے اور ہر طرح کے جانور رکھے جاتے ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

ہمارے ہاں صرف سول سروس اور فوج میں نئے آنے والوں کے لیے ابھی ایک ہی دروازہ ہے جہاں سے ان کے مطلب کے آدمی ہی داخل ہونے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ دوسرے تقریباً تمام شعبوں میں داخلے کے لیے کئی کئی دروازے بنائے گئے ہیں۔ چور دروازے بھی ہیں۔ اکثر لوگ اسی راہ سے داخل کئے جاتے ہیں۔ اب ڈاکوؤں کا زمانہ ہے۔ لہٰذا دیواریں بھی دروازوں کا کام دینے لگی ہیں۔

میں دھم سے آ گروں گا صاحب سلام میرا

یہی پروڈیوسر ترقی کر کے جی ایم اور ڈائریکٹر تک چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ سب کچھ سب کے سامنے ہے۔ چھپا ہوا کیا ہے۔ میں اس طرح کے لوگوں کی نشاندہی کا تکلف نہیں کرنا چاہتا اور ان کے برعکس جو صاحب کمال لوگ ہیں ان کا نام لے کر بھی کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ لوگ بولیں نہ بولیں' وہ پہچان رکھتے ہیں۔

میں صرف ان لوگوں تک اپنی بات مخصوص رکھنا چاہتا ہوں جو پروڈیوسر ہیں اور بے چارے شاعر ادیب بھی ہیں۔ تخلیقی لوگ ہیں۔ ہمارے ہر طرح کے علمی ادارے تخلیقی ذہن کے دشمن ہیں۔ ان کی حوصلہ شکنی پر پورا زور صرف کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود جو تھوڑے بہت بہتر کام ہو رہے ہیں' انہی لوگوں کے دم سے ہیں۔ نشریاتی اداروں کے آدھے سے بہت زیادہ کام بھی انہی کے مرہون منت ہیں۔ ان میں تعلیمی اداروں کے تخلیقی اوصاف کے لوگ زیادہ ہیں۔ ان لوگوں سے بیوروکریسی کا سلوک شرمناک ہے۔

عجب دستور ہے کہ ٹیلی ویژن پر کام کرنے والے لوگ اہلیت اور استحقاق کے باوجود ٹی وی پروگرام میں شریک ہو سکتے۔ اس بات سے بہت قباحتیں پیدا ہونے کا بھی امکان ہے۔ بلکہ اندیشہ ہے خطرہ یہ ہے کہ پھر صرف ٹی وی پروڈیوسر ہی ٹی وی سٹار ہوں گے۔ اب بھی ان کے من پسند لوگ اکثر پروگراموں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر یہ تو ہو کہ کسی ٹی وی ملازم کی اچھی کتاب شائع ہو تو اس کا ذکر کسی پروگرام میں ہو۔ اور اس سے بات ہی کر لی جائے کہ یہ سب کچھ یہاں رہتے ہوئے بھی تم نے کیسے کر لیا۔ اعظم خورشید' سرمد صہبائی' علی اکبر عباس' ایوب خاور' سلیم طاہر' شوکت زین العابدین' اسلم قریشی۔ مشتاق صوفی' حفیظ طاہر' سلمان سعید اور کئی دوسرے پروڈیوسروں کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ٹی وی پر اچھے شاعر بھی ہیں۔ انہیں زندگی میں ایک بار کسی مشاعرے میں شریک کر لیا جائے۔ ایک مشاعرہ ہی ایسا ہو جس میں صرف ٹی وی کے پروڈیوسر اور دوسرے اہلکار شریک ہوں۔ اوپر کے ناموں میں اکثر شاعر ہیں۔ اس کے علاوہ اشرف عظیم' تاجدار عادل' نصرت ٹھاکر' نذیر عامر' ذوالفقار فرخ اور شاہد مسعود کے علاوہ بھی کئی شاعر ہوں گے۔ ان میں سے کچھ تو بہت اچھے شاعر ہیں۔ کئی لوگ حوصلہ شکنی کی اس جانبدارانہ روش کے ردعمل میں شعر و ادب چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اس کا ذمہ دار

KitaabPoint.blogspot.com

بھی یہ ادارہ خود ہے۔

شاید یہ بھی اسی روایت کا تسلسل ہے کہ ٹیلی ویژن کے ادبی پروگرام مسلسل لاپرواہی اور غفلت شعاری کا شکار ہیں۔ اب تلخ نوائی سے معاف رکھا جائے تو کہوں کہ ہمارا ٹی وی ادب دشمن ادارہ ہے۔ پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ادبی پروگرام کسی شاعر' ادیب یا اچھے پروڈیوسر کو نہ دیا جائے۔ اس کے بعد شعر و ادب سے ناآشنائی بلکہ بے زاری کے باوجود بے معنی مداخلت ہوتی ہے۔ سفارشی لوگ ڈالے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ پروگرام نہ معیاری ہوتے ہیں نہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ یہ پروگرام رات گئے فرمان الٰہی سے پہلے پیش کئے جائیں۔ دینی پروگرام بھی ٹی وی والوں کے لیے ایک مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ پروڈیوسروں کو ادبی یا دینی پروگرام سزا کے طور پر کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ وہ بھی اکثر بیگار بھگتاتے ہیں۔ پچھلے دنوں چودہ اگست والے قومی مشاعرے کا بھی یہی حال ہوا۔ اگر ٹی وی والوں کا خیال یہ ہے کہ ڈرامے اور موسیقی مقبول پروگرام ہیں تو پھر یہ پروگرام کسی بھی وقت دکھائے جائیں لوگ دیکھیں گے۔ صرف ادبی پروگراموں کے لیے ہی قبل از وقت اور بعد از وقت کا اہتمام کیوں کیا جاتا ہے۔

ٹی وی والوں کے خیال میں صرف وہی ادیب اور دانشور ہے جو ڈرامہ لکھتا ہے یا اس سے ڈرامہ لکھوایا جاتا ہے۔ انہیں بھی قومی دنوں کے خاص پروگراموں میں شرکت کی زحمت نہیں دی جاتی۔ صرف اداکاراؤں اور گلوکاراؤں کو بلایا جاتا ہے۔ وہی مہمان عزیز ہوئے اور وہی مہمان خصوصی۔ ان کا رویہ بھی مہمانوں والا ہوتا ہے۔ مہمان خدمت کرانے کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ پروگرام ختم ہوتا ہے تو یہ لوگ میزبانی کا کردار سنبھال لیتے ہیں۔ عارفہ صدیقی اداکاری کر لیتی ہے' گانا بھی گا لیتی ہے مگر اس بے چاری سے زیادتی ہے کہ اسے گفتگو کی زحمت بھی دی جائے۔ اس سلسلے میں ٹی وی والوں کے پاس گھڑا گھڑایا جواب یہ ہوتا ہے کہ لوگ انہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ گویا ٹیلی ویژن صرف نظر بازی کا گڑھ بن کے رہ گیا ہے۔ سامعین ناظرین بن گئے ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ لوگ پروڈیوسروں سے واقف ہی نہیں ہوتے۔ پچھلے دنوں امجد اسلام امجد کے ڈرامے فشار کی تقریب تھی۔ پروڈیوسر ایوب خاور کو بھی امجد کے ساتھ سٹیج پر بٹھا دیا گیا۔ کسی مقرر نے ایوب خاور کا نام تک نہ لیا۔ سب لوگ امجد کی جھوٹی سچی تعریفیں کرتے رہے۔ ایوب خاور ٹی وی پر جانا پہچانا آدمی ہے اور اچھا شاعر بھی ہے۔ حیرت یہ ہے کہ مقررین میں اداکار اور اداکارائیں بھی شامل تھیں اور وہ پروڈیوسر کی تعریفیں کرنا اداکاری کی پریکٹس کا حصہ سمجھتی ہیں۔

ایک اور تقریب میں کرتا دھرتا صاحب ذوق پولیس افسر ذوالفقار چیمہ تھے۔ یہاں بھی حسب معمول نامور دانشور اور ادیب اشفاق احمد کی گفتگو سامعین کی آرزو کا عنوان بنی۔ رات خبرنامے میں ایک ہلے میں مقررین کو دکھایا گیا جن میں اشفاق احمد بھی تھے۔

KitaabPoint.blogspot.com

سب کی باتوں کو دو ایک فقروں میں کھپا دیا گیا۔ جس میں اشفاق صاحب کی کہی ہوئی کوئی بات نہ تھی۔ نام صرف آئی جی پنجاب چوہدری محمد سردار کا لیا گیا۔ چوہدری صاحب علم اور صاحب دل آدمی ہیں مگر دانشوری کے حوالے سے وہ اشفاق احمد کے سامنے کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ کوئی پروٹوکول عمل وادب اور دانش وحکمت کے حوالے سے بھی بنایا جائے۔ اس مسئلے کی ذمہ دار بھی ہماری بیورو کریسی ہے۔ جس نے اقدار کی پوری روایت کو ہی درہم برہم کر دیا ہے۔ ایک ایسا نظام معاشرے پر مسلط کر دیا ہے جس نے پوری قوم کو ذلت اور بدنصیبی سے دوچار کر رکھا ہے۔ نشریاتی اداروں کا بھی وہی حال ہے جو تعلیمی اداروں کا ہے۔ انتظامیہ کے چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے پاس جو وسائل ہیں۔ ان کا عشر عشیر بھی تخلیقی اور تہذیبی کام کرنے والوں کے پاس نہیں۔

ٹیلی ویژن پروڈیوسروں کو بھی وہ مراعات اور آسانیاں فراہم ہی نہیں ہونے دی جاتیں۔ جن کی ضرورت ہے۔ قوم کا روپیہ صرف غیر ضروری غیر پیداواری اور غیر تخلیقی کاموں میں پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

حفیظ جالندھری کے مزار کی تبدیلی

ابھی ہم شاعری کے معانی ومطالب اور سوز وگداز سے آشنا ہی نہ تھے کہ ابا مرحوم گھر میں شاہنامہ اسلام کی پہلی جلد لائے وہ ہم سب بہن بھائیوں کو پاس بٹھا کے بڑا لطف لے لے کر سناتے۔ مجھے بڑا مزا آتا۔ تاریخ اسلام کی باتیں ہمارے گھر میں ہوتی رہتی تھیں مگر شاہنامہ سن کے یہ عظمت ایک حیرت اور محبت کے ساتھ ہمارے دل میں اتری۔ اس سے پہلے ہم نے حضرت علامہ اقبال کا نام سن رکھا تھا۔ اس کے بعد سب سے پہلے جو نظم ہم نے یاد کی وہ پاکستان کا قومی ترانہ تھا۔ سکول میں صبح سب لڑکے اور استاد گراؤنڈ میں جمع ہوتے۔ اس تقریب کو اسمبلی کہا جاتا تھا۔ بعد میں قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کی کارروائیاں سن کر دھچکا سا لگا۔ وہ اسمبلی نہ تھی یا یہ اسمبلی نہیں۔ بہرحال وہیں اسمبلی میں تلاوت ہوتی' تقریر ہوتی اور پھر ترانہ ہوتا۔ ترانہ صرف ایک طالب علم ہی نہیں پڑھتا تھا۔ ہم سب یک زبان' یک آواز' یک دل ہو کر ترانہ پڑھتے۔ یوں لگتا جیسے ایک ہی شخص ترانہ پڑھ رہا ہو۔ یہ ایک ایسی سرگرمی تھی جو پورے سکول کو ایک قوم' ایک ملت' ایک یونٹ بنا دیتی۔ سکولوں میں اب بھی شاید ایسا ہو' کالجوں میں نہیں ہوتا' کالجوں میں اسمبلی ہی نہیں ہوتی۔ کالجوں میں تقریبات کے آخر میں ترانہ ہوتا ہے مگر اس وقت بدنظمی بلکہ بدتمیزی کا مظاہرہ دل کو بے قرار کر دیتا ہے۔ صرف لڑکیوں کے کالجوں میں ترانہ گاتے ہوئے تمام طالبات شریک ہوتی ہیں۔ میں مختلف تقریبات میں لاہور کالج' اپوا کالج' سمن آباد کالج' کوئین میری کالج' کینٹ کالج' شاد باغ کالج میں گیا ہوں تو اس منظر نے مجھے زندہ تر کر دیا' تر و تازہ کر دیا' قیادت کو اپنا سرمایہ سمجھنے والے نوجوانوں کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ پوری قوم اس حوالے سے مجرمانہ سوچ رکھتی ہے۔ جب ٹیلی ویژن سے ترانہ ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے تو لوگ ٹی وی بند کر دیتے ہیں۔ ترانہ لگا ہوا ہو تو توجہ سے نہیں سنتے' سنتے ہیں نہیں۔ مودب کھڑا ہونا تو بعد کی بات ہے جبکہ سینماؤں میں لوگ نیلو اور نیلی پر پکچرائز کیا گیا گانا تو آنکھ جھپکے بغیر سنتے بلکہ دیکھتے ہیں بہت ہی کم لوگ ہیں جن کو ترانہ یاد ہے۔ ہمارے سفارت کاروں کو بھی ترانہ یاد نہیں۔ باہر کے ملکوں میں اس وقت بڑی شرمناک صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جب اپنا ترانہ سنانے کا موقعہ آتا ہے۔ ہمارے افسروں اور نوجوانوں نے کسی ملک میں ترانے کی بجائے یہ فلمی گیت سنا دیا تھا..... لارالپہ لارا لپہ لائی رکھنا۔

ہماری پوری قوم کا کردار بھی یہی کچھ بن گیا ہے۔ یہ بھی المیہ ہے کہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ قومی ترانہ کے خالق کا نام حفیظ

KitaabPoint.blogspot.com

جالندھری ہے۔

ایک دفعہ حفیظ ریل میں سفر کر رہے تھے۔ پاس بیٹھے ہوئے آدمی کو معلوم نہ تھا کہ اس کے ساتھ کون موجود ہے۔ حفیظ صاحب نے اپنا تعارف کرایا۔ اس نے پرواہ نہ کی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے شاہانہ لکھا ہے' کوئی اثر نہ ہوا' حفیظ نے کہا میں قومی ترانے کا خالق ہوں تو بھی کوئی لحاظ نہ رکھا گیا جب انہوں نے کہا کہ بھئی میں جالندھر کا رہنے والا ہوں تو وہ آدمی خوشی سے جھوم گیا اور کہا۔

میں بھی جالندھر کا ہوں۔ آپ کس محلے میں رہتے تھے۔ یہ لطیفہ نہیں اس سے قومی اور تہذیبی سلسلوں سے ہماری عدم دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔

اس وقت دکھ اپنے کمال پر پہنچ گیا جب حفیظ جالندھری کا انتقال ہوا اور انہیں ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں گمنامی اور کسمپرسی کے عالم میں دفن کر دیا گیا جبکہ اس سے پہلے حفیظ جالندھری کی آخری خواہش کے طور پر یہ بات سامنے آ چکی تھی کہ مجھے علامہ اقبال کے قدموں میں دفن کیا جائے۔ علامہ اقبال شاعر مشرق اور مفکر پاکستان ہیں۔ ان کے بعد کسی شاعر کو شاعر پاکستان کہا جا سکتا ہے تو وہ صرف حفیظ جالندھری ہیں۔ مجھے پروفیسر محمد منور نے بتایا کہ تحریک پاکستان میں جو کام شاہنامہ اسلام نے کیا اتنا شاید کلام اقبال نے بھی نہیں کیا۔ پروفیسر محمد منور سے زیادہ عاشق اقبال کون ہوگا۔ ان کی یہ بات مستند حیثیت کی حامل ہے۔ انہوں نے کہا کہ کلام حفیظ پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہوا جہاں جہاں ہیر' وارث شاہ' سیف الملوک پڑھی جاتی تھی وہاں شاہنامہ اسلام بھی سنایا جاتا تھا۔ پنجاب کے کسی دور دراز علاقے چک نمبر 94 گ ب جنوبی میں مسلم لیگ کے جلسے میں قائدین دیر سے پہنچے تو دو گھنٹے تک شاہنامہ پڑھا جاتا رہا۔ حفیظ کے کلام کی ایک خاص لے تھی جو دلوں میں تو جلا دیتی تھی۔ مسدس حالی کلام اقبال ظفر علی خان کی نعتوں کے ساتھ ساتھ حفیظ جالندھری کی نظمیں بھی قومی تحریک میں ایک ولولہ تازہ پیدا کر دیا کرتیں۔ حفیظ کی نعت۔

سلام اے آمنہ کے لعل اے محبوب سبحانی

جتنی مقبول ہوئی کوئی اور شاعری اس کے مقابلے میں مشہور نہیں ہوئی۔ قومیں اپنے بڑوں کی نشانیاں سنبھال کے رکھتی ہیں۔ تب پروفیسر محمد منور وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس بے حد اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی اور حکام بالا کو یاد دلایا کہ حفیظ جالندھری کی آخری خواہش کا احترام کیا جائے۔ بیگم خورشید حفیظ نے بتایا کہ میری موجودگی میں پنجاب کے اس وقت کے گورنر جنرل غلام جیلانی سروسز ہسپتال میں حفیظ کی عیادت کے لیے آئے تو میری موجودگی میں انہوں نے حفیظ سے پوچھا کہ جناب آپ کی کوئی خواہش ہو تو انہوں نے کہا کہ مجھے علامہ اقبال کے دائمی قرب کی خواہش ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

جب حفیظ کے انتقال کے وقت یہ بات سامنے آئی تو کئی لوگوں نے اسے مذاق میں اڑانے کی کوشش کی اور توہین آمیز رویہ اختیار کیا۔ نجانے کیوں ہم اپنے بڑوں کو سیاسی اختلافات کی آڑ میں کمتر ثابت کر کے سمجھتے ہیں کہ بڑا معرکہ سر کر لیا گیا ہے۔ پروفیسر منور حفیظ کے دوست بھی ہیں۔ دوست کی موت کے بعد ان کے مقام و مرتبے کے لیے میدان میں نکل آئے اور بالآخر اس مہم میں سرخرو ہوئے۔

اس ضمن میں ان سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ شہید صدر ضیاء الحق کی صدارت میں ایک محفل کے دوران جناب نواز شریف کے ساتھ ان کی نشست تھی۔ انہوں نے میاں صاحب کے کان میں اپنے دل کی بے قراری انڈیل دی۔ بات میاں صاحب کی سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے فوراً حامی بھر لی۔ اگلی صبح ڈاکٹر صفدر محمود کا فون آ گیا۔ وہ ان دنوں حکومت پنجاب میں سیکرٹری اطلاعات تھے۔ فوری طور پر ایک کمیٹی بنی جس میں جسٹس انوار الحق' مجید نظامی' ڈاکٹر صفدر محمود اور میں ممبر کے طور پر نامزد کئے گئے اور اللہ کا نام لے کے کام شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر صفدر محمود نے اس سلسلے میں فیصلہ کن کام کیا۔ حفیظ جالندھری اگر فاعلات تھے تو ڈاکٹر صفدر محمود فائلات ''فائلات'' تھے۔ انہوں نے ایسی بنیاد رکھی کہ ان کے سیکرٹری اطلاعات کے عہدے سے رخصت ہونے کے بعد کام نہ رکا۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

شمالی علاقے کا اردو ادب

بڑے شہروں سے دور رہنے والوں کے لیے زندگی بہت متنوع ہے اور مشکل بھی۔ شہروں میں زندگی متنازعہ بنتی جا رہی ہے اور مشکل بھی۔ شعر و ادب کے حوالے سے یہ بحث ہمیشہ زندہ ہی ہے کہ آخر مضافات والوں کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ صرف تخلیقی میدانوں میں نہیں تعمیر و ترقی کے حوالے سے بھی انہیں کسی توجہ کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ کسی چھوٹی بستی میں کوئی تفریح گاہ تو ہوتی ہی نہیں، کہیں مل بیٹھنے کے لیے جگہ بھی نہیں۔ انہیں زندگی کی بنیادی سہولتیں بھی حاصل نہیں ہوتی اب بھی دور کی جگہوں میں بڑے بڑے لوگ چھپے بیٹھے ہیں مگر ہم انہیں جانتے نہیں۔ تخلیقی تجربے کے بعد اظہار بھی فطری سلسلہ ہے۔ فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کرنے والوں کو یہ موقعہ حاصل نہیں ہوتا۔

ایسے میں خالی جگہوں میں گھر رکھنے یادوں کا میلہ لگا کے بیٹھ رہتے ہیں۔ پھر وہ ان یادوں کو یار بناتے ہیں۔ ہوائیں ان سے ہم کلام ہوتی ہیں۔ شمالی علاقے کے رہنے والے مردان کہستانی نے پتھروں سے چشمے پھوٹتے دیکھے تو ان کے دل تخلیقی سرچشمے بن گئے۔ اس صورت حال میں پنجابی کی یہ بولی کتنی گہری اور سوہنی لگتی ہے۔

دو پتر اناراں دے

ساڈا دکھ سن سن کے، روندے پتھر پہاڑاں دے

شمالی علاقے اکثر پاکستانیوں کے لیے ان دیکھے منظروں کی طرح ہیں۔ میں نے جب علاقہ ارباب ذوق گلگت کے زیر اہتمام شائع ہونے والے میگزین شمالی علاقے کا اردو ادب دیکھا تو دیر تک میری حیرانیاں ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح چمکتی لرزتی رہیں۔ یہ ادبی رسالہ 366 صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں 52 شاعروں کی 325 غزلیں نظمیں شامل ہیں۔ مدیر محمد امین ضیاء ہیں اور نائب مدیر ہارون الرشید ہیں۔ مشاورت و معاونت میں محمد حسن شاد، خوشی محمد طارق، جمشید خان دکھی، عبدالخالق تاج اور ہدایت اللہ کا نام لکھا ہوا ہے۔ حرف اول کے طور پر امین ضیاء نے ایک بامعنی اور مربوط تعارف لکھا ہے جس کے آخر میں انہوں نے علامہ نصیر الدین ہونزائی اور محترمہ ڈاکٹر شاہدہ جعفری کا شکریہ ادا کیا ہے جن کی مالی اور اخلاقی معاونت سے یہ گراں قدر اشاعت ممکن ہو سکی۔ ایسے لوگ ان علاقوں کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں ہوتے ورنہ اتنی اچھی آوازیں بلند و بالا کوہساروں میں گونج کے رہ جائیں پھر شاید ان کی

KitaabPoint.blogspot.com

بازگشت بھی کہیں کھو جائے۔ ضیاء صاحب لکھتے ہیں۔

''شمالی علاقہ جات بذات خود ایک صغیر پاکستان ہے کہ اس وسیع جغرافیائی خطے میں متنوع بولیاں زبانیں' ذاتیں' نسلیں اور روایتی وثقافتی قدریں پائی جاتی ہیں۔ پاکستان بھر میں یہ اعزاز صرف شمالی علاقے کو حاصل ہے کہ یہاں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ اردو ہی میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ بلتی شینا' بروشکی' کھوار' وخی' کھولچا' ترکی' کشمیری' گوجری' پنجابی' پشتو اور ڈوما بولنے والوں کے مابین اردو زبان ایک قدر مشترک اور واحد رابطے کا وسیلہ ہے۔ غالباً اسی عملی استعمال کا اثر یہ ہوا کہ گلگت کے لوگ دیگر پاکستانیوں کے مقابلے میں اچھی اردو بولنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

عظیم گلیشیائی اور پہاڑی سلسلوں کی سرسبز وادیوں میں آباد گلگت نہ صرف شمالی علاقے کا انتظامی مرکز ہے بلکہ اے او بی مرکز ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ میں یہ بات وثوق سے کہوں گا کہ زیر نظر کتاب میں شامل تخلیقات میں شعری برجستگی' شگفتگی اور فطری جمالیات کے ساتھ احساس محرومی کا کرب بھی نمایاں ہے۔ ان تخلیقات میں عارفانہ' عاشقانہ' رندانہ' اور غیر منافقانہ شعری رویوں کے مطابق خلوص دل کے ساتھ پیش کیا ہوا شاعرانہ تخیل ملے گا۔''

اس کتاب کی تقریب رونمائی گلگت میں منعقد ہوئی جس کی رپورٹ اس علاقے کے نمائندہ شاعر ہارون الرشید نے ہمیں بھجوائی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کتاب کی تقریب رونمائی لاہور میں بھی منعقد ہونی چاہیے۔ ان سب لوگوں سے یہاں کے اہل قلم کی بھرپور ملاقات ہوتا کہ ہم ان سے مزید انسپائر ہوں۔ دور سے آنے والی آواز میں فطرت کے رنگ تڑپتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کوہسار صفت لوگوں سے مل کر ایک ولولہ تازہ ملے گا جو اپنے سینے میں دردمند دل رکھتے ہیں۔ مجھے علامہ اقبال کی ایک رباعی یاد آ رہی ہے۔

نئے پیدا کن از مشت غبارے
تنے محکم تراز سنگیں حصارے
درون او دل درد آشنائے
چوں جوے در کنارے کہسارے

ترجمہ: تو مٹی کی مٹھی سے ایک وجود بنا جو لوہے کے قلعے سے زیادہ مضبوط ہو' مگر اس وجود میں دل درد آشنا دھڑکتا ہو جس طرح ایک مضبوط کوہسار کے دامن میں گنگناتی ہوئی ندی بہتی ہے۔

ہارون الرشید شمالی علاقے کو ادب کے مرکزی علاقوں کے ساتھ مربوط کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اپنے لوگوں کے علاوہ ہمارے ساتھ

KitaabPoint.blogspot.com

بھی ایک مہربانی ہے۔ دور کی بستیوں میں دلوں کے اندر جو پھول کھلتے ہیں ان کی مہک انسان کو اور انسان بنا دیتی ہے۔ گلگت کے شاعروں نے فطرت سے مکالمہ کیا کیا ہے۔ انہوں نے اس فطرت سے بھی مکالمے کی کوشش کی ہے جو انسان کے اندر دوریوں اور ویرانیوں میں چھپتی پھرتی ہے۔

ہارون الرشید کے شعری مجموعہ ''بوندیں'' میں شاعری ایک تخلیقی پھوار بننے کی آرزو میں ہے' ہمارے لیے یہ ایک گمشدہ آرزو ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

شاہ عالمی پنجابی کانفرنس

عالمی پنجابی کانفرنس ختم ہوگئی۔ یہ سن کر ایک دوست نے کہا کہ کیا یہ شروع بھی ہوئی تھی۔ لفظ عالمی بھی ہمارے ہاں اتنا ہی عام اور بدنام ہو رہا ہے جتنا لفظ عظیم ہوا ہے۔ اس کانفرنس کی کامیابی میں کوئی شک نہیں کہ بہرحال یہ واقعہ ہوا تو ہے۔ ہمارے ہاں اب تقریباً ہر دوسرا مشاعرہ عالمی ہوتا ہے۔ اتفاق سے کوئی پاکستانی شاعر بیرون ملک میں کچھ عرصہ گزار کے آئے تو اسے اسٹیج پر بٹھا کر کام چلا لیا جاتا ہے۔

پنجابی عالمی کانفرنس میں بھی سوائے سردار منجیت سنگھ رتو اور ان کی اہلیہ ساجدہ کے کوئی غیر ملکی نہ تھا نصر ملک ڈنمارک سے اور عرفان ملک سویڈن سے پہلے ہی پاکستان میں تھے۔ کانفرنس میں پہنچے تو سٹیج پر دھر لیے گئے۔ اس کانفرنس میں وہ لوگ بھی نہ آئے جو پنجاب اور پنجابی زبان کے لیے جان دینے کو بھی تیار رہتے ہیں۔ حاضری اتنی کم تھی کہ فخر زمان کو بھی اعتراف کرنا پڑا۔ یہ اچھی بات ہے مگر فخر زمان اس اختلاف کو بھی محسوس کرنا چاہیے۔ جو ذاتی طور پر لوگ ان کے ساتھ رکھتے ہیں۔ شرارت سے اس عالمی کانفرنس کو شاہ عالمی کانفرنس بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہاں ایک پنجابن لڑکی کی کار کو دھکا لگانے کے لیے بھی اس سے زیادہ آدمی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کانفرنس کی کامیابی کا سہرا فخر زمان کے سر ہے کہ انہوں نے اس کی ناکامی کی ذمہ داری بھی قبول کی ہے۔ اس طرح سوچنے کے لیے بہت ساری باتیں ہیں۔ ان کی اہلیہ شائستہ اس ضمن میں بھی ان کی مدد کریں۔

کانفرنس میں افضل توصیف کا مقالہ اور سلطان صابر کی تقریر ایک ایسا تحفہ تھا جو اس کا مکمل جواز بن گیا۔ عارف چوہدری انگریزی میں اردو کا بہت اچھا مقرر ہے۔ پنجابی میں بھی اس کے خطاب کا مزا آ گیا۔ کانفرنس کے دوران تاج امرا اور سردار منجیت سنگھ رتو سے گفتگو بہت خوشگوار رہی۔ افسوس یہ ہے کہ سلطان صابر کو مختصر خطاب کی دعوت دی گئی جبکہ اس سے پہلے مصطفیٰ قریشی کے لیے یہ تکلف نہ کیا گیا۔ جتنی باتیں ان کو آتی ہیں وہ ساری انہوں نے کہہ دیں۔ سلطان صابر صاحب نے مصطفیٰ قریشی کی کئی غلطیوں کی نشاندہی کی۔

سلطان صابر صاحب نے اردو میں تقریر کی۔ ان کا کہنا تھا کہ پشتو آپ نہیں جانتے پنجابی میں نہیں جانتا۔ پھر رابطے کے لیے اردو کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ سلطان صابر کی یہ بات کسی طرح مصنوعی پنجابی دانشوروں کو اچھی نہ لگی ہوگی جو پنجابی کی حمایت کا مطلب صرف اردو کی مخالفت کرنا سمجھتے ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

فخر زمان بلاشبہ ایک دانشور ادیب ہے۔ اس کے سیاسی رویئے سے قطع نظر پنجابی ادب کے لیے اس کی کوششوں کے ہم معترف ہیں۔ ہماری خواہش کہ اپنے دوستوں کو بھی اپنے سیاسی کارکنوں میں شامل نہ کیا کرے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

مسجد بابری، مسجد اقصیٰ، مسجد قرطبہ

اب ہمیں بابر کے حوالے سے یاد ہے تو صرف بابری مسجد۔ لگتا ہے اپنی ساری زندگی میں اس نے یہی ایک کام کیا تھا۔ ہندو جو یہ کہتے ہیں کہ اس نے رام مندر ڈھا کے یہ مسجد بنائی تھی وہ اتنا طاقتور تھا اور اگر اس نے یہی کرنا تھا تو ہندوستان میں کوئی مندر ہی نظر نہ آتا۔ بابر سے اورنگ زیب تک ان جلیل القدر بادشاہوں نے یہی تو نہ کیا۔ اگر وہ بزور قوت یہ کام کرتے تو ہندوستان میں بہت کم ہندو ہوتے۔ ہندو تو ہر طاقتور شے کو خدا مان لیتے ہیں۔ پھر تو سارے مغل شہنشاہ ان کے دیوتا ہوتے' دلی ان کا دارالحکومت رہا۔ دلی میں بھی ہمیشہ اکثریت ہندوؤں کی رہی۔ میں بلاخوف وتردد کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان بادشاہوں سے زیادہ ''سیکولر'' حکمران پوری دنیا میں نہ ہو گا۔ ہندوؤں نے رفتہ رفتہ مغل حکمرانوں کے درباروں میں جس طرح اثر ورسوخ حاصل کیا وہ تاریخ میں محفوظ ہے۔ مسلمان بادشاہ سب کے سانجھے تھے۔ مسلمانوں کا خدا بھی سب کا خدا ہے۔ اگر بھارتی حکمران مسلمان بادشاہوں جیسا ہی رویہ اختیار کرتے یہ ایک مثالی طور پر سیکولر صورت حال ہوتی۔

عبادت گاہوں کی حفاظت کی تاکید سپہ سالاروں کو سب سے پہلے کی جاتی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے عیسائیوں کے ایک وفد کو اتوار کے دن اپنی مسجد میں عبادت کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ سارے جہانوں کے لیے رحمت کا ستارہ تھے۔ مسلمانوں کا رسول ہی اتنا کشادہ دل تھا تو پھر اس کے عشق میں سب کچھ نثار کرنے والے کیسے تنگ ظرف ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ بابری مسجد کے حوالے سے ہندوؤں کا سارا پروپیگنڈہ صرف تعصب اور مسلمان دشمنی کی وجہ سے ہے۔ ہندوؤں کی پہچان گم ہو چکی ہے۔ انہیں تاریخ سے ہم کلام ہونے کا حوصلہ نہیں۔ وہ ہر اس نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں جو مسلمانوں کی عظمت کی نشانی ہے۔ جو ہندوستان میں ان کے ہونے کی گواہی ہے۔ ہندوؤں کے پاس تاریخی عظمت کی کوئی چیز نہیں۔ وہ اپنی پرانی من گھڑت داستانوں کو نئے سرے سے مرتب کر کے اپنے احساس کمتری سے چھٹکارہ پانے کی ناکام کوشش میں ہیں۔ اس جھنجھلاہٹ میں وہ بزدلانہ انتہا پسندی پر اتر آئے ہیں۔ بزدل آدمی ہی ظالم ہوتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ بابری مسجد میں 1949ء سے نماز ہی نہیں پڑھی گئی۔ وہ بھارتی پولیس کے پہرے میں ہے' بلکہ قبضے میں ہے۔ میں اس کا اندازہ کر سکتا ہوں کہ جب میں 83ء میں بھارت گیا تو لال قلعہ دلی میں گھومتے ہوئے ننھی منّی مسجد میں بھی چلا گیا۔ پہلے لگا کہ یہاں برسوں سے کوئی اس طرح داخل نہیں ہوا جس طرح کسی مسجد میں داخل ہوا جاتا ہے۔ ایک خوشنما ویرانی ماحول میں بکھری ہوئی تھی۔ پانی کا انتظام بھی نہ تھا۔ میں نے مسجد کی دیواروں پر ہاتھ پھیرا اور وہی ہاتھ منہ پر

KitaabPoint.blogspot.com

پھیر لیا۔ میرا تیمم ہو گیا۔ میں نے وہاں دو رکعت نماز پڑھی۔ ندامتوں سے بھری ہوئی میری پیشانی ان گنت نامسجود بے قرار سجدوں سے سج گئی۔ میرے آس پاس ایک صحرا پھیل گیا جس میں ہر طرف سراب ہی سراب رقص کر رہے تھے۔ مجھے سلیم احمد کا شعر یاد آیا وہاں سننے والا کون تھا۔ پہلی بار مجھے خود کلامی میں ہم کلامی کا مزا نہیں آیا۔

شاید کوئی بندہ خدا آئے
صحرا میں اذان دے رہا ہوں

میں نے مشہور جامع مسجد دلی میں بھی نماز کی مگر مجھے لگا جیسے میں اپنے آپ سے جھوٹ بول رہا ہوں۔ مسجد میں ہر طرف سیاحوں کی چہل پہل تھی یہ جگہ ہندوؤں نے ایک تفریح گاہ بنا کے رکھ دی ہے۔ ہندو ان جگہوں کو عجائب گھر نہیں بنائیں گے کہ ان کی قدامت میں عظمت کی خوشبو ابھی تازہ ہے۔ ہندوؤں کو اب ہماری مسجدوں سے خوف نہیں آتا۔ مسجدیں بھارت میں ویران ہو رہی ہیں۔ انہیں اذان کی آواز سے ڈر آتا ہے۔ اس آواز میں ایک ایسا راز ہے جو جلال و جمال کے کمال کی بازگشت بن کر ہندوؤں کے شعور و لاشعور پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

یہودی بھی اس آواز سے ڈرتے ہیں۔ چنانچہ مسجد اقصیٰ بھی ویران پڑی ہے۔ وہاں خفیہ طریقے سے ایک رات قدرت اللہ شہاب نے گزاری۔ انہیں محسوس ہوا کہ ہماری تاریخ ایک نورانی دائرے میں سفر کر رہی ہے۔ غرناطہ میں مسجد قرطبہ بھی ویران پڑی ہے۔ علامہ اقبال نے وہاں دو رکعت نماز پڑھی تھی۔ ایک عظیم نظم میں ان کے تاثرات ایک ادبی شہ پارہ بن گئے ہیں۔ مسجد بابری میں کوئی ایسا بندہ خدا نہ گیا نہ کسی کو جانے ہی دیا گیا۔ یہودیوں اور اسپینیوں کی مسلم دشمنی ہندوؤں سے کم نہیں۔ مگر مسجد اقصیٰ اور مسجد قرطبہ کو گرانے کا خیال ان کو نہ آیا۔ مسجد بابری بھی اپنی ویرانیوں میں گم کھڑی تھی۔ اسے گرا کے ہندوؤں نے کیا مقاصد حاصل کئے ہیں۔ انہوں نے دنیا والوں کو اپنا اصل چہرہ پھر دکھا دیا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کو بے قرار کر دیا ہے۔ اضطراب کی لہر کسی انقلاب کا پیشہ خیمہ بنے گی۔ مسجد بابری اب مسجد اقصیٰ اور مسجد قرطبہ کی ہم پلہ بن گئی ہے۔

اب بابری مسجد ہر مسلمان کے دل میں تعمیر ہو گئی ہے۔ وہاں اسے کون گرائے گا۔ لہو کے گنبدوں میں اذان کی صدا گونجے گی تو پھر ظالموں کو آخری غیض و غضب سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ اس شعر میں بھی میری بے قراریوں کو پناہ نہیں مل رہی۔

یوں لگتا ہے میرا دل بھی اک مسجد ہے اجڑی ہوئی
اپنا جیون ایک نظارہ نامسجود نمازوں کا

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

جب وہ خاتون اول تھی

دیکھا جائے تو ہر گھر میں خاتون اول ہوتی ہے جب تک مرد دوسری شادی نہ کر لے۔ کسی نے ایک دفعہ اپنی بیوی کو خاتون اول کہہ دیا وہ ناراض ہو کر سیدھی میکے چلی گئی یعنی اول کے بعد دوئم' سوئم اور چہارم بھی ہوں گی؟ چنانچہ بے چارے مرد نے بزرگوں سے مشورے کے بعد بیوی کو خاتون اول و آخر کہنا شروع کر دیا۔ بڑے لوگ شادی سے پہلے سکینڈل بنوا لیتے اور شادی کی نوبت آنے سے پہلے ہی شاد کام ہو جاتے ہیں۔

محترمہ کلثوم نواز نے کہا کہ ہماری حکومت کے دوران آبروریزی کے واقعات پچھلی حکومت کے اعمال کا نتیجہ ہے' سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو پچھلی حکومت کے دور میں ہوتا رہا جس کے نتیجے میں اسے رخصت ہونا پڑا' بلکہ اس کی رخصتی کر دی گئی' کیا یہ سب کچھ بھی پچھلی حکومت کے اعمال کا نتیجہ تھا۔ اس حکومت میں کسی نہ کسی طرح جناب نواز شریف بھی شامل تھے بلکہ پنجاب میں تو وہی وزیر اعلیٰ تھے' لوگوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیاں تو ایک تسلسل ہے جس میں کبھی رخنہ نہیں پڑا۔ ہر دور میں لوگوں نے دیکھا کہ یہ حکمران بھی وہی کچھ کر رہے ہیں جو پہلوں نے کیا تھا یا ان سے کرایا گیا تھا۔ لوٹ کھسوٹ اور لوٹ مار برابر چل رہی ہے۔ لوٹ کھسوٹ سب حکام کرتے ہیں۔ لوٹ مار چند عوام کرتے ہیں' حکام تو اپنی ہر کوتاہی پچھلی حکومت کے سر ڈال دیتے ہیں پھر خود پچھلے بن بیٹھتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں۔ یہ لوگ اقتدار میں رہتے ہیں یا اقتدار کے انتظار میں رہتے ہیں۔ ہم ایک دایرے میں چل رہے ہیں۔ ایک چکر کے بعد وہیں آ کھڑے ہوتے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ پورے چکر میں وہی کچھ ہوتا رہتا ہے جو اس سے پہلے چکر میں ہو رہا تھا۔ آخر سالہا سال سے یہ ہمارے ساتھ کیا چکر چلایا جا رہا ہے۔ جو آتا ہے گھن چکر ہی ہوتا ہے۔

ایک گراؤنڈ میں لڑکوں کو ورزش کرائی جا رہی تھی چکر پہ چکر بہت سے نوجوانوں کو چکر آنے لگے۔ ایک تو باقاعدہ چکرا گیا۔ اس نے پیاس محسوس کی اور درخواست کی کہ اسے تھوڑا سا پانی پلایا جائے مگر ہمارے ہاں درخواست کرنے والوں کو احتجاج کرنے والوں میں شمار کر لیا جاتا ہے۔ اس کو سکول سے نکال دیا گیا۔ دوسرے پیاسے لڑکے نے سیاست سے کام لیا اور اپنے سے اگلے والے کو تھپڑ دے مارا جب اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو لڑکے نے اشارہ کیا کہ پیچھے سے آ رہا ہے اس نے اپنے سے اگلے والے کو تھپڑ دے مارا اس طرح تھپڑ آگے بڑھتا گیا اور بالآخر گروپ لیڈر کو جا لگا۔ اس نے ہالٹ کہہ کر سب کو روک دیا اور انکوائری شروع کر دی۔ چنانچہ اب ہم

KitaabPoint.blogspot.com

چل نہیں رہے' انکوائریاں کرار ہے ہیں اور انکوائریوں کا کوئی نتیجہ اب تک نکلا نہیں' ہم کو یہ پتہ ہی نہیں چلنے دیتے' یہ طے ہی نہیں کر سکے کہ زیادتی میں پہل کس نے کی۔ لوٹ مار اور لوٹ کھسوٹ شروع کرنے والے کون تھے۔ کہتے ہیں کہ جو بھی زیادتی ہوئی پہلے والوں نے کی ہے۔ یہ بات بہتر نہیں کہ ہم اس لگن خلوص اور محبت سے کام شروع کریں کہ جیسے ساری زیادتیاں ہم نے کی تھیں' اب ان کا ازالہ بھی ہم نے کرنا ہے۔

حالات جس تیزی سے بگڑ رہے ہیں' زندگی یا تو شرمندگی بن کے رہ گئی ہے یا درندگی..... زندگی کچھ اور زندگی کب بنے گی' اس آخری سوال کے جواب کے لیے ہم کسی مرد حکمران کی بجائے خاتون اول کی طرف رجوع کریں گے۔

محترمہ کی یہ بات قابل تحسین ہے کہ انہوں نے عورت کی حیثیت سے محترمہ بینظیر بھٹو کے لیے عزت مندی کے جذبات کا اظہار کیا۔ محترمہ بینظیر بھٹو وزیر اعظم تھیں تو وہ اختلافات کے باوجود کلثوم نواز شریف کے گھر آئی تھیں۔ تب محترمہ کلثوم نواز ان سے ملی ہوں گی۔ کاش وہ ایک دوسرے کی سہیلیاں بن گئی ہوتیں تو موقعہ پرست سیاست دان ہم سے پہیلیاں تو نہ بجھا رہے ہوتے۔

محترمہ کلثوم نواز نے جس طرح قومی انتخاب میں پاکستانی عورتوں میں کام کیا ہے' یہ ایک معرکہ ہے۔ مسلم لیگ کا ویمن رنگ اب نمبر ون ہے۔ محترمہ کلثوم بہت سادہ مزاج ملنسار اور باوقار خاتون ہیں۔ سیاسی سرگرمیوں کے باوجود وہ سیاست نہیں کرتیں' کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ وطن عزیز بھی ایک خوبصورت گھر بن جائے بلکہ ایک خوشحال گھرانہ بن جائے۔ محترمہ بھٹو بھی توجہ فرمائیں۔

کیا دن تھے کمال اس کو ستاتی تھی شب و روز
خوشبو کی طرح گھر میں بکھر جانے کی خواہش

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

جناح کیپ اور ماؤ کیپ

اب چینی ادیبوں کا پاکستان آنا کوئی واقعہ نہیں۔ وہ آتے ہی رہتے ہیں وہ جب آتے ہیں تو لگتا ہے کہ پہلی بار آئے ہیں۔ یہ بھی لگتا ہے کہ کئی بار آ چکے ہیں۔ اپنائیت اور وابستگی مل کر ایک دوستانہ فضا بناتی ہے۔ ان سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔ دوسری بار دگنی اور تیسری بار تگنی چوتھی بار چوگنی خوشی ہوتی ہے۔ ہم چینی زبان نہیں جانتے' لیکن ان کی بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ پنجابی ادیب راجہ رسالو نے چینیوں سے کہا کہ آپ ہماری محبت کا اندازہ کریں ہم آپ کو چائے کی پیالی میں گھول کر دن میں کئی بار پیتے ہیں۔ چینی کے بغیر کسی شے میں مٹھاس کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ ہمارے ادیبوں نے کئی ملکوں کے سفرنامے لکھے ہیں مگر چین کا سفرنامہ جس نے بھی لکھا منفرد اور ممتاز ہوا۔ ابن انشاء کی کتاب کا نام ''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' بشریٰ رحمٰن کی کتاب کا نام ہے ''چین گئے چین گیا'' حسن رضوی کا سفرنامہ ''چینیوں کے چین میں'' کے نام شائع ہونے والا ہے۔

چینی ادیب اس سال اب ہمارے ملک میں آئے ہیں۔ جب یہاں حزب اختلاف ایک تحریک چلا رہی ہے۔ جسے لانگ مارچ کا نام دیا گیا ہے۔ لانگ مارچ تو ایک ہی ہوا تھا جس کا لیڈر اور سپہ سالار چیئرمین ماؤ تھا۔ چینیوں نے اس انقلابی عمل کو تاریخ ساز بنا دیا۔ اس لانگ مارچ کے نتیجے میں انقلاب آیا۔ ہم جسے لانگ مارچ کا نام دے رہے ہیں' وہ ایک ہڑتالی مہم ہے جس کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ سیاسی انقلاب آ سکتا ہے۔ انقلاب اور سیاسی انقلاب میں فرق ہے۔ ہم سیاست اور زندگی میں شارٹ کٹ تلاش کرنے کے جنون میں بہت آگے جا چکے ہیں۔ ہم میں چینیوں جیسا تحمل کہاں۔ ہم جدوجہد کے قائل ہی نہیں۔ ہم میں خوبی کی بات صرف یہ ہے کہ چین کے ساتھ ہماری دوستی بہت پکی سچی ہے۔ ہم قائداعظم کے بعد متاثر ہی چیئرمین ماؤ سے ہوئے۔ جناح کیپ کے بعد ماؤ کیپ ہی مقبول ہوئی۔ جناح کیپ وزیروں کے کام آتی ہے اور ماؤ کیپ اب چین میں بھی کوئی نہیں پہنتا۔ اب کے بھی چینی اہل قلم آئے تو اکادمی ادبیات پاکستان نے پاکستان بھر کے اہل قلم کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کا اہتمام کیا۔ کراچی میں اکادمی کے چیئرمین غلام ربانی آگرو نے ان کا استقبال کیا۔ وہ لاہور آئے تو بھی آگرو صاحب ان کے ساتھ تھے۔ افتخار عارف اور خالد اقبال یاسر بھی وفد کے ہمراہ تھے۔ لاہور میں قاضی جاوید نے چینی ادیبوں کے ساتھ لاہور کے اہل قلم کی ملاقات کا اہتمام ایک مقامی ہوٹل میں کیا۔ اچھی خاصی تعداد شوق ملاقات میں کھینچی چلی آئی۔ تعارف کرانے کے لیے تقریریں ہوئیں۔ حالانکہ چینیوں کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ چین سے آئے ہیں اور ہم پاکستانی ہیں۔ گفتگو کے دوران چینی ادیبوں سے سوال کیے گئے۔ کئی سوال ایسے تھے جو

KitaabPoint.blogspot.com

چینیوں نے بھی ہم سے پوچھ لیے۔ ایسی ہی صورت حال میں رشید مصباح نے کہا کہ پاکستان میں لکھے جانے والے ادب کے موضوعات تقریباً ویسے ہی ہیں جو انقلاب سے پہلے چین میں تھے۔ اس پر چینی ادیبوں نے حیرانی اور ہم نے پریشانی کا اظہار کیا۔ مجھ سے رہا نہ گیا کہہ دیا کہ جناب اب تو ہم نے لانگ مارچ بھی شروع کر دیا ہے۔ اس پر ایک دبلا سا قہقہہ گونجتے گونجتے رہ گیا۔ چین میں انقلاب کے بعد جو صورت حال ہے یہ بھی مثالی ہے۔ محنت کرنے کی عادات ان لوگوں کی فطرت میں گھلی ہوئی ہے۔ سائیکل چین کی سڑکوں پر اسی طرح بھاگتی ہے جس طرح بدن کی شریانوں میں لہو دوڑتا ہے۔ ان کا لہو زیادہ سرخ نہیں مگر انہیں سرخ رنگ سے محبت ہے۔ کسی سیاسی نظریاتی فضا سے بالاتر ہو کر سوچیں کہ ہم جو سبز رنگ کو سیاسی رنگ دینے اور اس سے مفادات اٹھانے کی دن رات کوشش کرتے رہتے ہیں۔ کیا ہمیں سبز رنگ سے پیار ہے۔ سارے رنگ ایک ہی رنگ سے نکلے ہیں۔ نجانے ہم ہر معاملے میں صرف جذباتی کیوں ہو جاتے ہیں۔ میں نے ایک چینی شاعر کو پاکستانی جھنڈے کی والہانہ انداز میں تعریف کرتے سنا۔ یہ سبز ہلالی پرچم ہے۔ اس طرح ان کا نظریہ خراب نہیں ہوا۔ ہر بات میں ہمارے ایمان کو خطرے میں دکھا کر ہمیں بے وقوف بنا کر سیاسی کھیل کھیلے جا رہے ہیں۔ چینی شاعر چیو کانگ کی نظم سنیں۔

سبز ہمیشہ موسم بہار کا نشان ہے
سرخ دل کی گرم جوشی کی ترجمان ہے
حالانکہ میرے پرچم کا رنگ مختلف ہے
لیکن روشن چاند تمہارا اور ہمارا ہے
اس چاند کی روشنی دریائے سندھ دریائے یلو
دریائے جانگسی کے پانی میں منعکس ہو رہی ہے
سرخ ہمارے لہو کی طرح ہے
زمین پر بہہ رہا ہے
مسٹر محمد علی جناح کی روح کی طرح ہے
یہ روح پاک سرزمین پر چھائی ہوئی ہے
سرخ اور سبز مل کر قوس وقزح بن جاتا ہے
میں سورج کی روشنی میں موسم بہار کی تازہ لہر
ہوا کے پر کے اوپر بیٹھ کر آ رہا ہے

KitaabPoint.blogspot.com

محبت کے پھول لایا ہوں

میں پاکستان کی سرزمین چومنے آ رہا ہوں

یہ نظم اے جی جوش کے عشائیے میں پڑھی گئی۔ نظم کا اردو ترجمہ تھانگ منگ شنگ نے کیا ہے۔ چینی ادیبوں اور پاکستانی اہل قلم کے درمیان ترجمانی کا سارا کام تھانگ صاحب نے کیا۔ ہم نے دوسرے چینی ادیبوں سے بھی بات چیت کی۔ اشاروں کی زبان سے بھی کام لیا مگر لمبی گفتگو تھانگ صاحب کے ساتھ رہی۔ تھانگ صاحب نے احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے حوالے سے تنقیدی کام بھی کیا ہے۔ ان کی بیوی اورینٹل کالج سے پڑھ کے گئی ہے۔ خدا کی بستی کے چینی ترجمے پر مشتمل ان کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی چھپ چکا ہے۔ ایک ایڈیشن کم از کم چھ ہزار کی تعداد میں ہوتا ہے۔ تھانگ صاحب نے بتایا کہ چین میں شاعری پاکستان کی طرح مقبول نہیں۔ لوگ افسانے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ناول دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ سفرنامہ بھی لکھا جا رہا ہے۔ ایک سفرنامہ نگار چونگ نمین پاکستان کا دورہ کر چکا ہے۔ اس نے پاکستان کے بارے میں مضامین لکھے ہیں۔ پاکستان آنے کے لیے چینی اہل قلم بہت خواہش رکھتے ہیں۔

چینی وفد کے ساتھ سفارت خانہ چین کے فرسٹ سیکرٹری شان یوشیانگ بھی تھے۔ وہ بہت صحت مند ہیں۔ شاندار لگتے ہیں۔ بیوروکریٹ ہیں۔ ہمارے افسروں جیسی پھوں پھاں ان میں نہ تھی۔ مگر کچھ تھا کہ وہ مختلف نظر آ رہے تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اے جی جوش نے چینی ادیبوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے کہا کہ اب چینی ادیبوں کے ساتھ غیر سرکاری سطح پر بھی رابطے ہونے چاہئیں۔ اکادمی والوں نے بھی اپنی تقریبات کو سرکاری نہیں ہونے دیا تھا۔

وفد میں شامل تینوں خواتین ملنسار تھیں مگر ایک رکھ رکھاؤ ان میں تھا۔ مشرقی روایات کا ایک قرینہ چینی خواتین و حضرات میں ہے۔ فطری طور پر شرمیلے لوگ ہیں۔ اخلاق والے مروت والے اور سیدھے سادھے اب کہیں کہیں وہاں لڑکا لڑکی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے نظر آ جاتے ہیں۔ مگر اس عمل کو سرعام پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا شعر و ادب میں عشق و عاشقی کے مضامین مل جاتے ہیں مگر پاکستانیوں کی طرح کھل کھلا کر اظہار نہیں ہوتا۔ وہاں مک مکا بھی نہیں ہوتا۔ لوگ مطالعے کا شوق رکھتے ہیں۔ کتابیں سستی ہیں وہاں شہر اور گاؤں میں فرق کم ہیں۔ دیہاتوں میں خوبصورت مکانات یعنی کوٹھیاں بھی بننے لگی ہیں۔

چین کے دانشوروں' ادیبوں اور سیاست دانوں کے درمیان ایک فکری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ایک انقلابی تسلسل دلوں اور ذہنوں کے درمیان زندہ ہے۔ اسے زندہ تر کرنے کی کوشش جاری ہے۔ چینیوں کی جدوجہد صرف اپنے ملک کی تعمیر و ترقی کے جذبے میں سمٹی ہوئی ہے۔ وہ ہر دم یہی سوچتے اور چاہتے ہیں کہ عوام کی زندگی کو کیسے خوشحال بنایا جائے۔ مظلوم اقوام کی مدد کرنا اور سچی تحریکوں

KitaabPoint.blogspot.com

کے ساتھ تعاون کرنا بھی ان کی پالیسی کا حصہ ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ سویت یونین کے منتشر ہونے کے بعد دوسری بڑی سپر پاور کے طور پر چین آگے آئے تو ایسی کوئی کارروائی یا سرگرمی دکھائی نہیں دیتی۔ منفی سوچ والا کوئی ارادہ اس عظیم قوم کے لوگوں میں پیدا نہیں ہوسکتا۔ پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں ایک لوک داستان کیسر داستان کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دنیا کی طویل ترین ایپک یعنی رزمیہ داستان سے تبت میں کیسر داستان کا ذکر ہے۔ یہ سن کیانگ کا علاقہ ہے جس کا ایک مشہور شہر کاشغر ہے۔ یہاں کی زبان فارسی سے ملتی جلتی ہے۔ کیسر داستان پاکستان اور چین کی ایک مشترکہ لوک روایت ہے۔ اس داستان کی چار گھنٹے کی ریکارڈنگ بیجنگ ریڈیو سے ہوئی۔

خالد اقبال یاسر نے بتایا کہ سب سے پہلے سہ ماہی ''ادبیات'' میں کیسر داستان کا ایک مسودہ شائع ہوا۔ عباس کاظمی نے اردو ترجمہ کیا ہے۔ تھانگ صاحب نے بتایا کہ سن کیانگ کا معاشرہ پاکستان سے ملتا جلتا ہے۔ پاکستان کے بلتی علاقے کا رسم الخط چین سے ملتا جلتا ہے۔ بیجنگ میں کیسر داستان کے حوالے سے ایک بین الاقوامی سیمینار بھی ہوا ہے اس پر جرمنی میں بھی تحقیق ہو رہی ہے۔

چین میں رائٹرز ایسوسی ایشن کے پانچ ہزار ممبر ہیں جن میں سے ڈیڑھ ہزار خواتین ہیں۔ وفد میں بھی آٹھ میں سے تین خواتین تھیں۔ گفتگو میں خواتین نے حصہ لیا بلکہ بھرپور حصہ لیا۔ چینی خواتین اپنی الگ پہچان نہ رکھتی تھیں۔ وہ وفد کی ممبران تھیں۔ جبکہ پاکستانی ادیب خواتین بار بار چینیوں سے عورتوں کے حقوق اور ان کی برابری کے حوالے سے سوالات کر رہی تھیں۔ چینی ادیب حیران ہو رہے تھے۔ آپس میں ان کی کچھ باتیں ہوئیں کہ وہ آٹھوں کے آٹھوں کھل کھلا کے ہنس پڑے۔ ہم بھی انہیں دیکھ کر ہنس پڑے۔

چینی شاعر تاؤ کے صوفیانہ انداز فکر کے حوالے سے اشفاق احمد کے ایک سوال پر چینی ادیب نے بار بار ایک ناول کا حوالہ دیا جس کا نام ''مسلمانوں کا جنازہ'' ہے۔ جب اس ناول کے موضوع کے بارے میں پوچھا گیا تو چینی ادیبوں نے بڑی معصوم سادگی سے بتایا کہ انہوں نے یہ ناول پڑھا نہیں۔ اس پر ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ اس معاملے میں بھی وہ پاکستانیوں سے مختلف ہیں یہاں تو کتاب پڑھے بغیر تبصرے کر دیئے جاتے ہیں۔ اس ناول کا اردو ترجمہ ہونا چاہیے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

ڈاکٹر صفدر محمود کے حق میں کلمہ حق

ہمارے وہ سرکاری افسران جو لکھنے پڑھنے سے دلچسپی رکھتے ہیں' خاصی مظلوم مخلوق ہیں۔ انہیں آسانی سے کہیں قبول نہیں کیا جاتا۔ اپنی اصل برادری میں وہ اوپرے اوپرے ہوتے ہیں کہ وہ عام افسروں سے ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ ادیب برادری میں بھی وہ اجنبی اجنبی ہی رہتے ہیں کہ وہ خاص ادیبوں سے خاصے مختلف ہیں۔ مرتضیٰ برلاس نے اسی صورت حال کا نقشہ کھینچا ہے۔

دوستوں کے حلقے میں وہ کج مقدر ہوں
افسروں میں شاعر ہوں شاعروں میں افسر ہوں

اہل قلم افسران دوہرے عذاب کا شکار ہوتے ہیں۔ شاید کچھ افسران اپنے عہدے کی بدولت کسی وقت رعایتی نمبروں سے فیض یاب ہوتے ہیں مگر شاید ہی کسی کو ملازمت کے سلسلے میں مراعات ملی ہوں۔ ان کے لیے پریشانی بہر حال ہمیشہ موجود رہتی ہیں۔

اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی

قدرت اللہ شہاب کا نام پاکستانی ادب کے حوالے سے ایک ممتاز اور محترم نام ہے۔ انہوں نے ایک قابل اور دیانت دار افسر کے طور پر بڑی خدمات انجام دیں مگر جنرل یحییٰ کے زمانے میں انہوں نے وطن سے دور بڑی کسمپرسی کی زندگی بسر کی۔ مسعود مفتی 1979ء میں حالات سے مایوس ہو کر فیلا چلے گئے اور اب تک ملک سے باہر ہیں۔ البتہ الطاف گوہر ہیں اپنی سیاست کی بدولت اہل اقتدار کی دستبرد سے بچ سکے۔ وہ مناسب وقت پر افسری کی حدود سے نکل گئے۔

میرے خیال میں سرکاری افسران کی حیثیت کچھ نیم سیاسی ہوتی ہے۔ ہماری حکومتیں افسروں کو اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے استعمال کرتی ہیں اور افسران اس ضمن میں بہت حد تک مجبور محض ہوتے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب اور الطاف گوہر اپنے وقت میں مرکزی سیکرٹری اطلاعات کے عہدے پر فائز تھے۔ سیکرٹری اطلاعات کو اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے سیاسی معاملات میں ملوث ہونا پڑتا ہے۔ ریڈیو ٹیلی ویژن اور اخبارات کا کردار ہمیشہ متنازعہ ہوتا ہے جبکہ سیکرٹری اطلاعات حکومت وقت کے لیے براہ راست ان سرگرمیوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ یہی کردار کسی بھی صوبے کے سیکرٹری اطلاعات کا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صفدر محمود کا قصور صرف اتنا ہے کہ انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے اپنے عہدے کو نظریہ پاکستان اور تعمیر پاکستان کے لیے

KitaabPoint.blogspot.com

مفید بنایا۔ صوبائی سیکرٹری اطلاعات جس حکومت کے تحت کام کر رہا ہو وہ اس کے احکام ماننے سے کیسے انکار کر سکتا ہے۔ اب اگر مرکز اور صوبے میں مختلف ملکہ متحارب حکومتیں ہیں تو اس لڑائی میں افسران کو رگڑنا کہاں کا انصاف ہے۔ اپنے ان اقدامات سے حکومتیں یہ ثابت کر رہی ہیں کہ تمام سرکاری ملازمین اور افسران ان کے ذاتی نوکر ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں بیوروکریسی کو غلط طور پر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ افسران بے چارے تو کٹھ پتلیاں ہیں۔ حکمران تو فوجی لوگ ہوتے ہیں یا سیاسی لوگ ہوتے ہیں۔ آخر حکمران اپنی ناکامیوں اور مجبوریوں کا بوجھ افسروں پر ڈال کر اپنی کس نفسیاتی کمزوری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بیوروکریسی کے اوصاف اور اثرات میرا موضوع نہیں۔ بیوروکریسی نے بھی عام لوگوں کے ساتھ کوئی اچھائی نہیں کی۔ وہ تو ہمارے مستقل حکمران ہیں ہر حکومت ان کی طرف دیکھتی ہیل۔ ان کی خوشامد بھی کرتی ہے۔ ان پر غصہ بھی نکالتی ہے۔ بہرحال یہ بات بھی اپنی جگہ سچ ہے کہ بیوروکریسی بالخصوص کسی محکمے کا سیکرٹری اگر چاہے تو لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے حیرت انگیز کارنامے کر سکتا ہے۔ مگر ہمارے لوگ افسروں اور حکمرانوں کی خدمات سے محروم ہیں۔ اصل حاکم وہ ہے جو افسران کا تبادلہ کرنے کی پوزیشن میں ہو مگر سیاست دان اپنے مفاد کے حوالے سے افسروں کے خلاف انتقامی کارروائی کریں تو یہ کسی لحاظ سے بھی مستحسن نہیں۔ صدیق سالک نے اپنی کتاب تادم تحریر میں لکھا ہے۔

''بیوروکریسی ایک بھرا ہوا پستول ہے جسے حکومت وقت جب چاہے اور جس وقت چاہے فائر کر سکتی ہے۔ اگر وہ خود پستول کی آواز سے ڈرتی ہو تو بھرا بھرایا پستول اگلی حکومت کے حوالے کر سکتی ہے۔ پستول کے استعارے پر غور کرتے ہوئے مزید غور کیجئے کہ ایک باوردی بیوروکریسی بھی ہوتی ہے۔''

صدیق سالک کی اس تحریر میں سیاست دانوں کے لیے بڑی غور کی باتیں ہیں۔ بیوروکریسی سے کام لینے کے لیے حکومت کے ساتھ ساتھ حکمت کی بھی ضرورت ہے۔ حکمرانوں کی کمزوریوں اور جاہ پرستیوں نے افسروں کو بھی اپنی راہ سے ہٹا دیا۔ چنانچہ ہماری سرکاری مشینری کا یہ کردار اب پختہ ہو چکا ہے کہ حکمرانوں کا رانجھا راضی رکھو اور اپنی من مانی کرو۔ ہمارے تھانے اور ہمارے سیکرٹریٹ اپنی اپنی سطح پر ایک جیسا کام کر رہے ہیں۔

ایسے میں سرکاری جگہوں پر کوئی ایک آدھ آدمی سینے میں دھڑکتا ہوا دل اور ہاتھ میں چمکتا ہوا قلم لے کر آ جائے تو اس کی شامت آ جاتی ہے۔ یہاں یہ لوگ ہی آخر کیوں قابل قبول نہیں۔ پولیس کے افسران اور سول سروس کے عہدہ داران میں سے سیکرٹری اطلاعات کا منصب ایک وادی پر خار بن گیا ہے۔ حکومت اس کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہوتی اور اپوزیشن بھی اسے اپنا مخالف سمجھتی ہے۔ اگر

KitaabPoint.blogspot.com

خیر سے سیکرٹری اطلاعات کوئی علمی اور ادبی شخصیت ہو تو اس کی خیر نہیں۔

صوبہ پنجاب کے سیکرٹری اطلاعات کے طور پر ڈاکٹر صفدر محمود کی خدمات کا دائرہ پورے پاکستان تک پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے پاکستانی فکر کو نئے سرے سے ذہنوں میں اجاگر کرنے کے لیے قابل قدر کام کیا۔ وہ ایک ادیب' مورخ اور سیاسی مفکر کے طور پر ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے تحریک پاکستان کے گم شدہ کارکنوں کو تلاش کیا اور ان کی ملکی سطح پر عزت افزائی کرائی۔ ڈاکٹر صفدر محمود نے اس طرح پورے پاکستان کے خادم ہونے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ انہوں نے پاکستانیات کے حوالے سے بہت معرکے کی کتابیں لکھی ہیں۔

قدرت اللہ شہاب اور الطاف گوہر کے بعد ڈاکٹر صفدر محمود بھی مرکزی سیکرٹری اطلاعات بنے۔ ہر آدمی خوش ہوا کہ اب قومی سطح پر صاحب درد اور صاحب علم آدمی کوئی بڑا کام کرے گا مگر چند دنوں کے بعد انہیں ہٹا دیا گیا۔ ان کی زندگی گوشہ نشینی کی مہمان بن گئی ہے کاش ہم ان کی علمی مہمان نوازی سے فائدہ اٹھا سکتے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

حلقہ ارباب ذوق وشوق

میرا خیال تھا کہ یونس جاوید کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کچھ لکھوں گا کہ اس نے اپنی بہت بڑی تحقیقی کتاب میں میرا ذکر کیا۔ یہ میرے لیے اس طرح مفید تو نہیں ہوسکتا جتنا اس کی مخالفت سے کتاب کی شہرت کے لیے مفید ہے۔ بعض اوقات مشہور ہونے کے لیے مخالفت سے زیادہ تیر بہدف نسخہ کوئی نہیں ہوتا۔ لوگ منت سماجت کر کے اپنے خلاف لکھاتے پکڑتے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی مخالفت تو انتظار حسین کرتے ہیں کہ چنگے بھلے آدمی کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ لفٹ نہ کرانا یا نوٹس نہ لینا مخالفت کا سب سے موثر اصول ہے۔

لڑائی ہے کشور ناہید اور یونس جاوید کی۔ انتظار حسین یونس جاوید کی حمایت کرنا چاہتے ہیں۔ ایک روزنامہ میں ان کے کالم کا موضوع ہے ''بھنڈرانوالہ اکال تخت اور حلقہ ارباب ذوق'' یونس جاوید اور کشور کو بچاتے بچاتے انہوں نے وہی رویہ اختیار کیا ہے جو اکال تخت کی تباہی کے بعد ذیل سنگھ صدر بھارت نے اپنی تقریر میں اختیار کیا اور بال آخر غصہ مجھ پر نکالا کہ یہ سب کچھ حلقے کا ساتھ ان تیس چالیس نئے ارکان نے کیا جن کو میرے سیکرٹری شپ کے زمانے میں رکن بنایا گیا تھا۔ میرا نام انتظار حسین نے نہیں لیا اس طرح ان کی ناموری پر حرف آتا ہے۔

یونس جاوید نے بھی حلقہ کو غیر آئینی بنانے کے ضمن میں اعتراض یہی کیا ہے۔ ان ارکان کے لیے غلط طریق کار اختیار کیا گیا۔ ان سے باقاعدہ درخواستیں طلب نہیں کی گئیں تو جناب یہ غیر آئینی طریق کار پچھلے دس پندرہ برس سے رائج چلا آرہا ہے۔ یونس جاوید کی کتاب کے مطابق مجھے 72-1971ء میں حلقہ کا ممبر بنایا گیا۔ مجھ سے اس سلسلے میں کوئی درخواست طلب نہیں کی گئی تھی۔ مجھے اس رکنیت کی اطلاع ہی دیر بعد ہوئی تو پھر اس غیر آئینی حرکت کے لیے صرف میں ہی یونس جاوید کی تحقیق کی زد میں کیوں آیا جبکہ اکثر اوقات لوگوں سے حلقہ کا رکن بننے کی درخواست بھی کی جاتی رہی ہے۔

خیر میری گزارش یہ ہے کہ انتظار صاحب اور یونس جاوید دونوں مل کر تیس چالیس ارکان کی فہرست پر براہ کرم ایک نظر اور ڈالیں۔ چند نوجوانوں کو چھوڑ کر ایک آدمی بھی ایسا ہے جو حلقہ کا رکن نہیں بننا چاہیے تھا۔ وہ موازنے کے طور پر حلقہ کی فہرست پر بھی نگاہ ڈالیں اور پھر کیا نوجوانوں کو رکن بننے کا حق نہیں۔ اس کے لیے حلقہ کے آئین میں ترمیم کرائیے اور عمر کا تعین کر دیجیے۔ یہ پابندی بھی

KitaabPoint.blogspot.com

لگوایئے کہ اس عمر سے نیچے کے لوگ حلقہ میں صرف سننے کے لیے آیا کریں ورنہ تو آئین کی رو سے جو دوبارا پنی تخلیق تنقید کے لیے پیش کرے گا وہ رکن ہونے کا حق دار ہوگا کسی کو رکن نہ بنایا جائے یا نہ بننے دیا جائے یہ الگ بات ہے۔

ہمیشہ حلقہ کی رکنیت کے لیے صرف اپنے گروپ کے لوگوں کو ترجیح دی جاتی رہی ہے اور یہی آئینی عمل سمجھا جاتا رہا ہے۔ ایک دو آدمی باہر کے یعنی دوسرے گروپوں میں سے بھی لے لیے جاتے تھے تاکہ اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ اس طرح ہر بار انہی کے آدمی کے جیتنے کے روشن امکانات ہوتے تھے اور ہوتے ہیں۔ جبھی تو یار لوگوں کو حلقہ ارباب ذوق (ادبی) بنانے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ پھر ان لوگوں کی اکثریت سعادت سعید والے حلقے کو ادبی بنانے کی کوشش بھی کرتی رہی ان لوگوں کو انتظار صاحب کی شاباش بھی حاصل رہی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ سعادت سعید والے حلقے کو کشور ناہید کی اشیر باد بھی حاصل رہی۔ وہ اس حلقے کی بھی لیڈر ہے جسے انتظار صاحب نے ایک بار پھر "سیاسی" کا لقب عطا کر دیا ہے۔ ادبی بنتے بنتے سعادت والا حلقہ بند ہو گیا۔ شنید ہے کہ سعادت سعید نے یہ کشور کے کہنے پر بند کیا ہے تاکہ اس کی قیادت میں تمام ادیبوں کا حلقہ ایک نمائندہ تنظیم بنے اور وہ یہ کریڈٹ بھی اپنے کھاتے میں ڈال سکے۔ کھاتہ میں نے لغوی معنوں میں استعمال کیا ہے عرف عام میں انتظار حسین کو بھی کشور گروپ کا آدمی سمجھا جاتا ہے۔ وہ حلقہ کے سیاسی ہونے کا نوحہ لکھتے ہیں۔ اس تضاد کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں حلقہ کا سیکرٹری اتفاقاً بن گیا۔ میں سیاسی اور ادبی کی تقسیم کا قائل نہیں۔ میں رائٹ اینڈ لیفٹ کو بھی صرف ادبی فرقہ بازی سمجھتا ہوں۔ میں نے حلقہ کو ایک آزاد جمہوری اور ادبی ادارے کے طور پر چلایا۔ میں نے گروپوں کی تخصیص ختم کر کے حلقے کے ہر رکن اور ہر اچھا لکھنے والے کو موقع دیا کہ وہ پروگرام میں شرکت کر سکے۔ لوگوں نے تو پروپیگنڈہ کیا کہ حلقہ دوسرے چینل میں چلا گیا۔ حقیقت میں اسے چینلائز کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ کوشش میں نے کی کہ حلقہ کو صرف حلقہ رہنے دیا جائے۔ ادبی یا سیاسی کا لیبل اس پر چسپاں نہ کیا جائے۔ یہ بہر طور طے ہے کہ یہ ایک ادبی پلیٹ فارم ہے۔ یہ کسی ایک گروپ کا سیاسی مورچہ یا صدر دفتر نہیں ہے۔ میں اس عمل میں کسی حد تک کامیاب رہا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک مدت کے بعد میرے زمانے میں ہی انتظار حسین بھی نشستوں میں شریک ہوئے اور صدارت بھی کی۔

جہاں تک حلقہ کو متحد کرنے کا معاملہ ہے تو اس ضمن میں سب سے زیادہ کوشش میں نے کی میں حلقہ کا سیکرٹری ہوتے ہوئے سعادت کے حلقہ میں گیا اور وہ بھی اپنے سارے گروپ سمیت ہمارے ہاں آتا رہا لیکن اس نے میرے مقابلے میں حلقہ جاری رکھا سنا ہے ان دنوں کشور حلقہ کو ایک کر کے نمائندہ تنظیم بنانے کے حق میں نہ تھی حالانکہ میں نے سعادت کو متحد حلقہ کا عبوری طور پر سیکرٹری

KitaabPoint.blogspot.com

بن جانے کی پیشکش کی میرے سیشن کے اختتام پر بھی کئی حیلوں بہانوں سے اتحاد کی بات کو باتوں میں اڑا دیا جاتا رہا میں نے آخری ''غیر آئینی'' حرکت یہ کی کہ منصفانہ انتخابات کرا کے حلقہ نئے لوگوں کے حوالے کر دیا۔ اب وہ اپنے آپ کو کسی اور کے حوالے کر دیں تو اس میں یونس جاوید کا مجھ پر خفا ہونا حق بات تو نہیں۔ البتہ ان لوگوں کو اپنی پسند کے پروگرام کرنے پسند کے نئے رکن بنانے اور پسند کی قرار دادیں پیش کرنے کا حق ہے۔ انتظار صاحب کی خدمت میں آخری گزارش یہ ہے کہ حلقہ کا سیکرٹری اصغر ندیم سید اور جائنٹ سیکرٹری رشید مصباح ان تیس چالیس ارکان میں نہیں ہیں جن کو انہوں نے سارے فساد کا ذمہ دار قرر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے کالم میں جسے اندرا گاندھی کہا ہے وہ ذمہ دار ہے یونس جاوید بھی کچھ کچھ ذمہ دار ہے کہ اس نے تحقیق کے دوران ایک گروپ سے رابطہ رکھا مجھے کوئی اعتراض نہیں کہ تحقیق کے دروازے بند تو نہیں ہو گئے اگر چہ کچھ لوگ یہ کوشش بھی کر رہے ہیں کہ یہاں بھی صرف وہی دروازہ کھلا رہے جس پر ''اندر آنا منع ہے'' لکھا ہوا ہو۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

گورنمنٹ کالج میں خوشی کا رنگ

گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک سو پچیس سالہ جشن تقریبات کے آغاز پر افتتاحی تقریب میں شادمانی کے اظہار کے لیے ہزاروں غبارے اڑائے گئے ہیں۔ اس خبر سے کچھ لوگوں کے چہروں پر خفگی نمایاں ہوئی۔ شاید یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اس طرح کی خبروں پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ فلاں کے غبارے میں سے ہوا نکل گئی حیرت اس بات پر ہے کہ ہم خوشی منانے سے گھبراتے کیوں ہیں ہمارے ہاں تو میلوں ٹھیلوں کے علاوہ کسی ولی اللہ کے عرس پر بھی لوگ تماشے ہوتے ہیں۔

گورنمنٹ کالج ایشیا کا ایک بڑا تعلیمی ادارہ ہے۔ یہاں پڑھنے والے راوین کہلاتے ہیں اور کالج سے جانے کے بعد بھی کہلاتے رہتے ہیں۔ وزیر اعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف بھی راوین ہیں۔ انہوں نے افتتاحی تقریب میں شرکت کے لیے اس شرط پر رضامندی ظاہر کی کہ مجھے وزیر اعلیٰ کی بجائے راوین کہا جائے۔ یہاں قائد حزب اختلاف رانا شوکت محمود بھی موجود تھے۔ پنجاب اسمبلی کے متعدد ممبران راوین ہیں اور اس تقریب میں وہ سب ایک تھے کوئی حزب اقتدار اور حزب اختلاف نہ تھی' سب راوین تھے۔ راوین ایک برادری ہے جو پورے پاکستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسا رشتہ ہے جو کہیں ٹوٹتا نہیں۔ ہم پورے پنجاب اور پورے پاکستان کو ایک برادری کیوں نہیں بننے دیتے؟

گورنمنٹ کالج کی اس تقریب میں ایسی فضا دیکھنے میں آئی جو یہاں کا ایک عمومی رویہ ہے۔ غالباً ابھی تک یہ واحد ادارہ ہے کہ یہاں داخل ہوتے ہی آدمی اپنی پہلی پہچان بھلا دیتا ہے وہ کسی جاگیردار کا بیٹا ہو یا بیوروکریٹ کا' غریب کا یا امیر کا' گورنمنٹ کالج میں ہونے کے بعد وہ صرف راوین ہوتا ہے اور پھر ہمیشہ راوین رہتا ہے۔ ایسی تقریبات ہونا چاہیں جو ہمیں متحد کریں ل۔ ہمیں آپس میں جوڑ دیں۔ آج یہاں دو مخالف جماعتوں کے لیڈروں کو ایک احساس میں مشترک ہوتے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپس میں مثبت انداز میں اختلافات تو رحمت کا پیغام ہوتے ہیں مگر سیاسی دنگہ فساد لوگوں کو بہت پریشان کر رہا ہے۔

اب آپ کو محسوس ہوگا کہ اس تقریب میں رنگارنگی اور شادمانی کا سلسلہ کس قدر برمحل اور بامعنی تھا۔ آنسوؤں میں بڑی طاقت ہے' مگر مسکراہٹ اور قہقہے میں بھی بڑی طاقت ہے۔ ہم نے آنسو بھی بہت بہائے ہیں۔ اب بھی ہماری آنکھوں میں برساتیں رکی ہوئی ہیں۔ ایسے ہی کبھی کوئی ایسا موقعہ تو ہو کہ پوری کشادگی سے ہنس لیا جائے۔ ہم خوشی کے اظہار کے لیے ایسا ماحول بنائیں جس میں سب

KitaabPoint.blogspot.com

شریک ہوں۔ گورنمنٹ کالج کی اس تقریب میں غباروں کے نظاروں سے صرف نواز شریف ہی محظوظ نہ ہوئے ہوں گے۔ یہاں پھر میں اس خواہش کا اظہار کر دوں کہ اللہ کرے جلد ایسا ہو کہ مادر علمی اور مادر وطن کی سرحدیں ایک ہو جائیں۔ تعلیمی اداروں میں اور وطن کی فضاؤں میں سب کے لیے یکساں مواقع ہوں۔ دکھ جھیلنے کے بھی اور سکھ پانے کے بھی..... جب کہیں وسائل چند لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں اور مسائل دوسرے لوگوں کی جھولی میں ڈال دیئے جاتے ہیں تو ردعمل پیدا ہوتا ہے اس وقت ضرورت عمل کی ہے۔ ایسے عمل کی جو پوری قوم کو متحرک کرے اور متحد کر دے۔

گورنمنٹ کالج میں اب تقریبات سال کے اختتام تک ہوتی رہیں گی۔ شادمانیاں اور کامرانیاں تمام راوین کو ایک دائرے میں اکٹھا کریں گے۔ محبت، عظمت اور روایت کا دائرہ وسیع ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ سیاست اور سازش کی آڑ میں اس کالج کو کئی طبقوں میں تقسیم نہیں ہونے دیا جائے گا اور غباروں کے علاوہ کتابوں کے لیے بھی کچھ رقم خرچ کی جائے گی۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

عرفان صدیقی کی موت کا معمہ

ایک چھوٹی سی رف کاپی سلمٰی صدیقی نے مرے ہاتھ میں تھمادی ہے۔ جس کے پہلے تیرہ صفحوں پر اس کے جواں مرگ اور جواں مرد بھائی کی چار غزلیں اور تین نظمیں لکھی ہوئی ہیں۔ عرفان صدیقی کو نامعلوم افراد نے قتل کر دیا۔ ہمارے معاشرے میں معلوم حقیقتیں اور نامعلوم سفاکیاں بہت عام ہوتی جارہی ہیں۔ شاعری بھی معلوم سے نامعلوم اور نامعلوم سے معلوم تک ایک سفر ہے۔ سفر ہے منزل نہیں ہے۔ مجھے جو کاپی ملی ہے وہ سلمٰی صدیقی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے شعروں پر مشتمل ہے۔ عرفان صدیقی نے کسی اور کاغذ اور کسی اور ڈائری پر لکھا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ سلمٰی نے اپنے اکلوتے بھائی کے شعروں کو اصل شکل میں نوٹ کیا ہوگا۔ میں بھی عرفان صدیقی کے شعروں کو یہاں نقل کر رہا ہوں۔

میں نے اس شخص کے باطن سے محبت کی ہے
کیا ضروری ہے کہ چہرہ بھی رہے یاد اس کا
ہم گناہ گار محبت تھے کہ برباد ہوئے
وہ ہے معصوم کہ مے خانہ ہے آباد اس کا
ہم رقیبوں سے کبھی زیر نہ ہوتے عرفان
سخت مشکل تھی کہ عاشق تھا پری زاد اس کا

میں اپنے ہاں پولیس کے انداز تفتیش پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ مگر یہ لوگ شعروادب کا ذوق رکھتے ہوں تو ان کے لیے آسانیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ اتنا عرصہ گزرنے عرفان کا خاک میں ملنے والا خون چپ ہے۔ خاک بھی چپ ہے۔ خاک وخون رل مل جائیں تو زمین چپ رہی نہیں کبھی۔ زمین ہم سے روٹھی ہوئی ہے۔ آسمان سے ہم روٹھے ہوئے ہیں۔ اب فضا میں دوست ستاروں کی چمک مدھم پڑتی جاتی ہے۔

ہم پر ہونے والے ظلم کے خلاف گواہی کوئی نہیں دے گا۔ شاعر بھی اسی آسیب زدہ بستی کا مکین ہے مگر اس کے اندر گواہی دینے والا موجود ہوتا ہے۔ جو واقعے سے پہلے گواہیاں دیتا رہتا ہے۔ صرف گواہی سے کیا ہوتا ہے۔ فیصلے تو کوئی اور کرتا ہے۔ شاعر کی گواہی

KitaabPoint.blogspot.com

فیصلے سے کم نہیں ہوتی۔ مگر ہم اپنے شاعروں اور فنکاروں کی قدر کرنا چھوڑ بیٹھے ہیں۔ ہمارے پاس اب نہ خواب ہیں نہ تعبیریں ایک افسردگی ہے جو پھیلتی جارہی ہے۔

جب دوست خواہشات کی بستی میں جا بسے
تنہا کھڑا میں پاس کے جنگل میں رہ گیا
رخصت کی شام صورتیں سب اجنبی سی تھیں
تجھ کو میں ڈھونڈتا ترے آنچل میں رہ گیا
ایک ایک کر کے وقت نے سب داغ دھو دیئے
کوئی نشاں نہ قتل کا مقتل میں رہ گیا

اب مقتل کسی خاص جگہ کا نام نہیں۔ لوگ اپنے گھروں میں قتل کر دیئے جاتے ہیں انسان اپنے اندر بھی قتل ہو رہا ہے اس حادثے کا گواہ بھی اس کے اندر ہی ہے کہیں اسے باہر کون لائے۔ باطن کی پہچان کھو جائے تو باہر بھی شناخت کا عمل مشکوک ہو جاتا ہے۔ پھر دوست دشمن میں فرق نہیں ہو سکتا۔ محافظ اور قاتل ایک کردار کے نام ہو جاتے ہیں۔

کلیوں کے محافظ کانٹوں نے
سر اپنا اپنا قلم کیا
خود اپنے لہو میں ڈوب گئے
اور پتوں پر یہ رقم کیا
خوشبو بھی نہ ان کی پھیل سکی
اور رنگ بھی ان میں بھر نہ سکے
ہم اپنی خوشی سے جی نہ سکے
اور اپنی رضا سے مر نہ سکے

اس طرح کی شاعری سے لگتا ہے کہ وہ اپنے قتل کی ایف آئی آر خود لکھ رہا تھا۔ پیش آنے والے واقعات کی ایک شکل بہت پہلے کہیں بنتی رہتی ہے۔ جب ہم سب ان شکلوں کو دیکھنے پر قادر ہوں گے تو ڈری ہوئی گواہیوں کی ضرورت نہ رہے گی۔ ایک گہری اداسی

KitaabPoint.blogspot.com

کے کہنے پر میں یہ کاپی عرفان کی بہن سلمٰی صدیقی کو واپس کر رہا ہوں۔ وہ اسے مکمل کر لیں تو قتل کا سراغ مل جائے گا۔ کسی نہ کسی قتل کا سراغ تو ملے گا۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

چند اماموں اور چچا سام

روزنامہ پاکستان کی ایک رپورٹ کے مطابق جو ہفت روز ورلڈ نیوز کے حوالے سے شائع ہوئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ امریکہ چاند پر نہیں گئے۔ یہ وہ خود کہہ رہے تو اس میں ماننے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ چاند پر جانے کی بھی ان کی بات ہم نے مان لی تھی۔ کیا ہم نے پہلے ان کی کوئی بات نہیں مانی جو یہ نہیں مانیں گے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اکیس برس بعد یہ ثابت کر کے کیا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ چاند پر جانے کے کارنامے سے جو کچھ امریکہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس نے حاصل کر لیا ہے۔ چاند پر جانے کی خبر نے پوری دنیا کو حیران کر دیا تھا جبکہ اسے جھوٹ ثابت کرنے کی خبر نے لوگوں پر کوئی اثر نہیں کیا۔ امریکیوں کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے فراڈ کو کارنامہ بنا دیا اور اسے انسان کی کامیابی قرار دیا۔ انہوں نے عراق کو برباد کرنے کا اجازت نامہ اقوام متحدہ سے لے لیا۔

یہ 1969ء کی بات ہے کہ امریکہ کے چاند پر ڈورے ڈالنے کی مہم میں ساری دنیا شریک ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ اس وقت بھی تھے جو بے نیاز تھے اور وہ آج بھی بے نیاز ہیں۔ میں ذاتی طور پر ایسے ہزاروں لوگوں کو جانتا ہوں جو آج بھی اپنی بستی سے باہر نہیں گئے۔ وہ کبھی موٹر پر نہیں بیٹھے۔ انہوں نے ریل گاڑی نہیں دیکھی۔ ہوائی جہاز جن کے لیے پرندے کی طرح ہے وہ تو کبھی گھوڑے اور اونٹ پر بھی نہیں بیٹھے۔ ہم میں سے اکثر ایسے ہیں جو اپنے دیس کے خوبصورت مقامات کی سیر نہیں کر سکے۔

ہم اس سال سوات نہیں گئے۔

ہم پچھلے سال مری نہیں گئے تھے۔

جب ایک سادہ غریب ماں اپنے بچے کو پیار سے میرا چاند کہتی ہے تو اسے چاند پر جانے والے خلاباز سے کہیں زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ ہم سائنسی ایجادات کے خلاف نہیں۔ بس یہ ترقی انسان سے بنیادی جذبے اور رشتے نہ چھین لے بچوں کو تو یہ گلہ تھا کہ بے وقوف خلاباز چاند پر جا کے بھی اس بڑھیا سے نہیں ملا جو چرخہ کات رہی ہے۔ اگر نیل آرمسٹرانگ چاند کی بڑھیا کا جھوٹ موٹ کا انٹرویو بھی چھاپ دیتا تو بڑا مقبول ہوتا اگر وہ یہ لکھ دیتا کہ وہ بڑھیا نہیں نوجوان لڑکی ہے تو وہ دنیا کا سب سے بڑا سفرنامہ نگار ہوتا۔ اگر وہ چاند پر نہیں گیا تو بھی سفرنامہ لکھا جا سکتا تھا۔ ہمارے کئی سفرنامہ نگار جہاں نہیں جاتے وہاں کا سفرنامہ زیادہ اچھا لکھتے ہیں۔ ویسے نیل آرمسٹرانگ میں سفرنامہ نگاری کے کچھ کچھ جراثیم ہیں۔ اس نے اذان سن کر بیان دیا تھا کہ میں نے ایسی ہی آواز چاند پر سنی تھی۔ اس

KitaabPoint.blogspot.com

سے دنیا بھر کے بھولے بھالے مسلمان بڑے خوش ہوئے اور انہیں امریکیوں کے چاند پر جانے کے بارے میں ذرہ بھر شک وشبہ نہ رہا۔ البتہ میرے ایک چچا آج تک اس واقعے کو نہیں مانتے ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی چاند پر گیا تو مسلمان جائے گا۔ نیل آرمسٹرانگ کے بیانات سے لگتا تھا کہ وہ مسلمان ہونے ہی والا ہے۔ ہمارے ایک دانشور نے ایک بار دعا کی تھی کہ خدایا صدر ماؤ کو مسلمان کر یہ دعا قبول بھی ہوسکتی ہے۔ بغداد کو تباہ کرنے والے خاندان کا امیر تیمور لنگ مسلمان ہوگیا تھا۔ اس کے پس منظر میں بھی اذان کی آواز کا کوئی راز تھا۔ علامہ اقبال نے کہا تھا۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

موجودہ خلیجی جنگ میں بھی کچھ لوگوں نے اس طرف اشارے کئے ہیں مگر اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیونکہ امیر تیمور یہودی نہ تھا نہ اس کے لشکر میں کوئی یہودی تھا۔ عجیب بات ہے اسلام قبول کرنے کی ہماری تمنا میں روس یا چین کے لیڈر ہوتے ہیں۔ کبھی امریکیوں اور مغربیوں کے لیے یہ دعا نہیں ہوئی۔ امام خمینی نے بھی صدر گورباچوف کو مسلمان ہونے کی دعوت دی تھی۔ علامہ اقبال نے یونہی تو نہیں کہا تھا۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

اگر سابقہ روس والوں کا خیال تھا بھی کہ امریکہ چاند پر نہیں پہنچا تو اس نے کوئی منفی پروپیگنڈا نہیں کیا۔ وہ جب مریخ پر جھنڈے گاڑنے کا اعلان کرتا تو امریکہ تردید نہیں کرے گا۔ امریکی کچھ کام سیاسی ٹرک سے کرتے ہیں کچھ کیمرہ ٹرک سے کرتے ہیں۔ ہمارا سیاسی ٹرک یہ ہے کہ خود کچھ نہیں کرنا صرف پچھلی حکومت کو برا بھلا کہہ کے کام چلانا ہے۔ ہمارا کیمرہ ٹرک یہ ہے کہ نرم ونازک ہیروئن سے دس بارہ شیر جوانوں کی پٹائی کرانا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہمارا کمال یہ ہے کہ غیروں کے مقابلے میں اپنا مذاق اڑا کے نمبر بنانے ہیں۔ مجھے تو اس صورتحال میں بھی امریکی سی آئی اے کا ہاتھ لگتا ہے۔ یہ بھ کمال ہے کہ جو دوسروں کو امریکہ ایجنٹ کہہ رہا ہوتا ہے وہ خود بھی امریکی ایجنٹ ہوتا ہے۔ ایک لطیفہ سن لیں۔

ایک امریکی ایک روسی ایک چینی ایک سردار صاحب باتیں کر رہے تھے۔ امریکی نے کہا ہم چاند پر پہنچ گئے ہیں۔ روسی بولا ہم مریخ پر پہنچنے ہی والے ہیں۔ چینی نے کہا ہم زہرہ پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ سردار صاحب نے کہا آپاں سورج تے جاواں گے۔ انہیں بتایا گیا کہ سورج پر تو گرمی بہت ہے وہاں جانا ممکن ہی نہیں تو سردار صاحب نے منہ پھلا کر جواب دیا' آپاں رات نوں

KitaabPoint.blogspot.com

سورج تے جاواں گے۔

اس بات کی روشنی میں میری دلیل یہ ہے کہ امریکی دن کے وقت چاند پر کیسے چلے گئے چاند تو رات کو ہوتا ہے۔ میری دوسری دلیل یہ ہے کہ امریکی جہاں گئے ہیں۔ وہاں قتل وغارت لوٹ مار ہوتی ہے ویتنام اور بغداد اس کی سامنے کی مثالیں ہیں۔ امریکی چاند پر گئے ہوتے تو وہاں سے چیخوں آہوں فریادوں کی آوازیں ضرور سنائی دیتیں۔ چاندنی کی بجائے خون کی پھوار فضاؤں میں پھیلی ہوتی وہاں بھی لوگوں کے بنیادی حقوق برباد کر کے انہیں بنیادی حقوق جمہوریت اور آزادی نسواں جیسی الجھنوں میں پھنسا دیا جاتا۔ چنانچہ کوئی اور اس بات کو مانے نہ مانے میں نے مان لیا ہے کہ امریکی چاند پر نہیں پہنچے چاند تو حسن کی علامت ہے۔ یہ بچوں کا کھلونا ہے جاگنے والوں کا رازدار ہے۔ چاند سب کا ہے۔ انسان وہاں پر قابض ہو گیا تو اس کے بھی حصے بخرے ہو جائیں گے۔ چچا سام چاند پر چلا بھی گیا ہے تو بچوں کو یہ گیت گانے سے نہیں روک سکتا۔

چندا ماموں دور کے

یقین کیجئے کہ یہ گیت سن کے مجھے جو خوشی ہوتی ہے وہ چاند پر پہنچنے سے بھی کیا ہو گی۔

چاند میری زمیں پھول میرا وطن

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

''وزیراعلیٰ پاکستان'' کے لیے پروٹوکول

ایک دفعہ گورنر ہاؤس میں ایک عشائیے میں وزیراعلیٰ پنجاب نواز شریف کو مرکزی وزراء کے برابر نہ بٹھانے پر ایک نیا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ جھگڑا تو خاصا پرانا ہے بس اسے نیا رنگ دے دیا جاتا ہے۔ رنگوں میں بھی اب سرخ اور سبز کی بات اتنی سنجیدہ نہیں رہی۔ سارے رنگ اللہ کے ہیں۔ جھگڑے کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے۔ صوبائی دارالحکومت میں سیاسی پروٹوکول کے بہانے دونوں طرف سے الزام تراشی اور بیان بازی کا مقابلہ شروع ہوگیا ہے۔ یہ مقابلہ تو بسنت کے موقعہ پر پتنگ بازی کے دوران بھی دیکھا گیا جس کے نتیجے میں کچھ غیر سیاسی لوگ زخمی ہوگئے۔

سیاستدانوں کے گلے شکوے اب انہیں شاعروں کے قریب لے آئے ہیں۔ امید ہے کہ اب بیانات اور ہجویات میں فرق مٹ جائے گا۔ فرق تو پہلے بھی اتنا نہیں۔ اب عروض کی پابندی بھی شروع ہوجائے گی اور مختلف مشیران اور ''وزیران'' ایک دوسرے کے کلام میں وزن کی غلطیاں نکالنا شروع کردیں گے۔ اس طرح انہیں متعدد شاعروں کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی۔ پیشہ ور شاعروں کے لیے یہ سنہری موقعہ ہے۔ اب انہیں دن رات ٹیلیویژن کے لیے گیت لکھنے سے نجات مل جائے گی یہ خدمت وہ انتخابی مہم میں بھی انجام دے چکے ہیں۔ ایک شاعر نے تو دونوں طرف کے امیدواران کو گیت لکھ کر دے دیئے۔

سجاد باقر رضوی برسوں سے صرف اس لیے مدیر ''فنون'' سے ناراض رہے کہ انہیں سیف زلفی کے بعد شائع کردیا گیا تھا۔ دونوں کی غزلیں آمنے سامنے شائع ہوئی تھیں۔ اصل اعتراض سیف زلفی کے ساتھ شائع کرنے پر تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ نواز شریف کی نشست کس مرکزی وزیر کے ساتھ تھی۔

ادبی رسائل کے ایڈیٹروں سے عمومی اور خصوصی خفگی اسی بنا پر ہوتی ہے۔ ایڈیٹر صاحب اپنی پسند کے لوگوں کو پہلے اور ناپسندیدہ لوگوں کو بعد میں شائع کردیتے ہیں۔ یہ کام مشاعرے کا میزبان بھی کرتا ہے۔ ترتیب یہاں الٹ جاتی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کو بعد میں اور دوسروں کو پہلے پڑھواتے ہیں۔ منیر نیازی اس معاملے میں بہت دانا ہیں۔ انہیں اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں انہیں قتیل شفائی سے پہلے نہ پڑھوا دیا جائے۔ وہ مشاعرے کے منتظمین کے ساتھ پہلے ہی ''اصولی'' معاملات طے کرلیتے ہیں۔ اس کے باوجود انہیں اطمینان نہیں ہوتا۔ جب مشاعرہ اپنے اختتام کو پہنچنے لگتا ہے اور چند شعرا رہ جاتے ہیں تو وہ جب قتیل شفائی پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اس

KitaabPoint.blogspot.com

طرح وہ بعد میں اپنا کلام سناتے ہیں اور فضا منیر صاحب کے لیے مزید سازگار ہو جاتی ہے۔ کچھ سینئر شاعروں کی خواہش بلکہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ صاحب صدر کے بھی بعد پڑھیں۔ کچھ ''فسادی'' لوگ یہ بھی کر گزرتے ہیں کہ قتیل شفائی کو صدارت دے کر منیر نیازی کو مہمان خصوصی بنا دیتے ہیں اور پھر تماشہ دیکھتے ہیں۔ کبھی نہیں ہوا کہ قتیل شفائی اور منیر نیازی نے مل کر ان تماشائیوں کے خلاف کچھ لکھا ہو۔ وہ ایک دوسرے سے فارغ ہی نہیں ہوتے یہی کام بے نظیر بھٹو اور نواز شریف اور ان کے حواری کیے جا رہے ہیں۔

مشاعرے میں زیادہ گڑبڑ کرنا ہو تو سٹیج سے بار بار یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم نے بڑی کوشش کی ہے کہ ہر شاعر کو اس کے مقام پر بلایا جائے مگر اس کے باوجود حفظ مراتب میں کوئی کسر رہ گئی ہو تو ہم معذرت خواہ ہیں اور شہزاد احمد کو خالد احمد سے پہلے بلا لیا جاتا ہے۔ ایک سٹیج سیکرٹری نے ایک شاعر سے بدلہ لینے کے لیے اس طرح اعلان کیا۔

میں سب سے پہلے ''آغاز اختتاموی'' کو زحمت کلام دیتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں انہیں اس سے پہلے نہیں بلا سکتا۔ ہماری ادبی تاریخ میں معاصرانہ چشمک اور جھگڑوں کا ایک سبب یہ بھی ہے جو کسی لحاظ سے بھی لائق تحسین نہیں۔ بات صرف انا کی ہے ورنہ کلام اچھا ہو تو لوگوں سے داد حاصل کر ہی لے گا۔ کام اچھا ہو تو سیاستدان کوئی بھی ہو وہ لوگوں کی محبت حاصل کر ہی لے گا مگر یہ سادہ سی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس سلسلے میں ہمارے علماء کرام کا حال بھی شاعروں سے مختلف نہیں۔ ہمارے سیاستدان تو اب پورے کے پورے شاعر بنتے جا رہے ہیں۔

حفظ مراتب اب سیاستدانوں کے لیے بھی ایک مسئلہ بن گیا ہے اور ہمارے ہاں مسئلہ جب تک المیہ نہ بن جائے ہمیں قرار ہی نہیں آتا۔ ابھی سیاستدان اس میدان میں شاعروں جتنے گرم نہیں ہوئے۔ البتہ آثار ضرور پیدا ہوئے ہیں۔ اسمبلی کے اجلاس میں گرما گرمی پیدا کرنے کے لیے اشعار کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ اب قومی اسمبلی میں نوابزادہ نصر اللہ خان اور کوثر نیازی اور غضنفر علی گل ہونے چاہئیں۔

سیاسی لیڈروں سے میری گزارش ہے کہ مشاعرے کا میزبان کتنا ہی بڑا شاعر کیوں نہ ہو وہ سب سے پہلے اپنا کلام سناتا ہے۔ پیپلز پارٹی والے مذکورہ عشائیے میں میزبان تھے۔ دوسری گزارش ایک ضرب المثل کے حوالے سے پیش کرتا ہوں کہ

صدر ہر جا کہ نشیند صدر است

نواز شریف کہیں بھی ہوں وہ وزیر اعلیٰ تو رہیں گے۔ وہ وزیر اعظم بن گئے تو بھی پاکستان کا وزیر اعلیٰ کہلانا پسند کریں گے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

لبرل پیغمبر لبرل لیڈر

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ اس سال پیغمبر اعظم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم پیدائش اور قائداعظم کا یوم وفات ایک ہی دن واقع ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے بھی جب پاکستان وجود میں آیا تو وہ 27 رمضان لیلۃ القدر تھی جس دن قرآن قلب محمد پر اترا تھا۔ اسے بھی اتفاق کہنا چاہیے بلکہ حسن اتفاق کہنا چاہیے۔ ورنہ ہماری زندگیوں میں سوئے اتفاق کے واقعے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

پاکستان کے مسلمان دو شخصیتوں سے غیر مشروط محبت رکھتے ہیں اور یہ حیرت انگیز خوش قسمتی ہے کہ آج اس جہان میں ظاہر ہونے والی یہ خوشی ہم اکٹھی منا رہے ہیں۔ میں کوئی خدانخواستہ موازنے یا مقابلے کی بات نہیں کر رہا۔ قائداعظم بیسویں صدی کا ایک اعلیٰ ترین مسلمان تھا اور اس لحاظ سے وہ غلامان محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل تھا۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اسلام کی مکمل روح کو سمجھنے والا کوئی نہیں۔ کون ہے جو زمانے کے جدید اور قدیم کے امتزاج سے اپنی زندگی کا مزاج بنائے اور پھر اپنے لوگوں کے دلوں میں یہ جذبہ اتارنے کی کامیاب کوشش کرے اگر ہم مسلمان نہ ہوتے۔ تو نہ جانے کیا ہوتے اور اگر قائداعظم نہ ہوتا تو نہ جانے ہمارا کیا ہوتا۔ قائداعظم نے ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا تھا اور ان کے ذہن میں صرف ایک ہی Ideal تھا اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات صفات تھی۔ غالباً ایک روسی مصنف نے لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے زندگی میں جو کام کیا اس میں کامیابی حاصل کی۔ اب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے پے در پے ناکامیوں اور ذلت کا شکار ہوتے ہیں تو آدمی سوچتے سوچتے پاگل ہو جاتا ہے۔

اب ایک سوال جو میرے ذہن میں بار بار اٹھتا ہے کہ کیا ہم واقعی مسلمان ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ اس بات کی تائید یا تردید نہیں کر سکتے۔ ہمارے وہ علماء کرام جو اپنی جیبوں میں کفر کے فتوے ڈالے پھرتے ہیں۔ انہیں یہ حق کس نے دیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ لبرل شفیق اور معاف کرنے والا اور کون تھا۔ جو لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت العالمین مانتے ہیں اور پھر اپنے ہی لوگوں پر غضب ڈھاتے ہیں وہی اور تو جو کچھ ہیں خود ہی سوچیں کہ وہ واقعی مسلمان ہیں۔ ہمارے پاس قائداعظم کے علاوہ کوئی اور شخصیت نہیں ہے۔ جس کا ذکر فخر کے ساتھ کر سکیں۔ قائداعظم نے زندگی میں جو ارادہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ وہ شخص نہ بک سکا اور نہ جھک سکا۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے جو خطہ زمین حاصل کیا اسے میں نے قریہ عشق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہا۔ میرے خیال میں مسلمان نہ عشق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر سرخ رو ہو سکتے ہیں نہ سربلند۔ میرے خیال میں تو دین اسلام یہ ہے کہ رسول کریم صلی

KitaabPoint.blogspot.com

اللہ علیہ وسلم سے عشق کریں۔ یہی تو وہ جذبہ تھا جس نے قرون اولی کے مسلمانوں کو دنیا کی سب سے بڑی قوم بنا دیا تھا۔ ان لوگوں کے پاس اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے تھے اور ان کے حکم کے مطابق عمل کرنے کو زندگی سمجھتے تھے۔

مجھے ایک واقعہ یاد آیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے۔ وہاں پر موجود اصحاب سے باتیں کر رہے تھے کہ ان میں سے ایک شخص اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے فرماتے ہیں۔ بیٹھ جاؤ۔ یہ بات صرف اس کے لیے تھی جو مسجد میں کھڑا تھا مگر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز جہاں پہنچی جس نے سنی وہ بھی بیٹھ گیا۔ ایک شخص باہر سے لکڑیوں کا گٹھا لیے گھر آ رہا تھا جب اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنی تو اس کا ایک پاؤں کانٹوں کی باڑ کے ایک طرف تھا اور دوسرا دوسری طرف۔ اس نے یہ بھی گوارہ نہیں کیا کہ کانٹوں کی باڑ پار کر لیتا وہ لکڑیوں کے گٹھے سمیت وہیں بیٹھ گیا۔ جو لوگ اپنے محبوب لیڈر کی آواز پر اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ انہیں دنیا کی کوئی طاقت گرا نہیں سکتی۔ ہم عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوی تو بہت کرتے ہیں مگر زندگیاں اپنی مرضی سے گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ کوئی کام ہم اپنی مرضی سے بھی کرتے ہیں۔ ہم ذلت اور غلامی کے اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ جس کا جی چاہتا ہے اس زمین پر مسلمانوں کے لیے قیامت برپا کر دیتا ہے۔ جب مسلمان بچے ذبح ہوتے ہیں۔ جب مسلمان عورتوں کی عصمتوں سے کھیلا جاتا ہے اور پھر یہ خبریں ہم سب سنتے ہیں تو سر جھکا کر درود شریف پڑھنے لگتے ہیں۔ یا بابا آواز بلند نعرہ رسالت لگاتے ہیں۔ تو کیا ہم عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ادا کر رہے ہوتے ہیں ہم جیسے مسلمانوں کے لیے نعرہ رسالت لگانا منع ہونا چاہیے اور ہمارے لیے درود شریف پڑھنے پر پابندی لگا دینا چاہیے۔ اگر آپ مجھے معاف کریں تو کہوں کہ اس زمانے میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوی کفر ہے کیونکہ یہ آخری درجہ کی منافقت ہے اور منافق کافر سے بدتر ہے۔ منافقین نے مدینہ النبی بھی جو کچھ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کیا وہ وہ اس سے مختلف تھا جو آج کیا جا رہا ہے۔ ہم جب اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو پھر اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کو بٹہ نہیں لگانا مگر آج وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہیے۔ پھر وہ بھی ہو رہا ہے جو نہیں ہونے والا۔

جب طائف کے میدانوں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مخالفوں کے پتھروں سے لہولہان ہو گئے اور فرشتوں نے حاضری کے بعد ان لوگوں کو تباہ کرنے کی اجازت طلب کی تو ہم جو آج رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں' ہم جھوٹ بولتے ہیں۔ ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں جانتے۔ ہم طائف کے لوگوں سے بھی برے ہیں اگر ہم ایسے میں مسلمانوں کی جو ذلت ہو رہی ہے اس سے بڑا عذاب اور کیا ہوگا۔ بوسنیا' فلسطین اور کشمیر میں کیا ہو رہا ہے۔ چلیے یہ تو غیر مسلم ہیں جو مظالم توڑ رہے ہیں۔ ہم خود اپنے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ ہم خود اپنے سب سے بڑے دشمن ہیں اور اس دشمنی میں حد سے گزر گئے ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

وہ قیامتیں جو گزر گئیں
تھیں امانتیں کئی سال کی

ہم اس زمانے کی ٹیکنالوجی، صنعتی ترقی، عسکری برتری اور معاشی خوشحالی کے حوالوں سے بڑی قوموں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم نے تو ابھی ایٹم بم بھی نہیں بنایا۔ مگر میں خدا کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ ہمارے پاس ایٹم بم ہے۔ ایک نہیں کروڑوں ایٹم بم ہیں۔ ہر مسلمان کے سینے میں ہر مسلمان کے دل میں عشق رسول کا چراغ جو ٹمٹما رہا ہے وہ ایٹم بم ہی تو ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمیں یہ ایٹم بم چلانا نہیں آیا۔ اگر ہم اس طاقت کو استعمال کرنے کے اہل ہوتے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمارے سامنے ٹھہر نہ سکتی۔

برسوں کے بعد ہمارے درمیان ایک شخص پیدا ہوا جس نے یہ ایٹم بم استعمال کیا اور اپنے مقابلے میں دو طاقتوں کو شکست فاش دی۔ مسلمان مخالفوں اور ہندوؤں کو زیر کیا اور ان کی کوئی چال نہ چلنے دی۔ پاکستان کا قیام جو ایک واہمہ تھا، اسے ایک معجزہ بنا دیا۔ پھر ہم نے کیا کیا۔ ہم نے اس کے بنائے ہوئے پاکستان کو توڑ دیا۔ ہم قائداعظم کی روح کے سامنے اور رسول اعظم کی روح پر فتوح کے سامنے شرمسار ہیں۔ ہمارے پاس شرمساریوں کے سوا کچھ بھی تو نہیں جو ان کے قدموں میں نچھاور کریں۔ میں حیران ہوں کہ مسلمان روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا منہ لے کر جاتے ہیں اور قائداعظم کے مزار پر کس طرح چلے جاتے ہیں۔ سانحہ تو یہ ہے کہ ہمیں اب شرم بھی نہیں آتی۔ ہم بڑی ڈھٹائی سے یوم قائداعظم مناتے ہیں اور خود ساختہ عقیدت سے عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم مناتے ہیں۔ اس سال ہم یہ دونوں کام ایک ساتھ کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہماری زندگیوں میں حسن اتفاق کم کم ہوتے ہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آج کے دن ہم اپنے آپ سے کوئی ایسا وعدہ کریں کہ ہماری زندگیاں پھر سے حسن اتفاق سے بھر جائیں۔

اتفاق سے 6 اور 11 ستمبر میں چار دنوں کا فرق ہے۔ 6 ستمبر کی یاد، 11 ستمبر کی یاد سے مربوط ہے۔ اب جب اس دن عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہے تو نسبتیں گہری ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ہم نے 6 ستمبر کو قائداعظم سے اپنی نسبت کا حق ادا کیا اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے لہو میں ثابت کر دیکھایا۔ پھر جہاں جہاں ہمارا لہو گرا وہ زمین سرخ رہ ہوتی چلی گئی۔ ہم نے دیکھا کہ زندگی ایک سچی زندگی کس طرح بنتی ہے۔ مجھے ایک مثال کا خیال آتا ہے کہ ایک بھیڑ بکری زیادہ سے زیادہ دو بچے جنم دیتی ہے جب کہ کتیا زیادہ بچے جنم دیتی ہے۔ اس کے باوجود بھیڑ بکریوں کی تعداد اور کتے کتیوں کی تعداد کا اندازہ مشکل نہیں کہ کون سی نسل بڑھتی اور پھیلتی پھولتی ہے اور کون سی نسل تباہ ہوتی ہے۔ ریوڑ ہمیشہ بھیڑ بکریوں کے ہوتے ہیں۔ کتے، کتیوں کے نہیں ہوتے۔ کبھی ہم نے غور کیا کہ ایسا کیوں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ بھیڑ بکریاں ذبح ہونے کے لیے اپنا سر پیش کرتی ہیں۔ پھر یہ قانون قدرت ہوا کہ بقاء اسے ملے گی جو اپنی جان کا نذرانہ پیش کرے گا۔ جس قوم کے افراد مرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں اس کے زندہ رہنے کے امکانات ہمیشہ موجود

KitaabPoint.blogspot.com

رہتے ہیں۔

جب تک مسلمان میدان جنگ میں جانے کے لیے خوشی محسوس کرتے رہے ان کی عزت' ان کا نام زندہ رہا۔ مسلمان جب میدان جنگ میں نکلتے تھے تو دشمنوں سے یہ بات کرتے تھے کہ مسلمان ہو جاؤ۔ تم ہمارے بھائی ہو۔ ہم برابر ہیں۔ جزیہ دو کہ ہم تمہاری حفاظت کی ذمہ داری پوری کریں اور اگر تم ایسا نہیں کرتے تو پھر تلوار ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ مگر یاد رکھو کہ تم جتنا زندگی سے پیار کرتے ہو اتنا ہم موت سے پیار کرتے ہیں۔ آج اگر ہم دیکھیں تو ہم موت سے پیار نہیں کرتے' موت سے ڈرتے ہیں۔ زندگی سے اندھا پیار کرنے والے کبھی بہادر نہیں ہو سکتے۔ جو بہادر نہیں' غیرت مند نہیں۔ جو غیرت مند نہیں مسلمان نہیں۔ یہ کوئی کفر کا فتویٰ نہیں مگر ہم اپنے گریبانوں میں جھانکیں کہ صرف 5 سال بعد 16 دسمبر کو کیا ہوا۔ ہم نے مشرقی پاکستان گنوا دیا۔ اس ذلت کو ہم کس کھاتے میں رکھیں۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم 6 ستمبر کے دن 16 دسمبر کو نہ بھولیں۔ ہم اپنی عزت مندی کو مصنوعی اور جعلی بنا ڈالتے ہیں اور اپنی ذلت کو بھول جاتے ہیں۔

اگر یہ ہو سکتا ہے کہ یوم وفات قائداعظم اور عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی دن واقع ہو جائے۔ تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سقوط ڈھاکہ اور سقوط بغداد بھی ایک ہی دن واقع ہو جائے۔ 6 ستمبر کے لیے تاریخ میں کوئی اور مثال مجھے یاد نہیں آ رہی۔ اصولاً دیکھا جائے تو 65ء کی جنگ ہم نے ہاری نہیں تھی' جیتی بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود ہم 6 ستمبر کو یاد کرتے ہیں اور فخر کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ کہانی ہماری قربانی سے ترتیب پاتی ہے۔ ہار اور جیت کے درمیان کھڑے ہو کر ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔ اس وقت جو ہماری حالت ہے' محسوس ہوتا ہے کہ اب ہمیں کچھ نہیں کرنا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر کیلنڈر میں سے 11 ستمبر کا دن نکال پھینکیں۔ ہمیں اعلان کرنا ہوگا کہ ہمارا تعلق قائداعظم سے نہیں' ہماری کوئی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہے۔ کیونکہ اس وقت جو کچھ ہم ہیں ان نسبتوں کے اظہار سے ہم صرف اپنا مذاق اڑاتے ہیں۔ دنیا والے ہم پر ہنستے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم بھی ہنستے ہیں۔ کیا ہم آنسو بہانا بھول گئے ہیں۔ اپنا خون بہانا تو کب کے بھول چکے ہیں۔ جب تک زمینیں اشک آلود نہ ہوں' پھر خون آلود نہ ہوں تو وہاں بسنے والوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ کاش ہم کبھی ثابت کر سکیں کہ ہمیں یہ حق حاصل ہے لیکن اس سے پہلے مر مٹنے کی آرزو اپنے اندر روشن کرنی پڑے گی۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

تحریک پاکستان یا تعزیتی تحریک

ہمارے خیال میں ابھی تحریک پاکستان ختم نہیں ہوئی۔ تحریکیں کبھی رکتی نہیں۔ یہ ایک تسلسل ہے جو زندگی کے سینے اور تاریخ کی آنکھوں میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ کسی تحریک کی کامیابی کے بعد بھی اس کی روح کو زندہ رکھنا اور اس کے ثمرات کو تمام مستحق لوگوں تک پہنچانا بھی ایک تحریکی عمل ہے۔

تحریک پاکستان کامیابی سے ہم کنار ہوئی مگر آپ دیکھیں کہ آج کوئی بھی پاکستانی نہیں سمجھتا کہ اب پاکستان میں اس کی زندگی کا منظر وہی ہے جو تحریک پاکستان کا عکس ہونا چاہیے تھا۔ بلکہ ساری صورت حال ان ارادوں اور آرزوؤں کے برعکس نظر آ رہی ہے جو تحریک پاکستان میں برصغیر کے مسلمانوں' سیاستدانوں اور بالخصوص قائداعظم کے لہو میں موجزن تھی۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں یہ کہوں کہ جس تحریک پاکستان کا تذکرہ ہماری تاریخ میں ملتا ہے' لگتا ہے کہ پاکستان اس جدوجہد کی تخلیق نہیں بلکہ خدانخواستہ کچھ اور ہے۔ جنہوں نے پاکستان بنتے ہوئے دیکھا انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے پاکستان ٹوٹتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔ اب کہا جا رہا ہے کہ سندھ کے حالات مشرقی پاکستان کے حالات سے مختلف نہیں ہیں۔ یہ کتنا خوفناک اشارہ ہے۔ مگر ہم فطرت اور قدرت کے اشاروں کو نہیں سمجھتے ہم صرف اس وقت اپنی روح کو ایک ڈری ہوئی انگڑائی کے سپرد کرتے ہیں جب ہم پر عذاب آتا ہے۔ اس تمام بدقسمتی کے ذمہ دار ہم سب ہیں۔ مگر ہماری سیاستدان اور ہماری افسران ہی اصل میں اس شرم ساری کے ذمہ دار ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ وہ شرمسار بھی نہیں ہیں۔ انہوں نے صرف اپنے آپ کو صاحب اقتدار رکھنے اور مالدار بنانے کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ ایسے لگتا ہے کہ پاکستان صرف چند لوگوں کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ ان چند لوگوں کو سب لوگ جانتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کا بال بیکا نہیں کیا جا سکتا۔

حکمرانوں نے اپنی باریاں مقرر کی ہوئی ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا کرسی پر چڑھ بیٹھتا ہے۔ لوگوں کو آیت الکرسی پر مقرر کیا ہوا ہے۔ ہم لوگ اتنے بھولے ہیں کہ جب کوئی نیا آدمی آتا ہے تو خوش آمدید کہتے ہیں۔ پھر وہ وہی کچھ کرتا ہے جو اس سے پہلے نے کیا ہے۔ دنیاداری کو سمجھنے والے لوگ ہر آنے والے کی خوشامد کرتے ہیں اور عیش کرتے ہیں۔

یہ سلسلہ کب ختم ہوگا۔ اب تو بڑے بڑے دل والے بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ مگر یہ کھیل ختم

KitaabPoint.blogspot.com

نہیں ہوگا جو انسانوں کی آنکھوں کے سامنے کھیلا جاتا ہے۔ جہاں تک ان بیچارے مصیبتوں کے مارے اور ہارے ہوئے عام مسلمانوں کا تعلق ہے وہ تحریک پاکستان کی یاد اپنے دل میں محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے پچھلے تمام برسوں پر نظر دوڑائی جائے تو مختلف لمحوں میں تحریک ختم نبوت' تحریک جمہوریت اور تحریک نظام مصطفیٰ دراصل تحریک پاکستان ہی کا تو تسلسل ہے۔ میرے خیال میں مایوس اور محروم لوگوں نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اور جنرل محمد ضیاء الحق کو سیاسی میدان میں خیر مقدم کہا تو ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ شاید یہ دونوں آدمی سیاسی' سماجی' معاشی' معاشرتی' نظریات اور جزباتی سطح پر وہ کچھ کر دکھائیں جو قائداعظم اپنے تڑپتے ہوئے دل میں لے کر مر گئے۔ لوگ تو یہ سننے کے لیے بھی زندہ رہے بلکہ شرمندہ رہے کہ قائداعظم مرا نہیں مارا گیا تھا۔ پھر اس کے بعد جو کچھ ان کے ساتھ ہوا انہوں نے اس بات پر یقین کر لیا جو کسی نہ کسی الزام کی ذیل میں آتی تھی پھر یہ بات انتقام کی زد میں سماتی گئی اور یہ انتقام صرف عام لوگوں سے لیا گیا۔ سوائے ایک آدھ مثال کے کبھی سیاستدان اور حکمرانوں اور افسرانوں نے ایک دوسرے سے انتقام نہیں لیا۔ وہ تو صرف اس فارمولے پر عمل کرتے رہے۔

وچوں وچوں کھائی جا اتوں رولا پائی جا
کھائی جا بھئی کھائی جا کھائی جا بھئی کھائی جا

ہمارے جو مستقل حکمران ہیں جنہیں بیوروکریسی کہا جاتا ہے تو اس کے لیے میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ لفظ بیوروکریسی نہیں۔ ''برا کریسی ہے۔'' انہوں نے آج تک لوگوں کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دفعہ باہر کے کسی ملک میں ہمارے سفارتخانے والے بھی ایک بڑی تقریب میں شامل تھے۔ سفارتکار بھی اصل میں بیوروکریٹ ہوتے ہیں۔ یعنی افسر ہوتے ہیں۔ یوں تو بیوروکریٹ' ڈیموکریٹ' ارسٹوکریٹ سب ایک ہیں۔ ان کریٹوں میں ایک ہی مال بھرا ہوا ہے۔ تو اس بڑی تقریب میں ہر ملک کے سفارتکاروں نے اپنے اپنے ملک کا قومی ترانہ سنایا۔ جبکہ ہمارے سفارت کاروں یعنی افسروں کو قومی ترانہ نہیں آتا تھا۔ انہیں اپنا قومی ترانہ اب بھی نہیں آتا بلکہ جس بھی چیز کے ساتھ قومی کا لفظ لگتا ہے اس کے ساتھ ان کی چڑ ہو جاتی ہے۔ مثلاً قومی زبان' قومی شناخت' قومی اتحاد اور قومی غیرت کو بھی پسند نہیں کرتے۔ پاکستانی سفارتکار مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے ایک نئے CSP افسر کا ابھی انگریزی بول بول کر دل سیاہ اور منہ ٹیڑھا نہیں ہوا تھا کہنے لگا مجھے قومی ترانہ تو نہیں آتا۔ البتہ پنجابی کا ایک فلمی گیت تھوڑا تھوڑا آتا ہے۔ کھڑے کھڑے فوری طور پر میٹنگ کی گئی اور فیصلہ کر لیا گیا۔ ہمارے سامنے فیصلے اسی طرح ہوتے ہیں۔ فیصلہ ہوا کہ یہی گیت سنا دیا جائے۔ یہاں کسی کو پنجابی آتی ہوگی کسی کو ہمارے قومی ترانے کے ساتھ کیا واسطہ۔ چنانچہ یہ فلمی گیت تمام افسروں

KitaabPoint.blogspot.com

نے کورس میں پڑھا۔

لارا	لپا	لارا	لپا	لائی	رکھنا
لارا	لپا	لارا	لپا	لائی	رکھنا

یہ گیت پڑھتے ہوئے افسر جھومتے رہے اور گھومتے رہے۔ آپ یقین کریں کہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک افسران جھوم رہے ہیں اور گھوم رہے ہیں۔ وہ یہ فلمی گیت دہرائیں یا نہ دہرائیں کریہی کچھ رہے ہیں۔

لارالپالائی رکھنا

آج تک لارالپا لگانے والوں کو سازگار حالات ہی ملے اور تمام لوگوں کی جو حالت ہے' اسے حالت بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ایسے میں کون ہے جو ان سے پوچھے کہ کیا پاکستان اسی لیے بنایا گیا تھا۔ کیا پاکستان تمہارے لیے بنایا گیا تھا۔

14 اگست یعنی یوم آزادی منانے کی تیاریاں بڑے دھوم دھام سے کئے جانے کا انتظام ہو رہا ہے مگر ہر یوم آزادی پر احساس ہوتا ہے کہ ہمارے حکمران اور افسران ابھی تک غلامانہ ذہنیت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔ مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ ان ہی چند لوگوں نے باقی سب لوگوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ کیا آزادی یہی ہے کہ زندہ رہا جائے۔ یقین کریں کہ جن لوگوں نے انگریزوں کا زمانہ دیکھا تھا وہ یہی کہتے رہے کہ تب حالات زیادہ اچھے تھے' زیادہ بہتر تھے۔ اس وقت کیا اس طرح کی کرپشن کا تصور بھی کیا جا تا تھا۔ آج جس طرح اقدار کی دھجیاں بکھری جا رہی ہیں۔ کیا یہ تب ممکن تھا۔ یہ آزادی منانے والے سوچیں کہ عام لوگ اس طرح محسوس کرنے لگیں کہ نام نہاد آزادی کے زمانے کا موازنہ بھی اس زمانے کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا جسے یہ غلامی کا زمانہ کہتے ہیں۔ یہ جو حکمران ہیں یہ انگریزوں کے پٹھو ہیں اور کچھ نہیں۔ یہ وہی جاگیردار ہیں جنہیں انگریزوں نے اپنی وفاداری کے صلہ میں جاگیریں عطا کی تھیں۔ تو یہ انگریزوں سے بدتر ہیں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

پٹھان مسلمانوں کے سکھ ہیں

پٹھان بنی نوع انسان کے لیے ایک قابل قدر سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم کسی نسلی یا قومی تفاخر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس قبیلے کو تمام پاکستانیوں اور تمام انسانوں کے لیے دوبارہ ایک زندہ اور تازہ معرکہ آرائی کا ذوق وشوق دینا چاہتے ہیں۔ انجمن پٹھانان اور نوائے پٹھان اسی آرزو کا ایک راستہ ہے۔ اس راستے پر ہم پٹھانوں کو بالخصوص اور سب لوگوں کو بالعموم دعوت عام دیتے ہیں۔

جہاد افغانستان دنیا بھر کے سامنے اس غیور اور بہادر قوم کا ایک نواں نکور کارنامہ ہے۔ جہاد کشمیر میں پٹھانوں کی خدمات اولین قدم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آزاد کشمیر کا علاقہ انہی کی قربانیوں کا ثمر ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی حکمرانی کی تاریخ پٹھانوں کے ناموں سے جگ مگا رہی ہے۔ غزنوی، غوری خلجی، لودھی اور نیازی میدان جنگ اور میدان سیاست میں کامرانیوں اور نیک ناموں کے جھنڈے گاڑ چکے ہیں۔ جہاں تک فلاح و بہبود کا تعلق ہے تو شیر شاہ سوری سے بڑا نام برصغیر کی تاریخ میں دوسرا نہیں۔ گریٹ عمران خان (نیازی) نے تاریخ میں اپنی پسندیدہ شخصیت کے طور پر شیر شاہ سوری کا نام لیا تو اس میں قبائلی تعصب کی بات نہ تھی۔ یہ ایک تاریخی سچائی ہے جو ایک تاریخی شخصیت کی زبان پر آئی۔ عمران خان نے گائیکی کے موجودہ زمانے میں عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کا نام لیا تو یہ بھی ناقابل تردید مقبولیت کی طرف اشارہ ہے۔ دلوں میں کسی کے لیے پسندیدگی کی لہر کسی انوکھی لگن کی علامت ہے۔ خود عمران کی عظمت صرف کرکٹ کی بدولت نہیں کرکٹر تو اور بھی بہت سے ہوئے۔ یہ کچھ اور شے ہے جو کسی انسان کو بڑا اور پیارا بناتی ہے۔

پاکستان میں بھی خدمت اور عظمت کے حوالے سے سرسری طور پر دیکھا جائے تو بھی پٹھانوں کی قطار سب سے لمبی نظر آئے گی۔ سپہ گری اور سیاست سے قطع نظر شعر و ادب کی دنیا میں اشفاق احمد خان اور منیر نیازی کی موجودگی ایک انوکھی تازگی کا استعارہ ہے۔ میں نے حیرت سے دیکھا کہ بزرگ شاعر احمد ندیم قاسمی کی کتاب رم جھم کا انتساب ایک بامقام پولیس افسر حمید اللہ نیازی کے نام ہے اور ندیم صاحب کا یہ قطعہ بھی ساتھ میں درج ہے۔

تو نے باتوں میں بکھیرے تھے جو نورس غنچے
میں انہیں شعر کی صورت میں سجا لایا ہوں

KitaabPoint.blogspot.com

شاعری زیست مری زیست عبارت تجھ سے
تیری دولت تھی ترے پاس اٹھا لایا ہوں

عظیم سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ یہ سب باتیں قومی خدمت کے جذبے میں سرشاری کے حوالے سے کی جارہی ہیں۔ ورنہ اب پٹھان قوم کی بے حسی بھی رلاتی ہے۔ لوگوں نے جو لطیفے سکھوں کے حوالے سے بنا رکھے ہیں۔ ایسے ہی لطیفے پٹھانوں کے حوالے سے بھی سننے میں آتے ہیں۔ پٹھان مسلمانوں کے سکھ ہیں۔ برصغیر میں ان کی دلیرانہ قربانیاں پوری دنیا کے لیے ایک مثال بن رہی ہیں۔ خالصتان کے لیے سکھوں کی کوششیں افغانستان کے لیے پٹھانوں کی کوششوں کی مرہون منت ہیں۔

میں انجمن پٹھاناں اور نوائے پٹھان کے پلیٹ فارم سے پٹھانوں کو متحد اور متحرک ہونے کی اپیل کرتا ہوں۔ اس وقت پاکستان اور عالم اسلام کو پٹھانوں کے دل میں پوشیدہ طاقتوں کی ضرورت ہے۔ بہادری' دینداری' مہمان نوازی' رواداری' دلبری اور دلیری' محبت اور مروت اور ان سارے اوصاف کے زندہ ہونے کا وقت آیا ہے جو پٹھانوں کی قومی غیرت میں ہمیشہ تڑپتے رہے ہیں۔

ایک بات جو مجھے حیران اور پریشان رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ پٹھانوں کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے مگر کیا یہ ممکن ہے کہ یہودیوں میں پٹھانوں جیسے اوصاف پیدا ہو جائیں۔ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معاہدے کئے۔ ان سے معاملات زندگی میں ایک سانجھ رکھی۔ یہ پٹھانوں کے لیے ایک چیلنج ہے کہ وہ خود ایک متحد اور متحرک قوم بن کر بنی اسرائیل کو راہ راست پر لائیں تاکہ عالم اسلام کو امن وسکون ملے اور سارے عالمین میں ایک خوبصورت زندگی کا ایک نیا آغاز ہو۔ پٹھان صرف محبت سے زیر کئے جا سکتے ہیں۔ یہودیوں کے لیے بھی یہ ہنر آزما کے دیکھا جائے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

فارغ وقت ایک خالی کمرہ

مشہور چینی فلاسفر لین یوتانگ نے کہا ہے کہ فارغ وقت خالی کمرے کی طرح ہوتا ہے۔ آپ اس میں جو چاہیں بھر دیں۔ آج کل یار لوگوں نے اسے کباڑ خانہ بنا رکھا ہے۔ یا پھر وہ اسے خالی رکھنے پر ہی تلے ہوئے ہیں۔ بات یہاں تک ہوتی تو بھی خیر تھی۔ اب تو یہ کمرہ کھنڈر بنتا جا رہا ہے۔ اور اس کے قریب جاتے بھی ڈر لگتا ہے۔ کبھی یہ کمرہ دلکش اور پر رونق بھی تھا۔ وہاں اچھے لوگ تھے۔ آشنا تصویریں تھیں۔ اب تار تار پردوں پر گرد کی کئی تہیں جم چکی ہیں۔ کوئی ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ ایک حسرت اور ہیبت ہے جو دیوانہ بنا دینے والی ہے۔ ہم نے جیسے وقت سے دور دور رہنے کی پالیسی پر پوری طرح عمل شروع کر دیا ہے۔ گویا یہ کوئی غیر ضروری چیز ہے۔ کسی ناواقف کی طرف ہمارے پاس سے گزرتا ہے۔ پہلے وقتوں میں وقت کے ساتھ لوگوں کی دوستی تھی۔ وہ کام کرتے نہ تھکتے تھے۔ محفلیں لگاتے تھے۔ جہاں بھی جاتے وقت ان کے ساتھ ساتھ ہوتا۔ رفتار بہت نرم تھی' سکون تھا اور زندگی ایک گنگناتی مسکراتی ندیا کی طرح نہال تھی۔ اب نجانے کیا ہوا۔ وقت اڑا جا رہا ہے۔ اور ہم بھاگ بھاگ کر ہانپ چلے ہیں۔ کبھی ہم میں سے کوئی وقت سے آگے ہوتا ہے جس کی سزا بقول منیر نیازی بندہ کلا رہ جاندا اے۔ اور کبھی بلکہ اکثر وقت ہم سب سے آگے نکل جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی مقدر اکلا پا ہی ہے۔ ایک بے کار مصروفیت ہے کہ فرصت ہی نہیں۔ ایک مصروف بے کاری ہے کہ وقت کاٹنا مشکل ہے۔ اب تو یہ ہمارا مخالف بن گیا ہے۔ دوڑ دوڑ کے سانس اکھڑ جاتی ہے مگر راستہ طے ہوتا ہی نہیں کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ کاریں' موٹریں' موٹر سائیکلیں' سائیکلیں' ٹانگے اور ٹانگیں۔ یون جیسے کوئی سوگز کی دوڑ ہو اور سو گز ختم نہیں ہو چکتے۔ ایک دائرہ ہے جو تنگ ہو رہا ہے اور لوگ ایک دوسرے کے پیچھے صرف دھن یہ ہے کہ اگلے آدمی سے آگے نکلنا ہے مقابلے کے لیے ہر وقت تیار۔ آخر وقت کسی طرح تو گزارنا ہے۔ غالب نے کہا تھا صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا۔ شام سے صبح کرنا آسان ہے اگر درمیان شب فراق نہ ہو۔ سوئے اور سوئے چلے گئے۔ صبح کوئی ہم سے پوچھ کر تو ہوتی نہیں۔ البتہ اب صبح کو شام تک اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جانا بہت مشکل ہے۔ اب تو ہم خود ایک دوسرے کے کندھوں پر سوار ہیں۔ سو اب اس کے لیے بھی سونے بلکہ سو جانے کا نسخہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ سونے کے لیے کوئی تیر تو چلانا نہیں پڑتا۔ جہاں جی چاہا جب چاہا بس حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے لیٹ گئے۔ کیا کریں کہ سب سو رہے ہوں تو کسے کون بیدار کرے۔ گویا وقت خالی کمرہ نہ ہو بیڈ روم ہو گیا۔ بس ڈراؤنے خواب نہ آتے تو چین ہی چین تھا۔ چین کے طریقے اور بھی ہیں۔ تاش کی بازی لگائی جاتی ہے۔ گپ شپ گپ کم اور شب زیادہ لگائی جاتی ہے۔ ہر قسم کی شرطیں لگائی جاتی ہیں اور کچھ نہیں تو

KitaabPoint.blogspot.com

اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا جاتا ہے۔ دوست یار بٹیر لڑاتے ہیں۔ مرغ' کتے اور تیتر لڑاتے ہیں ورنہ دوستوں کو آپس میں لڑاتے ہیں۔ میں اپنے گاؤں میں ایسے خدا کے بندوں کو بھی جانتا ہوں جو گلیوں چوراہوں پر بس آتے جاتے لوگوں کو حیران پریشان ہو ہو کر دیکھتے رہتے ہیں۔ زمین پر لکیریں بنا بنا کر مٹاتے رہتے ہیں۔ سبز اور سرخ بیڑا رکھتے ہیں اور تھوکتے چلے جاتے ہیں۔ زیادہ دور تک تھوک پھینکنے کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ داڑھی میں کنگھی کرتے رہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ عورتوں کے روپ میں ہماری پچاس فیصد آبادی ''دیہلی'' رہتی ہے تو پھر یہ دوسری پچاس فیصدی آخر کون سا کارنامہ سرانجام دے رہی ہے۔ جہاں تک باتوں کا تعلق ہے۔ عورتیں باتیں کرتی ہیں' مرد باتیں بناتے ہیں ورنہ عورتیں زیادہ تعمیری کام کر رہی ہیں۔ گھر سنبھالتی ہیں' بچوں کو سنبھالتی ہیں اور اپنے آپ کو سنبھالتی ہیں۔ مردوں سے تو یہ بھی نہیں ہوتا۔ اگر آپ خدا لگتی پوچھیں تو عورتیں اتنا کام کرتی ہیں۔ ایسا ایسا کام کرتی ہیں کہ کوئی آسانی سے ماننے کے لیے بھی تیار نہ ہو۔ دیہاتوں میں تو سب کچھ وہ خود کرتی ہیں۔ چارہ کاٹنے' چارہ ڈالنے' دودھ دوہنے اور پھر دودھ پلانے تک' سودا سلف لانے' کھانا پکانے اور سب کو کھلانے تک۔ مرد صرف مدرسوں میں اور دفتروں میں چائے پیتے ہیں اور بیٹھے بیٹھے ہی تھکتے رہتے ہیں۔ بے چارے اور بھی کچھ کرتے ہیں بھلا کیا۔ وہ جو شروع میں فارغ وقت کے حوالے سے خالی کمرے کی بات ہوئی تھی تو جناب وہاں عورتیں ہی عورتیں ہیں۔ وہ ہیں تو یہ کمرہ روشن ہے۔ خوبصورت ہے جیسے کمرے میں پورا گھر آباد ہو جاتا ہے۔

کیا دن ہیں کمال اس کو ستاتی ہے شب و روز
خوشبو کی طرح گھر میں بکھر جانے کی خواہش

اور اپنے آپ کو سنبھالتی ہیں۔ مردوں سے تو یہ بھی نہیں ہو پاتا۔ اگر آپ خدا لگتی پر چلیں تو عوتیں اتنا کام کرتی ہیں اور ایسا کام کرتی ہیں کہ شاید آپ آسانی سے اسے ماننے کو بھی تیار نہ ہوں۔ مثلاً کام' گھریلو کاموں کے علاوہ چارہ کاٹتی ہیں۔ پھر مویشیوں کو ڈالتی بھی ہیں اور دوسروں پر پاتی ہیں پھرتے لاتی ہیں۔ دودھ دوہتی ہیں۔ سودا سلف لاتی ہیں۔ پکاتی ہیں۔ سب گھر والوں کو کھلاتی ہیں۔ مرد کیا کرتے ہیں؟ مدرسوں میں Relax ہوتے ہیں۔ دفتروں مین چائے پیتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ وہ صبح میں نے شروع میں فارغ وقت کے حوالے سے خالی کمرے کی بات کی تھی تو جہاں دیکھیں عورتیں ہی عورتیں نظر آتی ہیں۔ یہ کمرہ اس قابل ہے کہ وہاں ٹھہرا جائے۔ اپنے بڑے لوگوں کی بات الگ ہے۔ وہاں یہ کمرہ دفتر ہے۔ یا ڈرائنگ روم وہاں جو کچھ ہوتا ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

جو بن کھلے مرجھا گئے

اقوام متحدہ کے ادارہ اطفال کی طرف سے دنیا میں بچوں کے لیے ایک مایوس کن صورت حال کی رپورٹ میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ دل ہلا دینے والی ہیں۔ بچے جو من کے سچے ہوتے ہیں وہ ایک جھوٹی دنیا میں سوائے ایک نہ سمجھ میں آنے والی بربادی کے اور کچھ نہیں کر پاتے۔ کہا گیا ہے کہ غریب ملکوں میں روزانہ 35 ہزار بچے مرجاتے ہیں۔ یہ بات زندگی کے قتل کے مترادف ہے۔ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ یہ بشارت لے کر آتا ہے' ابھی خدا بنی نوع انسان سے مایوس نہیں' مگر انسانوں کے پاس بچوں کے لیے مایوسی کے سوا کچھ نہیں' اس مایوس کن صورت حال کو بدلنے کے لیے اقوام متحدہ کا ادارہ اطفال ''یونیسف'' اپنے طور پر کچھ کوشش کر رہا ہے مگر یہ کوششیں ناکافی ہیں۔ بچوں کی سالانہ پیدائش کی شرح اپنی انتہاء کو پہنچتی جارہی ہے۔ ایک بڑی تعداد تو پیدا ہوتے ہی مرجاتی ہے۔ کسی شاعر نے یہ بات شاید اس موقع ے لیے کہی تھی۔

حسرت ان غنچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ہمارے پاس حسرتوں کی تعداد بھی نیم مردہ بچوں کی تعداد کی طرح بڑھتی ہی جارہی ہے اور ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔

جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سو جا

اور افسوس تو یہ ہے کہ ہماری نیند بھی اڑ گئی ہے' جس گھر میں بچوں کے رونے کی آواز تڑپتی ہو وہاں بھلا کون سو سکے گا' ہمارے پاس بچوں کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں' اب تو ماؤں کی چھاتیاں بھی دودھ سے خالی ہوگئی ہیں۔ مائیں کچھ کھائیں گی نہیں تو دودھ کس طرح بنے گا' غریب قوموں کے لوگوں کے پاس مقدر نام کی کوئی چیز نہیں' کس مستقبل کی بات کی جائے کہ ہماری دنیا میں بچوں کے لیے بھی کوئی مستقبل نہیں' افریقہ کے جنگلوں میں جو ہڈیوں کے پنجر دکھائی دیتے ہیں کیا انہیں بچہ کہا جاسکتا ہے؟ کیا کوئی یہ تصور کرسکتا ہے کہ جب یہ بچہ خوبصورت دنیا کو دیکھتا ہوگا تو کس نظر سے دیکھتا ہوگا۔

سنی گال کے نوبل انعام یافتہ شاعر سینگور نے کہا کہ بچپن اور بہشت کی سرحدین ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ ادارہ اطفال نے بچوں کی بے بسی اور کسمپرسی کے جو اعداد و شمار پیش کئے ہیں ان سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بچپن اور جہنم کی سرحدیں ایک دوسرے کے ساتھ مل گئی ہیں۔ بچے کی معصومیت' بھولپن اور فطری مسرت کو دیکھتے ہوئے کہا گیا کہ بچے زمین پر جنت کے باشندے ہیں مگر یہ جنتی باشندے بیماریوں سے نڈھال ہوکر ایڑیاں بھی نہیں رگڑ سکتے' کیا اس زمین پر ان بے حس و حرکت کیڑوں کا کوئی حصہ نہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

ادارہ اطفال ہر سال 25 ارب ڈالر خرچ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس رقم کی فراہمی سے شاید کچھ برسوں تک بچوں کی بنیادی ضروریات پوری کی جاسکیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ہانگ کانگ کے لیے جو نیا ہوائی اڈا تعمیر کیا جارہا ہے اس کے لیے بھی 25 ارب ڈالر کی ضرورت ہے۔ امریکی صرف تین مہینے میں سگریٹ اور شراب پر جو رقم خرچ کرتے ہیں وہ بھی 25 ارب ڈالر سے زیادہ ہے۔ جاپانیوں نے 1992ء میں ٹوکیو سے صرف ایک سڑک بنانے کے لیے جو رقم مختص کی وہ بھی 25 ارب ڈالر سے زیادہ ہے حتیٰ کہ ترقی پذیر دنیا میں ہر ماہ فوجیوں کی تنخواہوں پر جو رقم خرچ کی جاتی ہے وہ بھی 25 ارب ڈالر سے زیادہ ہے۔ ترقی پذیر دنیا کی حکومتیں اپنے عوام کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنے بجٹ کا دس فیصد حصہ صرف کررہی ہیں جبکہ 35 ہزار مرنے والے بچوں میں سے ساٹھ فیصد اموات صرف نمونیہ' اسہال اور خسرہ سے ہوتی ہیں۔ جن کا بڑی سستی تدابیر سے علاج کیا جاسکتا ہے۔ جو نہیں ہوتا حیرت ہے کہ بنیادی ضروریات غذائیت' پرائمری ہیلتھ کیئر' پانی اور صفائی' پرائمری تعلیم اور خاندانی منصوبہ بندی کی سہولتوں کے لیے 4 ارب ڈالر سالانہ بین الاقوامی امداد ملتی ہے۔ یہ رقم اس رقم کے نصف سے بھی کم ہے جو امداد دینے والے ملک ہر سال سپورٹس کے جوتوں پر صرف کرتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کی معلومات اب ایک معمول کا المیہ بن چکی ہیں۔ کیا اسے آسانی سے برداشت کیا جاسکتا ہے۔ مرنے والے بچوں کا ماتم الگ مزید لاکھوں بچوں کی نشوونما بھی رک جاتی ہے۔ بچوں کی اموات کے حوالے سے یہ بات کس قدر روح فرسا ہے کہ یہ کہا جارہا ہے کہ اس طرح کی خبر کوئی خبر ہی نہیں۔ دنیا کی یہ سب سے بڑی تباہی بالعموم ہمارے ٹیلی ویژن پر دکھائی نہیں دیتی۔

اس خوفناک تاریکی میں امید کی کرن بھی دکھائی دیتی ہے۔ بدقسمتی سے انسانی ضروریات کی طرف توجہ دلانے کے کام سے یہ تاثر عام ہوگیا ہے کہ ترقی پذیر دنیا ایسی سٹیج ہے جس پر صرف المیے ہی دکھائے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو ہزار برسوں مین اتنی پیش رفت نہیں ہوئی جتنی پچھلے پچاس برسوں میں ہوئی ہے۔

ترقی پذیر دنیا میں اوسط آمدنی سے بھی زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ شیر خوار اور دوسرے بچوں کی شرح اموات میں نصف سے بھی زیادہ کمی ہوئی ہے۔ اوسط عمر میں ایک تہائی اضافہ ہوگیا ہے۔ سکول جانے والے بچوں کا تناسب جو نصف سے بھی کم تھا' اب تین چوتھائی سے بڑھ گیا ہے۔ آخر میں ایک بات کہ اگر غربت کو اگلی نسل میں منتقل کرنا مقصود نہیں تو چھوٹے بچوں کی غذائیت' صحت اور تعلیم کو تحفظ دینا لازمی ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

بے نظیر مشورہ

محترمہ بینظیر بھٹو زوروں پر ہیں۔ انہوں نے تیز رفتار بیانات سے حکومت کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ان کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں یہی پوزیشن میاں نواز شریف کی تھی۔ تب نواز شریف ہیرو تھے۔ آج کل بینظیر بھٹو ہیرو ہیں۔ ہم انہیں ہیروئن نہیں کہہ سکتے ہیرو صرف ہیرو ہوتا ہے اس میں مذکر مونث نہیں ہوتا۔ یہ بہر حال حقیقت ہے کہ انسانی تاریخ میں مونث ہیروز کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ برصغیر میں نمک والی روٹی پسند کی جاتی ہے۔ چنانچہ مسز اندرا گاندھی' مسز بندرانائیکے' مسز بینظیر بھٹو' مسز خالدہ ضیاء صف اول کی لیڈر بھی ہیں جب کوئی عورت احتجاج کرتی ہے نعرے لگاتی ہے تو بہت اچھی لگتی ہے۔ ہمارے فلموں میں بھی ایک نازک اندام ہیروئن پانچ پانچ شیر جوانوں کا مار مار کر بھرکس نکال دیتی ہے تو سینما ہال میں بڑھکیں ہی بڑھکیں لگ رہی ہوتی ہیں۔ فلمساز صورت حال ہی ایسی بناتا ہے کہ بہت سے مردوں کو ایک عورت سے مار کھانا پڑتی ہے۔ برصغیر میں سپر پاورز اور خصوصاً امریکہ بہادر سیاسی صورت حال ہی ایسی بنا دیتا ہے کہ لیڈر کے طور پر ہماری عورتیں میدان مار لیتی ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے حوالے سے کیا گیا کہ انہیں میدان سے اسی لیے ہٹایا گیا۔ جنرل صاحب سے اختلاف ہوسکتا ہے مگر یہ بات طے ہے کہ وہ ایک گہرا اور خرانٹ سیاست دان تھا۔ ہمارے سیاست دانوں میں صرف یہ کمی ہے کہ وہ سیاست دان نہیں ہوتے۔ بینظیر بھٹو بھی پوری سیاستدان بن رہی ہیں۔ دوسری غلطی انہوں نے یہ کی کہ وزیر اعظم بننے کے بعد انہوں نے مردوں جیسے کام کرنے شروع کر دیئے۔ وہ اگر ایک بہن کی طرح ہمدرد اور معاف کر دینے والی بنتیں تو انہیں ناقابل یقین کامیابیاں ملتیں۔ قائد حزب اختلاف کے طور پر بھی شروع شروع میں انہوں نے اپنے پرانے حریف کی مخالفت شروع کی۔ ان کی مخالفت وزیر اعلیٰ کے سلسلے میں بڑا نیک شگون بن گئی ہے۔ نواز شریف کے دوست بھی خوش تھے کہ قائد حزب اختلاف کی مخالفت قائد ایوان کی مخالفت سے مختلف ہوتی ہے لہٰذا خطرہ نہیں بلکہ اچھا ہے کہ محترمہ کی توجہ ادھر ہی رہے مگر اب بینظیر بھٹو کے مشیر کچھ عقلمند ہو گئے ہیں۔ انہوں نے پھر رخ نواز شریف کی طرف کر لیا ہے۔ محترمہ کے مشیر تو وہی ہیں بس صورت حال بدل گئی ہے۔ مشیر تو نواز شریف کے بھی ہی ہیں مگر یہاں بھی صورت حال بدل گئی ہے۔ نجانے کیا راز ہے کہ ہمارے ہاں وزیر اعظم بننے کے بعد ہر آدمی وہی کچھ کرتا ہے جو اس سے پہلے نے کیا تھا۔ محترمہ بینظیر بھٹو جناب محمد خان جونیجو کے نقش قدم پر چلیں۔ نواز شریف کے قریب ترین لوگ کامیاب کوشش کریں گے کہ وہ محترمہ بینظیر بھٹو کے راستے پر ذرا اور آگے جائیں تو وہ

KitaabPoint.blogspot.com

اپنا اصل کام شروع کریں۔ یہ موضوع ذرا مشکل ہے۔ ہم یہاں صرف محترمہ بینظیر بھٹو کی بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ آج کل لوگوں کو پھر بہت اچھی لگنے لگی ہیں۔ جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ایسی تدبیر کرتی ہیں کہ لوگوں کو کئی بھولے ہوئے صدمے بھی یاد آ جاتے ہیں جو کرپٹ سیاست دانوں اور ظالم افسروں کے بخشے ہوئے ہیں۔

محترمہ بینظیر بھٹو نے امریکی سفیر رابرٹ اوکلے کو الوداعی عشائیہ دیا۔ اوکلے صاحب نے جاتے جاتے بینظیر بھٹو کو وہ کچھ کہہ دیا جو دوسرے کہنے سے ڈرتے ہیں۔ مجھے لگا کہ امریکی سفیر کا اصل مخاطب نواز شریف ہے۔

وہ کہہ رہا تھا کہ کسی سے سنا سنا کے مجھے

کیا نواز شریف بینظیر بھٹو کا مشورہ مان لیں گے۔ انہوں نے کہا کہ جب محترمہ بینظیر بھٹو وزیر اعظم تھیں تو میں نے بہت کوشش کی کہ ان کی اور نواز شریف کی صلح ہو جائے لیکن افسوس کہ مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو نواز شریف وزیر اعظم کیسے بنتے۔ اب بھی مقابلے میں یہی دونوں لیڈر ہیں۔ اب صلح ہو جائے تو محترمہ بینظیر بھٹو کے وزیر اعظم بننے کے امکانات کا کیا بنے گا۔ گویا اصل مسئلہ اقتدار کا ہے جس کی وجہ بقول اوکلے یہ عظیم ملک سیاسی انتشار اور گروہی مفادات کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ یہ کشمکش اور آویزش ملکی مفاد میں نہیں۔ یہاں امریکی سفیر پاکستان کا ہمدرد نظر آتا ہے۔ اگر ملک کے اپنے لوگ مخلص ہوں تو کوئی دوسرا غیر مخلص ہو بھی تو کیا کر لے گا۔ اوکلے صاحب نے پاکستانی بیوروکریسی کو بھی ہدف تنقید بنایا۔ انہوں نے کہا کہ یہ کوئی کام آسانی سے نہیں ہونے دیتے۔ اتنی بات طے ہے کہ ہمارے ملک کے زوال اور بحران کے اصل ذمہ دار بیوروکریٹ ہیں۔ ''ریڈ ٹیپ ازم'' ہر مخلص اور بلند ارادہ شخص کی تمناؤں کا خون کر دیتی ہے۔

افسوس ہے کہ اپنے دور اقتدار میں محترمہ بینظیر بھٹو کو ان باتوں کی سمجھ نہیں آتی۔ اللہ کرے اب سمجھ آ جائے۔ پرانے وقتوں کے حوالے سے ان کی خدمت میں چند گزارشات پیش ہیں۔ ممکن ہے کہ ان باتوں سے وہ آج بھی کوئی نتیجہ اخذ کریں۔

1988ء میں اگر محترمہ اقتدار کے لیے بے قرار نہ ہو جاتیں اور چند مہینے حزب اختلاف میں رہنا قبول کر لیتیں تو شاید قائد حزب اختلاف کے طور پر اتنی تگ و دو انہیں نہ کرنی پڑتی۔

اگر محترمہ بینظیر بھٹو نے نامزد وزیر اعظم بننا اپنے لیے قبول کر لیا تھا تو پھر صدر پاکستان سے بنا کے رکھتیں جس نے انہیں نامزد کیا تھا۔ اس ضمن میں انہیں فوج اور فوج کے اس وقت کے سربراہ کی امداد بھی حاصل ہوئی تھی۔ محترمہ نے چیف آف آرمی سٹاف کو تمغہ جمہوریت بھی عطا کر دیا تھا۔ مگر اس کے بعد فوج سے بے معنی قسم کی کشمکش میں اپنے آپ کو پھنسا لیا۔ آج کل جو رویہ فوج کے لیے ان

KitaabPoint.blogspot.com

کاہے یہ رویہ اسی وقت ہوتا تو بات نہ بگڑتی۔

اس وقت یہ بحث غیر متعلق ہے کہ اسمبلی کیوں ٹوٹی اور بے نظیر بے قصور کے نعرے کی کیا اصلیت ہے۔ میں صرف یہ بات کر رہا ہوں کہ جو لیڈر اپنی مدت اقتدار پوری نہیں کر سکتا تو اس کی سیاسی صلاحیتوں پر مجھے شک ہے۔ سیاست دان تو وہ ہے جو ایسی صورت حال بننے ہی نہ دے کہ مصنوعی طور پر اس کے اقتدار کا خاتمہ ہو جائے۔

محترمہ بینظیر بھٹو کے اقتدار کے لیے آصف زرداری کا رول بھی اصلاح طلب ہے۔ سب سے اہم بات نواز شریف کے ساتھ ان کی کشمکش ہے۔ اگر وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے ساتھ بھی وہ رویہ رکھیں جو انہوں نے سندھ کے وزیر اعلیٰ کے ساتھ رکھا تھا تو انہیں برے دن نہ دیکھنے پڑتے۔ حزب اختلاف کے لیڈروں کے ساتھ جس رواداری کا مظاہرہ وہ کرتی ہیں' کاش وزارت عظمیٰ کے دوران بھی کریں۔ کیا میری یہ باتیں جناب نواز شریف بھی سن رہے ہیں۔ ایوان اقتدار میں داخل ہوتے ہی عوام کا لیڈر خواص کا بندہ کیوں بن جاتا ہے؟

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

پنجاب کے علاقہ غیر میں

ڈیرہ غازی خان میں تونسہ سے کچھ دور علاقہ غیر میں بھی لوگوں کو اردو بولتے سنا تو خوشی سے ان کی حالت غیر ہوگئی۔ ویسے اس مذاکرے کا معیار اور اہتمام اہل قلم کانفرنس سے کم نہ تھا۔ صدیقی صاحب کی موجودگی نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ اسے آپ اہل قلم کی منی کانفرنس کہہ سکتے ہیں۔ ایک علاقہ غیر سرحد کی طرف بھی ہے۔ اس بہانے اہل قلم افغان مہاجرین سے بھی مل لیں گے۔ دوسرے ملکوں سے صحافی سیاست دان اور ادیب پاکستان آتے ہیں تو خاص طور پر وہاں جاتے ہیں یا لے جائے جاتے ہیں مگر ہمارے بہت ہی کم اہل قلم کو توفیق ہوئی ہے یا ارباب اختیار یا اداروں کو ایسا خیال آیا ہے۔ ویسے اس علاقہ غیر میں بھی کئی لوگوں پر ہمیں مہاجرین بلکہ افغان مہاجرین کا گمان گزرا۔

آفتاب احمد شاہ نے ہمیں علاقہ غیر میں ایک مقام بارتھیر لے جانے کا پروگرام بنایا جسے اکثر لوگ بھارتیہ سمجھتے رہے اور ہم ایک کار ایک جیپ اور ایک بس میں بیٹھ کر جب پکی سڑک سے اترے تو باقاعدہ اچھلنے کودنے لگے۔

کہیں راستے کا نام ونشان نہ تھا۔ راستہ وہی تھا جہاں سے موٹریں گزر رہی تھیں۔ حد نظر تک پتھر ہی پتھر تھے۔ میں نے ریاض مجید سے کہا کہ کبھی کسی نے پتھروں کو گننے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ آسان طریقہ ہے جتنے جھٹکے اتنے پتھر۔ دن کو بھی دور دور تک کوئی آدمی نہیں تھا۔ ہم نے کوئی پرندہ بھی نہ دیکھا۔ کہیں ایک سپاہی نظر آیا جیسے وہیں سے ابھی ابھی اگ آیا ہو۔ کئی مرتبہ جب موٹروں کا فاصلہ بڑھ گیا اور درمیان میں ٹیلے یا پہاڑیاں حائل ہوتیں تو دوراڑتی ہوئی دھول ہماری رہنما بن جاتی۔ پتھریلے رستوں پر بھی گرد وغبار پتھروں اور مٹی کے رستے کی گودی بن گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد پانی کے ایک چشمے نے ہمارا راستہ کاٹا جو چھوٹا سا نالہ بن گیا تھا۔ پانی دیکھ کر ہم یوں حیران ہوئے جیسے پہلی دفعہ اس نعمت سے آشنا ہوئے۔ ویسے وہ پانی ہماری ٹینکیوں کے پانی سے مختلف تھا۔ صاف شفاف چمکتا ہوا۔ شاہ جی نے کہا کہ نجانے کتنی معدنیات کا عطر اس میں گھلا ہوا ہے۔ سب اترے اور یہ پانی تبرک کی طرح پیا بلکہ چکھا کہیں معدہ ہی خراب نہ ہوجائے۔ خالص چیز کھا پی کر خاص اندیشہ ہوتا ہے۔ ریاض مجید نے کہا تمام گنجے لوگ اس پانی میں سر دھولیں تو ان کے بال اگ آئیں گے۔ مگر اس تجربے سے گریز کیا گیا۔ اس کے بعد ان گنت چشموں ندی نالوں میں سے ہمیں گزرنا پڑا۔ پانی بڑی دانش وجرات کے ساتھ راستہ بناتا ہے۔ آج ہم بھی پانی کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قد کے کئی پہاڑ ہمارے

KitaabPoint.blogspot.com

ساتھ ساتھ تھوڑی تھوڑی دور چلتے رہے۔ پہاڑوں کا طرز تعمیر بھی حیران کن ہے۔ کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے کسی نے باقاعدہ پتھروں کو دیواروں کی طرح بنایا ہوگا۔ پتھروں نے قبائے خاک پہن رکھی تھی۔ کئی غاریں بالکل دروازوں کی طرح نظر آئیں۔ کچھ دوستوں نے یہاں سے اندر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جس طرح کچھ نے چشموں میں نہانے کی تجویز بھی پیش کی۔ مگر اس علاقے کی کشادگی حیرت اور جبروت کے باوجود ہم تھک گئے۔ دراصل ہم ورزش کے عادی نہیں رہے۔ صبح کے چلے جب سورج سر پر پہنچ گیا تو پتہ چلا کہ ہم چند میل کا فاصلہ طے کر پائے ہیں۔ ایسے سفر میں فاصلہ میلوں میں نہیں گھنٹوں میں پیمائش کیا جاتا ہے۔ ویسے یہاں احساس ہوا کہ پیدل چلنے والے فائدے میں رہتے ہیں۔ بہرحال ہم نقصان میں نہ تھے کہ روٹین زندگی میں ایسے تجربے بہت بڑی نعمت ہیں۔ ہم نے زندگی میں کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس طرح حلقہ غیر میں جائیں گے۔ ہم تو ابھی پوری طرح علاقہ بھی نہیں دیکھ سکے۔ ہمیں تو علاقہ غیر بھی اپنا ہی لگا۔ کھانا کھاتے ہوئے یقین آیا کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے اور یہ مہر جو لوگ اپنی جیب میں رکھتے ہیں وہ بھی اس کے استعمال پر پوری طرح قادر نہیں ہوتے۔ میں تو اب اس کا بھی قائل ہوا کہ پانی کے بھی ایک ایک قطرے پر مہر ہوتی ہے۔ وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ پتھروں میں کیڑوں کو بھی رزق پہنچاتا ہے۔ وہاں سردار کو چھوڑ کر انسان بھی کیڑے مکوڑے ہی ہیں۔ وہاں فطرت کی فیاضیاں عام ہیں مگر انسان انہیں خاص بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم وہاں سے واپس ہوئے تو رات سر پر تھی۔ دور تک پھیلی ہوئی خوفیلی تنہائی ہماری ہم سفر تھی۔ ایسے میں دور کی روشنی پر مکمل اعتماد خراب کر سکتا ہے۔ یہ روشنی منزل کا پتہ دیتی ہے مگر راستے کا پتہ نہیں دیتی۔ اس کے لیے آدمی کے پاس بھی روشنی ہونی چاہیے۔ راستے میں محمد نواز طاہر افغان صورت حال پر بھی روشنی ڈالتے رہے یہ کھلا کہ اس جہاد میں ہمیں جو روشنی سی دکھائی دیتی ہے وہ ان کے لیے آگ ہے۔ ظلم کے اندھیرے کو شکست دینے کے لیے خود کو جلانا پڑتا ہے اپنے گھروں اپنی زمین کو جلانا پڑتا ہے لیکن وہ تو اپنے ملک میں ہماری جنگ لڑ رہے ہیں۔

ہم جب پکی سڑک پر چڑھے تو نئے عہد کی سہولتوں پر پورا ایمان لے آئے مگر وہ جو دو چار آدمی راستے میں پیدل چلتے ہوئے ملے تھے ہم سے زیادہ ایماندار آدمی تھے۔ دوسرے دن ہم اپنا ایمان تازہ کرنے کے لیے خواجہ سلیمان تونسوی کے مزار پر گئے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی ہمارے ساتھ نہیں تھا کہ وہ خود کو خواجہ صاحب موصوف کا رشتہ دار سمجھتا ہے۔ خواجہ سلیمان تونسوی بہت بڑے صوفی تھے ولی تھے۔ یہاں وہ آ کر تنہائی سے ہم کلام ہوئے۔ ان لوگوں کی بستیاں تنہائی کی وسعت میں واقع ہوئیں۔ تقریباً تمام اولیاء کرام اجاڑ جگہوں پر اپنا مسکن بناتے رہے ج شہر چلے جاؤ تو کسی نہ کسی ایسے ہی صاحب قبر سے ضرور واسطہ پڑتا ہے جہاں حاضر ہو کر طمانیت اور بازیافت کا احساس ہوتا ہے۔ پیر پٹھان تو میرے پیروں کے پیر ہیں ہمارا خاندان پیر سیال کا ارادت مند ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

وہاں بہت بڑا دینی مدرسہ ہے جو ویران منظر کی طرح لگ رہا تھا۔ دو سو سال پہلے یہاں پانچ ہزار طلبہ تھے جو ظاہری اور باطنی علوم سے فیض یاب ہوتے تھے۔ اب طلبہ کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ تب یہاں یہ عالیشان عمارت نہیں تھی۔ صرف ایک جھونپڑی تھی' ہمارے پاس عمارات اور دوسرے وسائل ہونے چاہئیں۔ مگر وہ کچھ بھی ہونا چاہیے جو وسائل کے بغیر ہمارے پاس تھا۔

میں تاں جانا جھوک سیال دے

ڈیرہ غازی خان میں سید آفتاب احمد شاہ کے ہونے سے بہت شاعروں اور ادیبوں کو نئے تجربات' مشاہدات کا ذخیرہ ملا یہ کوئی خالی خولی ٹرپ نہ تھا۔ یہ تو بقول شخصے ''ڈرپ'' تھا۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

آزاد کشمیر میں ادبی پکنک

ہم سب لوگوں کے پاس شمس کاشمیری کی نئی کتاب ''سری نگر..... پچھتر میل'' تھی ہم راوی کا پل پار کرنے سے پہلے ہی سری نگر سے پچھتر میل کے فاصلے پر تھے۔ آزاد کشمیر کی سرحد کے پرے سری نگر روڈ پر جو آخری سنگ میل ہے۔ اس پر سری نگر 75 میل لکھا ہوا ہے۔ یہی سنگ میل شمس کے ناول کا ٹائٹل ہے۔ ایک تو کشمیر کو آزاد اور مقبوضہ کہتے ہوئے دل جلتا ہے۔ یہ سنگ میل سنگ راہ کیسے بن گیا۔ یہی شمس کاشمیری کے ناول کا موضوع ہے۔ ہم آزاد کشمیر میں جہاں بھی ہوتے' سری نگر 75 میل کے فاصلے پر لگتا تھا۔

راولپنڈی سے ہم ''مری'' کے راستے مظفر آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ آج کل مری ہجوم کے مارے اپنی کشش کھو رہی ہے۔ دلکشی اکیلی جگہوں میں ہوتی ہے جب چہرے کو پہلی بار نظریں چھوتی ہیں۔ بار بار دیکھی جانے والی چیزوں سے آدمی اکتا جاتا ہے۔ یا تو وہ چیز ہر بار نئی لگے۔ ہم ریڈیو سے پسند کا گیت سننا چاہتے ہیں۔ فرمائش کرنے والوں کے نام نہیں۔

پاکستان کی حدود ختم ہوتے ہی دریائے جہلم بھی ہمارا ہم سفر ہو گیا۔ یہ مخالف سمت میں شور مچاتا ہوا بہہ رہا ہے۔ مگر ہماری منزل تک ہمارے ساتھ ساتھ چلا گیا۔ بعض اوقات مخالفت میں اترے ہوئے لوگ بھی کتنے بڑے ساتھی ہوتے ہیں۔ بہتا ہوا پانی اور پہاڑوں کا سلسلہ عمدہ شعر اور اچھی نثر کی یاد دلاتا ہے۔ پہاڑوں کے اوپر جنگلوں میں شیر بھی ہوتے ہیں۔ خطرناک نہیں ہوتے۔ میں نے کہا پھر تو صحیح معنوں میں شیر کشمیر ہوئے۔ ہم نے رستے میں کوئی دھاڑ نہیں سنی۔ دھاڑتے ہوئے پانی کا تسلسل بھی ترنم بنتا چلا جا رہا تھا۔ اس پانی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کی زندگی ایسی ہو تو پھر ان کی بقاء ممکن ہے۔ جب یہی دریا میدانوں میں پہنچتے ہیں تو آرام پسند ہو جاتے ہیں اور لوگ انہیں پکڑ کر اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ باقاعدہ قید کر لیتے ہیں اور جو چاہتے ہیں' کام لیتے ہیں۔

مظفر آباد کے قریب دو ملتے دریاؤں کو دیکھا۔ دریائے جہلم اور دریائے نیلم کا ملاپ ایک خوبصورت منظر ہے۔ دو دلوں کا ملاپ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ دونوں دریاؤں کا پانی دور تک گلے ملتا ہوا چلا جاتا ہے۔ یہ فطرت کا کمال ہے۔ مگر آزاد کشمیر میں سیاست نے کشمیریوں کو کئی چھوٹے چھوٹے ندی نالوں میں بانٹ رکھا ہے۔ کئی تو صرف برساتی نالے ہیں۔

دریائے نیلم رات بھر اونچے سروں میں وجد کرتا رہا۔ اس نے ہمیں سونے نہیں دیا۔ ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے' وہ چار پانچ منزلہ ہے۔ مگر یہ منزلیں نیچے کی طرف بنی ہوئی ہیں۔ سب سے آخری یعنی نچلی منزل پر میں تھا۔ دریائے نیلم قریب ترین ہمسایہ تھا۔ اس کا

KitaabPoint.blogspot.com

پانی پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر بھنگڑا ڈال رہا تھا۔ اوپر سے بارش کے قطروں کا رقص ایک عجب نظارہ تھا۔ آدھی رات کے بعد تک تو ہم جاگتے رہے۔ پھر دریا کی بہت منت سماجت کی۔ اسے منیر نیازی کا پیغام دیا اور کہا کا کا چپ کر مگر رو میں آئے ولولے کب کسی کا کہا مانتے ہیں۔ نیلم چٹانوں کا کلیجہ چیر کر کسی سے ملنے نکلا تھا۔ ہم اسے کیسے روکتے۔ ہمیں بھی نیند آ ہی گئی۔ نیند بھی ایک دریا ہے۔ نیلم سے بھی زیادہ زور آور۔

ضمیر جعفری کی سنجیدہ شاعری سننے کا موقعہ ملا۔ شاعری کے سامعین کیا جانیں کہ اعلیٰ درجے کی مزاحیہ شاعری کرنے والا میاں محمد کا عاشق بہت پرسوز دل رکھتا ہے۔ لاہوری دوستوں کے ساتھ تقریب حسین شہید کالج کے ہال میں تھی۔ پرنسپل کالج پروفیسر سرور چوہدری کا کمرہ چوپال بن گیا۔ تقریب شروع ہوئی۔ سٹیج سیکرٹری راولاکوٹ کا بہت مخلص انسان اور ممتاز مزاح نگار محمد کبیر خان تھا۔ اس سچی کشمیری سوچ رکھنے والے شخص سے مل کر پہاڑ کی سیر جیسا لطف آیا۔ اس تقریب میں اس کی خوش اسلوبیاں دیکھ کر اسے ''تقریب کبیر'' قرار دیا۔

ہم قافیہ پیمائی کرنے ولاے کوہ پیمائی کرنے بھی نکلے۔ کہا گیا کہ سامنے والے پہاڑ کے اس پار مقبوضہ کشمیر کا علاقہ نظر پڑتا ہے۔ ہم سب میں قابل داد ضمیر جعفری تھے۔ ستر سال سے اوپر عمر اور وہ سب سے پہلے چوٹی پر پہنچے۔ کوہستانی علاقوں میں راستے میں ملنے والا ہر آدمی سلام کرتا ہے اجنبی کو تو ضرور سلام کرتا ہے۔ جس طرح ہم نے نگاہ دوڑائی تو اس گیت کی درد انگیز صداقت پر یقین اور پختہ ہوا۔

مرے وطن تری جنت میں آئیں گے اک دن

راولاکوٹ کو ''منی سری نگر'' کہتے ہیں۔ چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھری ہوئی بہت بڑے پیالے کی شکل کی بستی میں حسن و جمال بھرا ہوا ہے۔ واپسی پر ہمیں معلوم ہوا کہ پہاڑوں سے اترنا زیادہ مشکل ہے۔

جوگی اتر پہاڑوں آیا۔۔۔۔۔۔ چرخے دی گھوک سن کے

اب ہمارے کانوں میں ''گھوکر'' بجنے لگی تھی۔ شام بھی ہمارے ساتھ اتر رہی تھی۔ ان علاقوں میں شام جلد بازی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ بہت دور آباد بستی میں صاحب مطالعہ اور صاحب ذوق خواتین و حضرات کی موجودگی یہاں کے بہار آفریں موسم سے بھی زیادہ فرحت بخش تھی۔ اس پر فضا مقام پر میٹھے چشموں جیسے لوگ رہتے ہیں۔ مگر وہ پانی کے لیے ترستے ہیں۔ بارش نہ ہو تو چشمے سوکھ جاتے ہیں۔ اللہ کرے دلوں اور زمینوں پر بارشیں برستی رہیں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

خونی خلیج کون پاٹے گا

میں تو عالم اسلام میں کسی بھی صورت حال سے بھی مطمئن نہیں ہوں۔ مطمئن ہونا بڑا عجب سا لگتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہم سچی طرح سے مضطرب بھی نہیں ہیں۔ اگر ہمارے دلوں میں اضطراب کی کوئی زندہ لہر ہوتی تو ہمیں یہ دن دیکھنے نہ پڑتے۔ میں نے بہت پہلے خلیج کا لفظ دلوں کے درمیان فاصلے کے حوالے سے سنا تھا۔ جب اختلافات بڑھتے تھے تو کہا جاتا تھا کہ ہمارے درمیان خلیج وسیع ہو گئی۔ خلیج وسیع تو تھی ہی خطرناک بھی ہوگئی۔ اب اس خلیج کو کیسے پاٹا جائے کہ درمیان ہماری اپنی لاشوں کا سمندر بہہ رہا ہے۔ جہاں تک پاکستانی حکومت کے کردار کا تعلق ہے تو میں اس بارے میں کیا کہوں کہ اس ضمن میں مجھے اپنے کردار کا ہی پتہ نہیں چل رہا۔ یہ تو بڑی پرانی اور گہری سازش ہے جو مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کی طرف سے کی جارہی ہیں۔ یہودیوں نے تو پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہی سازشوں کے جال بچھانے شروع کر دیئے تھے۔ حضرت عثمان کی شہادت یہودیوں کی پہلی کامیابی تھی پھر اس کے بعد مسلمانوں کے درمیان جو تلوار چلی تو ہماری تاریخ خون کے دریا سے باہر نہیں نکلی۔ یہودی بالخصوص عالم اسلام اور بالعموم سارے عالم کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ اس موقع پر میں کتنی مثالیں پیش کروں۔ پوری تاریخ یہودیوں کے خلاف سسکیاں لے لے کر فریاد کر رہی ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ یہودی امریکہ کے ساتھ بھی مخلص نہیں ہیں۔ جو کچھ افغانستان میں ہوا اس جنگ کا بھی ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مگر مردان کوہستان نے چنگیزوں کو رسوائی کا تحفہ دیا۔ خلیج میں بھی بندگان صحرائی کے ارادوں کے سامنے ہماری ذلت کا سامان ہو رہا ہے۔ میں صدام کی جیت میں اتنی دلچسپی نہیں رکھتا مگر امریکہ کی شکست سننے کے لیے میری نیندیں اجڑ گئی ہیں۔

ہم پاکستانی صدام دونوں سے بے تعلق تھے اور بے خبر تھے مگر آج وہ شخص ہمیں اس مقام پر لے آیا ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی نظریں بار بار اس کی طرف اٹھتی ہیں۔ صدام اگر ضدی دلیری کے قابو میں نہ آتا اور ایسی حکمت عملی اختیار کرتا کہ کم از کم اس لڑائی میں امریکہ کے مقابلے میں روس تو اس کے ساتھ ہوتا' چین تو اس کے ساتھ ہوتا' عالم عرب اور عالم اسلام کے وہ ملک ہی اس کے ساتھ ہوتے جو نظریاتی طور پر اس کے قریب تھے۔ ہمارے ساتھ ہمیشہ یہ ڈرامہ ہوتا رہا کہ ہم اپنے ہیرو کو پہچاننے میں غلطی کرتے رہے۔ جن دنوں ہندوستان میں تحریک خلافت چل رہی تھی تو جس شخص کے لیے سب کچھ ہو رہا تھا اس نے ترکی میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر

KitaabPoint.blogspot.com

دیا۔ موجودہ صورت حال میں سب سے بڑی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ کسی نہ کسی طریقے سے جنگ بند ہو۔ میں زیادہ امن کے حق میں نہیں ہوں۔ بعض اوقات امن عالم کے لیے جنگ ضروری ہو جاتی ہے۔ مگر لڑنے والے کو یہ تو پتہ ہو کہ وہ کیوں لڑ رہا ہے۔ اس جنگ میں نتیجہ اگر امریکہ کے خلاف نکلتا ہے اور وہ ضرور نکلے گا تو اس کے بعد بھی صورت حال سنبھالنے کے لیے بڑی کوششیں کرنی پڑیں گی اور ہم تو دعا کرنے والے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہمیں دعائیں بھولتی جا رہی ہیں۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب کیا دعا کرنی چاہیے۔ ایسے حال میں ایک سوال کے سامنے میں ہزار سوالات کی صلیب پر لٹک گیا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ صدام حسین کسی پراسراری وادی میں کھڑا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے وہ کسی غیب کے دروازے سے نمودار ہو کر برپا ہونے والا ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

زخمی شیرنی کی دھاڑ

سابق شیر پنجاب جناب غلام مصطفیٰ کھر کی سابق بیوی بلکہ سابق شیرنی محترمہ تہمینہ درانی نے ایک کتاب لکھی ہے۔ کتاب میں کچھ باتیں نئی ہیں۔ بلکہ نئی نویلی ہیں۔ کسی مشہور آدمی کے لیے اس کے ہمسائے یا اس کی بیوی کی باتوں میں لوگوں کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ بیوی سے بڑھ کر کون گھر کا بھیدی ہوگا۔ بیوی سابق ہو تو ایک سنسنی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ شیر پنجاب کی نسبت سے تہمینہ بی بی کو زخمی شیرنی کہنا چاہیے۔ کتاب بھی انہوں نے گرجدار لکھی ہے۔ سابق شیرنی تو بیوہ کو کہا جا سکتا ہے۔ ابھی کئی کارنامے انہوں نے انجام دینا ہیں۔ تہمینہ بی بی بھی مطلقہ ہونے کے بعد بپھری ہوئی شیرنی بن چکی ہیں۔ گھریلو شیرنی کی حیثیت میں تو وہ پنجرے میں تھیں۔ سابق کا عہدہ ہماری سیاست میں بڑا کارآمد ہے۔

لوگ وزیر اس لیے بنتے ہیں کہ ان کے نام کے ساتھ سابق وزیر کا خطاب لگ جائے۔ یہ "عہد" ہمیشہ کے لیے ہے۔ مثلاً جونیجو صاحب ابدی طور پر سابق وزیر اعظم ہیں۔ چنانچہ وزیر بننے میں سوچ بچار نہیں کی جاتی۔ خواہ یہ بھٹو صاحب کی کابینہ ہی کیوں نہ ہو۔ بھٹو صاحب اپنے وزیروں سے وہی سلوک کرتے تھے جو ظالم شوہر اپنی بیویوں سے کرتے ہیں۔ بڑے لوگوں کی پہلی بیویوں کا حشر معلوم ہونے کے باوجود عورتیں ان سے شادی کرنا پسند کرتی ہیں۔ اس کے بعد سابق بیوی ہونے کا اعزاز تو ان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

محترمہ تہمینہ درانی کو کھر صاحب کی چھٹی بیوی ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اس سے پہلے پانچ کی چھٹی ہو چکی ہے۔ مغربی ممالک میں مرد اور عورتیں دس دس بار شادی شدہ ہو کے بھی غیر شادی شدہ ہونے میں دیر نہیں کرتیں۔ ایک اچھی خاصی عورت سے پوچھا گیا کہ کیا آپ شادی شدہ ہیں اس نے بے تکلفی اور بااعتماد انداز میں جواز دیا ہاں مگر کبھی کبھی۔ وہاں بڑی عمر کی عورتوں کو مس کہلانے میں بڑا مزا آتا ہے۔ اس طرح بغیر اہتمام کے کم عمری کا تاثر بن جاتا ہے۔ کچھ لوگ تو اس لیے شادی کرتے ہیں کہ اس کے بغیر طلاق نہیں دی جا سکتی۔ وہاں طلاق لینا اور دینا ایک ہی عمل ہے اور اس عمل کا اپنا ایک مزا ہے۔ اس مزے سے ہمارے ہاں خاص خاص یعنی امیر مرد اور عورتیں ہی لطف اندوز ہو سکتی ہیں۔ طلاق کو معیوب سمجھنے کو ہماری فرسودہ مزاجی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کئی غریب اور شریف عورتیں طلاق کے بعد شرم کے مارے ساری عمر باپ کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلتیں۔ وہ تہمینہ درانی

KitaabPoint.blogspot.com

کی طرح پڑھی لکھی اور ترقی یافتہ نہیں ہوتیں۔ نہ ان کی شادیاں ایسے آدمیوں سے ہوتی ہیں جن کے لیے انکشافات میں لوگ دلچسپی لیں۔ عام گھرانوں میں اختلافات کے باوجود طلاق کی نوبت نہیں آتی۔ محبوبہ اور بیوی الگ الگ کردار ہیں۔ اتفاق سے محبوبہ کے ساتھ شادی ہو جائے تو مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ یہ سب چونچلے امیر لوگوں کے ہیں۔ شادی سے پہلے جس کے بغیر زندگی بے کار لگتی ہے' شادی کے بعد اس کے ساتھ زندگی بے کار لگتی ہے۔ ایک نوجوان شاعر افضال فردوس کی ایک نظم کا عنوان ہے۔

''بعض عورتیں''

بعض عورتیں

عمریں ساتھ بتا دیتی ہیں

لیکن پیار نہیں کرتیں

نظم اچھی اور ٹھیک ہے۔ اعتراض اس کے عنوان پر ہے۔ ''اکثر عورتیں'' زیادہ صحیح ہے۔ عورتوں کے خیال میں اکثر مرد بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ انہیں یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ شادیاں کرتے ہیں بلکہ کرتے ہی رہتے ہیں۔ ایک کھلنڈرے نوجوان سے پوچھا گیا کہ آج کل آپ کیا کرتے ہیں تو اس نے کہا۔

ہم بی اے کا امتحان دیا کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں بیوگان بھی شادی نہیں کرتیں یا کر نہیں سکتیں۔ طلاق یافتگان کے لیے تو مشکل زیادہ ہوتی ہے۔ محترمہ تہمینہ جیسی عورتوں کے لیے مشکل نہیں مگر کچھ اور وجوہات سے ایسا نہیں کرتیں۔

ہمارے ہاں 99 فیصد لوگوں کو ازدواجی زندگی اسی طرح گزرتی ہے جس طرح ان کی زندگی گزر جاتی ہے۔ اس بندھن کو موت سے پہلے توڑنا عام لوگوں کے بس میں نہیں ہوتا۔ مشہور شاعر ضمیر جعفری کی خوش فہمی ملاحظہ ہو۔

میری بیوی قبر میں لیٹی ہے جس ہنگام سے
میں بھی ہوں آرام سے اور وہ بھی ہے آرام سے

اس طرح تو سابق شوہر کو ریٹائرڈ شوہر کہنا چاہیے۔ بڑے لوگ ایک ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد بہتر ملازمت حاصل کر لیتے ہیں۔ یہی حال ایک بیوی سے چھٹکارہ پانے کے بعد ہوتا ہے۔ شادی کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ کھر صاحب کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ کچی ملازمتوں کے ساتھ ساتھ پکی ملازمت میں بھی یقین رکھتے ہیں۔ شادی بھی کر لیتے ہیں۔ محترمہ عائشہ بٹ کا نمبر ساتواں

KitaabPoint.blogspot.com

ہے۔ وہ اپنی کتاب کو دلچسپ بنانے کے لیے ابھی سے نوٹس لینا شروع کر دیں۔ اس سے پہلے جو پانچ تھیں ان میں سے طلاق یافتگان کے لیے بھی ابھی موقعہ ہے۔

محترمہ تہمینہ درانی کی کتاب سے جناب نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو دونوں خوش ہوں گے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے کہا ہے کہ یہ کتاب نواز شریف نے تہمینہ درانی سے لکھوائی ہے۔

تہمینہ بی بی نے مزید ثابت کر دیا ہے کہ کھر صاحب آئی ایس آئی کے آدمی ہیں۔ محترمہ عائشہ بٹ کے ثابت کرنے کے لیے یہی رہ گیا ہے کہ کھر صاحب آئی جے آئی کے آدمی ہیں۔ پیپلز پارٹی کا مفاد اب آئی ایس آئی اور آئی جے آئی کو بہنیں ثابت کرنے میں رہ گیا ہے۔ سنا ہے تہمینہ درانی کی نظر اسمبلی کی مخصوص نشستوں پر ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ میں نے گھر میں رہ کر سب کچھ کھو دیا ہے۔ ویسے بھی کھو دینے کے لیے اب ان کے پاس کچھ نہیں۔ وہ کھر کی بات کر کے اہمیت لے رہی ہیں۔ گھر کی بات کر کے تو اتنا بھی نہ ہوتا۔ دوسری صورت میں وہ زیادہ سے زیادہ بشریٰ رحمان بن سکتی تھیں۔ وزارت تو اب تک بشریٰ رحمان کو بھی نہیں ملی حالانکہ وہ پنجاب کے کئی وزیروں سے اچھی تقریر کر لیتی ہیں۔ کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔

محترمہ تہمینہ درانی نے یہ بھی کہا ہے کہ کھر صاحب کے پاس بھٹو صاحب کی کوئی دستاویز نہیں۔ یہ بات نواز شریف سے زیادہ بینظیر بھٹو کے لیے خوش کن ہے۔ تہمینہ بی بی واقعی سیاست دان بن گئی ہیں۔ اس انداز سیاست سے خواتین مصنفین کی تعداد میں تو اضافہ ہو گا۔ جتوئی کی پہلی بیوی اور بھٹو کی تیسری بیوی بھی کوئی کتاب لکھیں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

ناروے میں لٹل پاکستان

مشہور شریا نورج ناروی اور زیبا ناروی کا نام ہم نے پہلی بار سنا تو بڑے خوش ہوئے کہ ناروے میں بھی اردو شاعری کا ڈنکا بجنے لگا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بزرگ بھارت کے ایک شہر ناروہ کے رہنے والے ہیں۔ جمشید مسرور پاکستان سے جا کر ناروے کی شہریت بھی لے چکا ہے مگر اپنے نام کے ساتھ ناروی نہیں لکھتا۔ پہلی بار زیبا ناروی کو دیکھ کر لوگوں کا وہی حال ہوا ہوگا جو روحی کنجاہی کو دیکھ کر میرا ہوا تھا۔ برادرم روحی کنجاہی کو شاعرہ کہہ کر بلایا گیا تو لوگ بے قابو ہو گئے تھے۔ جب انہوں نے روحی کنجاہی کو دیکھ لیا تو آپے سے باہر ہو گئے۔ ایک شاعر 74ء میں پاکستان سے ناروے گیا تھا ویزا لگوا کر۔ اب ناروے سے پاکستان آیا ہے ویزا لگوا کر۔ شاید ان دنوں کہیں بھی جانے کے لیے ویزے کی مہر لگوانا ایڈز کا ٹیکہ لگوانا ضروری ہو گیا ہے۔ یہ ایک انوکھا تجربہ ہے جو کسی کو ایک انفرادیت عطا کرتا ہے۔

ناروے میں تخلیقی تجربات کے بڑے مواقع ہیں۔ ناروے میں جو جو کام کرنا پڑتے ہیں وہ نثری نظم لکھنے کے لیے بڑے موزوں ہیں مگر اکثر کو نظم اور غزل لکھنے کی ضد ہے۔ وہ آہیں بھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس معرکے کے لیے اسے ناروے میں کچھ مشکل مشکل راستوں پر بھی چلنا پڑا ہے۔ مثلاً وہ عشق پاکستانی عورتوں سے کرتا ہے اور تعلقات نارویجن عورتوں سے رکھتا ہے۔ عشق کرنے کے لیے کسی تعلق کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی۔ جب تعلق قائم ہوتا ہے تو عشق ہو جاتا ہے۔ شاعری سے پہلے ہم جس لڑکی کو کہتے ہیں کہ تمہارے بغیر زندگی نہیں گزاری جا سکتی شادی کے بعد اسی کے ساتھ زندگی گزارنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ناروے کا شہری ہونے کے باوجود جمشید نے شادی ایک پاکستانی لڑکی سے کی ہے۔ اس کا مطلب ہے شاعری کے لیے وہ بہت سنجیدہ ہیں۔ ہمارے کئی بڑے بڑے شاعر اپنی بیویوں سے تنگ آ کر شاعرانہ مرتبے پر پہنچے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک روایت یہ بھی ہے کہ بیوی کے ساتھ تعلقات اچھے نہ بھی ہوں تو ہم اسے طلاق نہیں دیتے بس مار پیٹ لیتے ہیں۔ طلاق کو ہم اصول کے خلاف سمجھتے ہیں اور ہم اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ مغرب میں تو لوگ شادی ہی اسی لیے کرتے ہیں کہ طلاق اس کے بعد ہی دی جا سکتی ہے۔

ہمارے شاعر اپنی شاعری کو چار چاند لگانے کے لیے محبت کرتے ہیں۔ پھر ہمیشہ کی جدائی ڈالنے کے لیے اس کے ساتھ شادی کر لیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ کیفیت اردو شاعری کے لیے بڑی اعلیٰ صورت حال مہیا کرتی ہے۔ جمشید اچھا شاعر ہونا چاہتا ہے۔ اس نے یہ

KitaabPoint.blogspot.com

ساری شرائط پوری کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ وہ ناروے میں دو دو نوکریاں کرتا ہے۔ یہ تجربہ دو دو شادیوں سے اتنا مختلف نہیں۔ اسے ہمارے ملک میں اوور ٹائم کہتے ہیں۔ صاحب لوگ اسے اوپر کی آمدنی سمجھتے ہیں۔ جمشید ایک ریسرچ کونسل میں نوکری کے ساتھ پولیس کے لیے ایک معاون کا کام بھی کرتا ہے۔ اگر وہاں کوئی بھارتی یا پاکستانی جرم کردے تو تفتیش پولیس کو مفید مشورہ سے نوازتا ہے۔ تفتیش کے دوران پولیس پڑھے لکھے لوگوں کے مشورے سن لیتی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ملک سے باہر جا کر بھارتی اور پاکستانی ایک جیسے کام یعنی جرم کرتے ہیں۔ جرم بھی ایسے جو ناروے میں نہیں ہوتے۔ اپنے ملک کی دھاک اسی طرح بٹھائی جاسکتی ہے۔ پاکستانی اپنا قومی تشخص پراسرار رکھنے کے لیے وہ حرکتیں کرتے ہیں جو پاکستان میں کیا کرتے ہیں۔ بالکل مشرقی سٹائل میں چوری چکاری اور بدکاری کرتے ہیں۔ پہلے جرم کا تعلق گھر سے ہے اور دوسرے کا گھر والی سے ہے۔ ہم جسے بدکاری کہتے ہیں ناروے میں کوئی خاص برائی نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن پاکستان اس کام میں بھی کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتے ہیں۔ آخر حب الوطنی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

جمشید نے مجھے بتایا کہ ایک کیس میں یہ ہوا کہ ایک پاکستانی شوہر نامدار نے تین بچوں والی اپنی زوجہ محترمہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جمشید کے مطابق اس عورت کا قصور یہ تھا کہ وہ اپنے خاوند سے روپے پیسے کا رکھی کی فرمائش کرتی رہتی تھی۔ یعنی عورتوں نے وہاں جا کر بھی اپنی عادتیں نہیں بدلیں۔

شوہر نے اپنی بیوی کو تہہ خانے میں بلایا۔ وہ چپ چاپ چلی گئی کہ نجانے اتنی مدت بعد اکیلے میں میاں صاحب کو میری کیا ضرورت پڑی ہے۔ شوہر نے ضروری کام کی بجائے اسے قتل کر دیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ پھر اس نے اس کیس کے سلسلے میں کیا رائے دی تھی تو اس نے بتایا کہ میں نے پولیس والوں سے کہا کہ عورتوں کو اس طرح کے دھوکے دینا پاکستانی مردوں کا پرانا شیوہ ہے۔ لہٰذا اس پر پہلے دھوکہ دہی کا مقدمہ چلایا جائے۔ وہ ان نیم تھانیدارانہ کاموں میں بڑا خوش ہے۔ اس نے پورا ناروے دیکھ لیا ہے اور کئی ''ناروا'' کام بھی ہوتے دیکھ لیے ہیں۔

پاکستانی لوگ جا کر بھی اپنے جھگڑوں سے باز نہیں آتے۔ ناروے والوں نے فرزند اقبال، جسٹس جاوید اقبال اور صدر آزاد کشمیر سردار عبدالقیوم خان کے جھگڑے کا تماشا بھی دیکھا۔ اکثر نے یہ جھگڑا الوتقریب احتیاطاً اٹینڈ کی تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ جسٹس صاحب اور سردار صاحب دونوں کشمیری ہیں۔ نجانے پنجابیوں کو پنجابیوں سے اور کشمیریوں کو کشمیریوں سے لڑانا اتنا آسان کیوں ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

ڈپٹی کمشنر کی نئی ڈائری

گزشتہ دنوں ڈپٹی کمشنر چکوال ڈاکٹر لیاقت علی خان نے ''اسلامک ایڈمنسٹریشن'' کے حوالے سے قائداعظم لائبریری کے ہال میں جرات مندانہ لیکچر دیا۔ میں یہ بات اس لیے نہیں لکھ رہا کہ وہ میرے قبیلے کے آدمی ہیں۔ ہر آدمی جو جرات کے ساتھ سچی بات کرتا ہے' میرا بھائی ہے اور وہ میرا کچھ نہیں لگتا جو مصلحت اور منافقت کو اپنا ایمان سمجھتا ہے۔

آں کہ کشتہ نہ شد از قبلہ مانسیت

لیاقت نیازی ایک ضلع میں سب سے بڑے انتظامی سربراہ ہیں اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس وقت ہمارے ملک میں نظم و نسق کے لیے جو ادارے اور قوانین ہیں وہ نہ صرف غیر موثر ہیں بلکہ ظالمانہ کردار رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں نظم و نسق کے بہانے ۶ لوگوں کا بری طرح استحصال کیا گیا ہے۔ چنانچہ کسی بھی ضلع میں ڈپٹی کمشنر کی حیثیت ایک تاجدار کی ہوتی ہے۔ اس کے لیے حاکم اعلیٰ کے لامحدود اختیارات ایک تحفے کے طرح ہر وقت موجود رکھے جاتے ہیں۔ میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اب تک ہمارے کسی ضلعے میں کوئی قابل ذکر فلاحی کام نہیں ہوا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ عالم لوگوں نے اپنی ڈپٹی کمشنر کو اپنے جیسا انسان پایا ہو۔

لیاقت نیازی بتا رہے تھے کہ جب میں اپنے دفتر میں ایک غریب بزرگ آدمی کو اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہتا ہوں تو اسے میری بات پر یقین ہی نہیں آتا۔ لیاقت نیازی اسے بتاتے ہیں کہ صاحب بہادر اب اس ملک سے چلے گئے ہیں جو حاکم بن کر آتے تھے۔ اب ہم آپ کے خادم ہیں تو بزرگ آدمی سمجھتے ہیں کہ شاید لیاقت صاحب اپنے سے پہلے ڈپٹی کمشنر کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ میں نے چکوال جا کر اپنے کانوں سے سنا کہ لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ ڈی سی تو کسی اور دنیا کا آدمی ہے۔ کسی موازنے کے بغیر میں قدرت اللہ شہاب کا ذکر کروں گا جب وہ جھنگ میں ڈپٹی کمشنر تھے تو یوں لگتا تھا جیسے جھنگ میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی ہو۔ جھنگ سے ان کے جانے کے بعد لوگ انہیں یاد کرتے تھے اور روتے تھے۔ لیاقت نیازی بھی چکوال میں ایسی یادیں پھیلا رہے ہیں کہ ان کے بعد لوگوں کے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ چکوال کا کوئی آدمی بلا روک ٹوک انہیں مل سکتا ہے۔ ان کے برسوں پرانے چھوٹے چھوٹے مسئلے فائلوں میں درج ہونے سے پہلے حل ہو جاتے ہیں۔ ان کا یہی ہمدردانہ کردار ہے کہ ان کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں وہ سی ایس ایس ہیں۔ مرکزی حکومت ان سے بھی ناراض ہے۔ شاید ان کا یہ قصور ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ

KitaabPoint.blogspot.com

اگر اسلامی قانون مخلصانہ طریقے سے نافذ کر دیا جائے تو ہمارے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں اور ترقی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر کئی رستوں پر مجبور محض بنا دیے جاتے ہیں۔ وہ سات آٹھ سال سیکرٹریٹ میں بھی رہے ہیں اور یہاں انتظامی امور کی آڑ میں جو جو گھپلے ہوتے ہیں اور جس طرح عام لوگوں کے لیے آسانیوں کی بجائے مشکلات کے پہاڑ کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔ وہ ان تمام ہتھکنڈوں سے باخبر ہیں بلکہ اب لوگوں کو خبردار بھی کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کچھ بیوروکریٹس کے لیے درندے کا لفظ بے دریغ استعمال کیا۔ وہ آغاز ملازمت سے ہی بیوروکریسی کے نقاد ہیں۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ ہم لوگ تو بیوروکریسی کے لیے ''براکریسی'' (برا کرے گی) کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو لیاقت خان نے کہا کہ خدا کی قسم اب تک ہماری بیوروکریسی کا کردار اس سے مختلف نہیں ہے۔ مگر وہ ہماری اس حیرت پر چپ رہتے ہیں کہ پھر شہاب صاحب جیسے آدمی کس طرح پیدا ہو جاتے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب صاحب بیوروکریٹ ہوتے ہوئے ''شہاب نامہ'' لکھنے پر قادر ہوئے۔ جو ایک طرح سے پاکستان کی آپ بیتی ہے۔ اس میں ایک باب کا نام ڈپٹی کمشنر کی ڈائری ہے۔ کسی اور افسر نے ڈپٹی کمشنر کی ڈائری نہیں لکھی تو یہ بات بھی لیاقت نیازی کی باتوں کی تائید کرتی ہے۔ کوئی اپنے علاقے میں ایک ظالم زندگی کے لیے وعدہ معاف گواہ کے طور پر اپنے آپ دستخط کرنے کو کیسے تیار ہوگا۔ شاید لیاقت نیازی یہ حرکت بھی کر گزریں۔ ایک دوست لیاقت خان سے ملنے چکوال گیا تو وہ اسے سیر کرانے کے لیے پاس کے قریبی تفریحی مقام کلر کہار لے گئے۔ وہاں جاتے اور واپس آتے ہوئے رستے کی مسجدوں میں ڈپٹی کمشنر صاحب نماز باجماعت ادا کرتے رہے ایک آدھ امامت بھی کرائی۔ بہت بوڑھے بوڑھے دیہاتی نمازیوں کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ ان کے ضلع کا ڈپٹی کمشنر ہے اور وہ ان کے جیسا ایک انسان ہے۔ اس سے پہلے کبھی ان کی مسجد میں کوئی معمولی افسر بھی داخل نہ ہوا تھا۔ پھر جب ڈپٹی کمشنر ان کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرنے لگا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم کریں تو دیہاتیوں کو یقین ہو گیا کہ یہ کوئی جعلی ڈپٹی کمشنر ہے جب ان کے سہارے پرانے مسئلے ایک ایک کر کے حل ہو گئے تو انہیں پھر بھی یقین نہ آیا کہ یہ ڈپٹی کمشنر ان کے جیسا کوئی انسان ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کوئی فرشتہ ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ لوگوں کو ڈپٹی کمشنر کے عام انسان ہونے کا یقین ہی نہیں آتا۔ اب تک یہ حضرات اپنے ملک میں بھی کسی اور سیارے کی مخلوق سمجھے جاتے ہیں۔ شاید ایسی ہی کچھ وجوہات تھیں کہ ایک بڑے اہل افسر نصرت علی اور ریاض احمد نے ڈپٹی کمشنر کے طور پر کہیں جانے سے انکار کر رکھا ہے۔ وہ برس ہا برس سے سیکرٹریٹ میں ہیں۔ وہ روزانہ جتنی فائلوں کو نپٹاتے ہیں اتنی فائلیں دوسرے افسروں کے پاس مہینوں تک مہمانوں کا منہ تکتی رہتی ہیں۔ یہ دونوں کچھ عرصہ کے لیے سپیشل ایجوکیشن کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے تو حیرت انگیز کام اس دوران مکمل ہوئے۔ ایک بات بہرحال ثابت شدہ ہے کہ اگر کوئی

KitaabPoint.blogspot.com

انچارج افسر فلاح و بہبود کے کام کرنا چاہے تو اس کے لیے رکاوٹ نہیں وہ اگر حکومت کر سکتا ہے تو خدمت بھی کر سکتا ہے۔ ان دونوں سے گزارش ہے کہ وہ ایک دفعہ ضرور ڈپٹی کمشنر بنیں اور میرے اور لیاقت کے ضلع میانوالی میں بنیں۔ یہ ضلع اب بھی تک وہی ہے جہاں قیام پاکستان کے وقت تھا۔ میں نے اب سے پچیس برس پہلے شہر کا جو منظر دیکھا وہ اب تک نہیں بدلا۔ ایک ادبی محفل میں تقریر کرتے ہوئے ایک ڈپٹی کمشنر نے بڑے افسروں سے کچھ وعدے کئے ہیں۔ مگر لوگوں کو محکوم ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ غیریت کے احساس کو دور کرنے میں کئی اور افسر بھی کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے دفتر میں غیر دوستانہ فضا کا احساس نہیں ہوتا۔ طارق محمود اور سعید ظفر کے نام اس ضمن میں لیے جا سکتے ہیں۔

کب ایسا ہوگا کہ لیاقت نیازی موجودہ انتظامی ڈھانچہ میں بہتری کے آثار کے بارے میں تقریر کرے گا۔ ایک بات محل نظر ہے کہ یہ سب لوگ افسر ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب بھی ہیں۔ لیاقت نیازی علمی آدمی ہیں انہوں نے اسلامی فقہ کے حوالے سے پی ایچ ڈی کی ہے۔ انتظامی امور سے منسلک لوگوں کے لیے ضروری ہو کہ وہ ذوق والے ہوں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

الف ننگے

آج کل میں جن کاموں میں پھنسا ہوا ہوں' اپنے تجربات لکھ دوں تو مجھ پر بھی فحش نگار ہونے کا الزام لگ جائے گا۔ مثلاً مکان بنانا' حلقہ چلانا اور کالم لکھنا' اگر آدمی ذرا سی ہمت کرے تو ہر کام میں فحاشی تلاش کی جا سکتی ہے۔ جوئندہ یابندہ..... منٹو کا نام آئے اور فحاشی کا ذکر نہ ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ پھر یہ سوچنا بہر حال ٹھنڈے دل سے ضروری ہے کہ اس کے افسانوں کے بعد ہمارے ہاں یہ بحث تیزی سے اور بلند آواز سے آغاز ہوئی تھی اور ظاہر ہے اس کا انجام ابھی نہیں آیا۔ انجام کیا ہوتا ہے۔ یہ ہم نے کبھی سوچا نہیں۔ ہم اس بارے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں کہ فلاں چیز شروع کیسے ہوئی۔ ہم چاہتے بھی ہیں کہ بس کوئی چیز شروع ہو جائے ختم ہو یا نہ ہو اور خواہ ہمیں ہی ختم کر دے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم خود اپنے آپ کو ختم ہونے دیں۔ پھر ہم ذرا جلدی اور کچھ اچھی طرح شروع ہو سکیں گے۔ ہمارا پرابلم یہ ہے کہ وہ کچھ ہمارا پرابلم ہے جو سرے سے پرابلم ہی نہیں۔ ہماری جو بے عزتی قومی حوالوں سے بین الاقوامی منظر نامے میں ہو رہی ہے ہمیں اس کا احساس ہی نہیں۔ عزت نیلان کرنے والیاں ہمیں نظر آتی ہیں۔ قومی عزت داؤ پر لگانے والے دکھائی نہیں دیتے۔ ہم اس کی خبر ضرور رکھتے ہیں کہ فلاں محلے میں عصمت فروشی ہو رہی ہے مگر فلاں محلے میں کپڑے نہ ہونے کی وجہ سے بچیاں ننگی پھرتی ہیں ہم فوراً لاعلم بن جاتے ہیں۔ ہماری سوئی آخر ایک ہی نقطے پر کیوں اٹک جاتی ہے۔ اب تو شاید سوئی ٹوٹ چکی ہے۔

چوبرجی سے سمن آباد کی طرف جاتے ہوئے ایک ملنگ مجذوب الف ننگا لیٹا رہتا ہے۔ ہم اسے دیکھتے ہوئے محسوس نہیں کرتے اور اکثر بغیر دیکھے گزر جاتے ہیں۔ البتہ یہ سن کر میرے ایک دوست نے بڑے اصرار سے پوچھا کہ یار وہ اس وقت بھی وہاں لیٹا ہو گا۔ نجانے اسے اس ننگے ملنگ سے کیا کام تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر منٹو ہوتا تو دونوں میں سے کسی کے بارے میں افسانہ لکھتا۔ اگر یہ فحاشی ہی ہے تو اس کے پیچھے ایک اسرار ہے ایک فطرت ہے۔ کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور ہے۔ منٹو ننگے پن کے سامنے پردہ داریوں کو دیکھ لیتا تھا اور پردوں کے پیچھے بے پردگیوں کو بھی سونگھ لیتا تھا۔ ننگے پن اور بے پردگی میں ایک بڑا فرق ہے اور ایک ہلکی سی مماثلت بھی ہے۔ اس راز کو جان لینا ہی منٹو کا جرم بن گیا تھا۔ ہمارے ہاں راز کو فاش کرنا بھی فحاشی کی ذیل میں آتا ہے۔ کچھ راز تو بہر صورت فاش ہونے چاہئیں۔ انہیں چھپانا فحاشی ہے ورنہ رازوں کی حفاظت حضرت علی کے بقول بہادر انسانوں کا شرف ہے۔ اب تو راز اور شرف اور بہادری پرانی باتیں ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

پرانے لوگ بتاتے ہیں کہ ہم جوان ہو کر بھی اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ ہم آج اپنی بچیوں کو بچوں سے نہیں کھیلنے دیتے۔ بچوں کی گالی ہماری گالی سے بھی موٹی ہوتی ہے اور بچیاں اپنی ماؤں سے زیادہ سیانی اور باخبر ہیں۔ ہمیں یہی باخبری لے ڈوبی ہے۔ ایک خوبصورت زندگی بسر کرنے کے لیے بہت سی بے خبری اور لاعلمی ضروری ہے۔ مگر ہم جاہل کہلوانا پسند نہیں کرتے جبکہ جہالت یہی ہے۔ دیہاتوں میں آج بھی مخلوط اکٹھ ہوتے ہیں جسے شہری لوگ مکس گیدرنگ کہتے ہیں۔ دیہاتی عورت ہر معاملے اور ہر مسئلے میں مرد کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ ہم تو عورت اور مرد کے شانہ بشانہ چلنے کے مطالبے کرتے رہتے ہیں مگر جو لوگ اس پر عمل کرتے ہیں ہم انہیں گنوار سمجھتے ہیں اور انہیں بنیادی سہولتیں ہی فراہم کرانے کے لیے کوئی مطالبہ تک نہیں کرتے۔ شہروں میں صرف آزادیٔ نسواں کی انجمنیں بنا کر اخباروں میں تصویر چھپوا لینے کو ہی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ یہی عورتیں جو مرد کے استحصال کی سب سے بڑی مخالف ہیں' اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ کتنی عورتیں ہیں جو اس لیے بڑی شاعرہ ہیں کہ وہ واقعی شاعرہ ہیں۔ مرد بے چارے کو الو بھی بناتی ہیں اور اپنا الو بھی سیدھا کرتی ہیں۔ کچھ افسر اور لیڈر قسم کی عورتوں نے واقعی فحاشی کی ہوا دی ہے بلکہ ''آندھی'' دی ہے۔ ان پر تو مقدمہ چلتا نہیں جن پر چلنا چاہیے مگر اس طرح کی باتیں منٹو یا منٹو سے پیار کرنے والے کر دیں تو بغیر مقدمہ چلائے جیل بھجوا دیا جاتا ہے۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ منٹو اس چیز کو جائز سمجھتا تھا کہ بسوں میں لڑکے لڑکیوں کو ضرور چھیڑیں۔ منٹو کے بعد بھی یہ چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے۔ کچھ لڑکیاں خود یہ چاہ رہی ہوتی ہیں بلکہ ''زبان جسم'' سے للکار للکار کر کہہ رہی ہوتی ہیں۔ ہمیں چھیڑو..... چھیڑو نا..... اب ایسے حال میں حکم کی تعمیل کرو تو بھی مجرم نہ کرو تو بھی مجرم۔ سو بہت سے نوجوان لڈو کھا کے ہی پچھتانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ منٹو نے یہی لڈو عام لوگوں میں تقسیم کر دیئے اور اب بھی لوگ اس رسوائی کی کمائی کھا رہے ہیں۔ منٹو کو گالیاں نکالنے والے چپکے سے کہتے ہیں کہ اس کا کوئی افسانہ ہمیں چکھاؤ تو سہی۔ یہ جو فحاشی ہے' اصل میں یہی منافقت ہے۔ منافقت ہمارے اندر ہمارے گھر اور ہمارے معاشرے میں ایک دائرے کی طرح گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ہم بہت ماڈرن' ایڈوانس اور لبرل بنتے ہیں۔ دوستوں کی محفل میں کیسی کیسی لڑکیوں' عورتوں کی باتیں کرتے ہیں مگر اس بات کو برداشت نہیں کرتے کہ ان لڑکیوں میں ہماری بہن یا بیٹی کا ذکر ہو۔ ہمارے گھروں میں ٹی وی ہے۔ ہم اپنی بیٹی اور بہن کے ساتھ انڈین فلم دیکھنے سے کتراتے ہیں۔ ثقافتی یلغار سے گھبرانے والے تہذیب و فن کے ہر میدان میں اپنی لشکر کشی سے باز نہیں آتے۔ ہمارے خوف اور خواہش کی کشمکش نے ہمیں بزدل' منافق اور شکی مزاج بنا دیا ہے۔ ہم اپنے لیے اور دوسروں کے لیے الگ الگ پسند و ناپسند کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ الگ الگ پسند و ناپسند والوں کے تاثرات دیکھئے۔ نتیجہ آپ خود نکال لیں۔ وہ لڑکی بائے کیا شے ہے۔ آدمی کے اندر شور مچتا ہے کہ بس اسے

KitaabPoint.blogspot.com

پے جائے'' دوسرا آدمی بولا ''استغفراللہ'' تیسرے نے کہا ''آدمی کا دل کہتا ہے کہ اسے یہیں لٹا کر اس کے اوپر نماز پڑھی جائے'' اس بارے سروے کیا گیا کہ فحاشی کہاں ہے تو استغفراللہ کہنے والے کے لیے زیادہ ووٹ آئے۔ مجھے اسے جمہوری فیصلے پر اعتراض نہیں۔ مگر کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے اپنی کھلی برائی پر پردہ ڈالنے کے لیے اچھے لوگوں پر کیچڑ تھوپنا شروع کر دیا ہے۔ یہ اچھے لوگ بھی فتوے لگانے میں وہی طریقہ اختیار کرتے ہیں جو کیچڑ تھوپنے والے کرتے ہیں۔ کام ایک ہی ہے یہ ظلم نہیں کہ مرد کچھ کرے تو مردانگی ثابت ہو' عورت سے ہو جائے تو اسے زندہ رہنے کی اجازت ہی نہ ملے۔ عام آدمی کرے تو کرتا رہے' کسی اچھے آدمی سے سرزد ہو جائے تو طوفان کھڑا ہو جائے۔ یعنی سزا گناہ کی نہیں ملتی' آدمی کی حیثیت کو ملتی ہے۔ یہ دوغلا پن ہے۔ فحاشی دوغلا پن کا دوسرا نام ہے۔

میرے گاؤں سے کچھ لوگ لاہور آئے۔ انارکلی سیر کو نکلے۔ وہاں مہکتی ہوئی اور بہکتی ہوئی ٹھمرتی ہوئی اور بکھرتی ہوئی عورتوں کو دیکھا تو حیران ہوئے پھر پریشان ہو گئے۔ پوچھا تو بتایا کہ ''اوئے رناں تاں اج ڈٹھیاں نیں۔ اساں تاں کھوتیاں نال نکاح پڑھایا ہویا اے'' (عورتیں تو ہم نے آج دیکھی ہیں ہم نے تو گدھیوں سے شادی کر رکھی ہے) اس واقعے کی تشریح کبھی ہو جائے گی اور بات سیاسی میدان سے ہوتی ہوئی معاشی اور انقلابی میدان میں چلی جائے گی۔ یہ فقرہ فحاشی کے زمرے میں لکھا جائے گا۔ اور اگر میرا وہ گرائیں مشتعل ہو کر کوئی حرکت یا عملی کارروائی کر بیٹھتا تو بات اتنی آگے نہ بڑھتی۔ ممکن وہ لڑکی اپنے مرعوب کر دینے والے میک اپ اور مصنوعی حسن کا چرچا اپنی سہیلیوں میں کرتی۔ منٹو تو سہیلیوں میں کہی گئی بات بھی اپنے اندر کہیں سن لیتا تھا۔

ایک فلم ایکٹریس کے گھر کچھ نوجوانوں نے ڈاکہ ڈالا تھا اور غیر قانونی کام کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ غیر شرعی کام بھی کر دیا تھا۔ دوسری اداکارائیں کئی مہینوں تک اس اداکارہ سے رشک بلکہ حسد کرتی رہیں۔ یہی جذبہ حسد منٹو کے افسانوں کا موضوع بھی ہے۔ وہ عورتوں کو گدھیاں بنتے اور گدھیوں کو عورتیں بنتے دیکھ لیتا تھا۔ منٹو اپنے افسانوں کے حوالے سے شہر سے باہر زیادہ نہیں نکلا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بھی اوروں کی طرح یہ سمجھتا تھا کہ سب کچھ صرف شہروں میں ہو رہا ہے۔ دیہاتوں میں کھلا ڈھلا ماحول ہے۔ ایک خاص طرح کی تہذیب اور رہن سہن ہے مگر وہاں بھی عشق معشوقیاں اور گٹ مٹ ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں ابھی اتنی منافقت اور بزدلی نہیں۔ اور ابھی تک کچھ نہ کچھ اجتماعی زندگی کا تصور ہے۔ غیرت جوش مارے گی تو پھر سیدھی گولی۔ وہ گول مول بات کے قائل نہیں۔ ان کی عورتیں چکر و کر نہیں جانتیں۔ گاؤں میں آپ کسی اکیلی عورت سے بات کریں۔ وہ کسی کمپلیکس کے بغیر آپ سے مخاطب ہو گی۔ وہ اگر آپ کو اپنے گھر لے جائے چائے لسی پلائے تو بھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو گا۔ مگر یہاں کسی راہ چلتی لڑکی سے رستہ پوچھ کر تو بتائیں۔ جواب میں تھپڑ' ہنگامہ' تماشہ اور کوئی سکینڈل۔ اصل مقصد یہی سکینڈل ہے تاکہ بلیک میل کیا جا سکے۔ آزادی نسواں کی

KitaabPoint.blogspot.com

ٹھیکیدار عورتوں نے جتنا بے چارے مرد کو بلیک میل کیا ہے' مرد نے اس کے مقابلے میں عورت کا استحصال نہیں کیا ہے۔ ماڈرن زندگی کے ادھورے اور کچے معاشرے میں رہنا ہی فحاشی ہے اور اس طرح کی صورت حال میں منٹو جیسے فحش نگار کا ہونا بہت ضروری ہے۔ جتنا اب ضروری ہے کبھی نہ تھا۔

منیر نیازی کی یہ بات مضمون کے آغاز ہی سے یاد آ رہی ہے۔ وہ ایک دن کہنے لگا کہ میرے گھر میرے دوست آئیں تو میری بیوی انہیں چائے وغیرہ پیش کر دیتی ہے مگر ایک مشہور افسر شاعرہ کہیں سے آ جائے تو میں اس سے اپنی بیوی کا پردہ ضرور کرواتا ہوں۔ یہ بات بہت خوبصورت اور معنی خیز ہے البتہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ منیر اور شاعرہ میں سے فحاشی کا مرتکب کون ہوا ہے۔ اس ایک فقرے کو اگر منٹو واقعے یعنی افسانے میں تبدیل کرتا تو ایک اور مقدمہ بھگتاتا۔ میرے نزدیک فحاشی یہ ہے کہ جب کوئی عورت زبردستی مرد بننے کی کوشش کرے یا مرد اسے عورت کے علاوہ کچھ اور سمجھ بیٹھے۔ منٹو اس وقت ایسی عورتوں اور مردوں کو تلاش کرنے میں مشکل پاتا ہوگا۔ اب یہ مخلوق عام ہوگئی ہے۔ اس لیے ہمارے ہاں کوئی اور منٹو نہیں پیدا ہوا ہے۔ منٹو نے سامنے سے نظر آنے والے مردوں اور عورتوں کے پس منظر میں چھپی اصل مرد عورت کو بہلا پھسلا کر اور کبھی ڈرا دھمکا کر اور کبھی باقاعدہ پھینٹی شینٹی لگا کر ظاہر کر دکھایا۔ انسان کی اصل بری نہیں۔ کبھی کبھی نیت بری ہو جاتی ہے۔ بری حرکت سے بری نیت زیادہ بری اور خطرناک ہے۔

منٹو نے بڑے بڑے آدمیوں میں سے بھی اصل انسان کو برآمد کیا اور اسے ہم سے متعارف بھی کرا دیا۔ قائداعظم کا خاکہ لکھتے ہوئے وہ عظمت کے ساتھ صرف عقیدت ہی کا جذبہ بیدار نہیں کرتا۔ اس محبت کو بھی تخلیق کرتا ہے۔ جو ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے۔ قائداعظم جیسا کوہسار صفت انسان اپنی روٹھی ہوئی بچی کے صندوق کو کھول کر اس کے ننھے ننھے کپڑے دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتا ہے۔ قائداعظم کا کوئی سپیشلسٹ یہ بات ہرگز بیان نہیں کرے گا۔ وہ تو صرف یہ بتائے گا کہ قائداعظم نے اپنی نافرمان بیٹی کو گھر سے نکال باہر کیا۔ اور پھر فضا میں قائداعظم زندہ باد کے نعرے گونجنے لگ جائیں گے۔ ہم ایک عام نارمل آدمی کو درخود اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ بس کوئی غیر معمولی بات ہونی چاہیے۔ کوئی ان ہونی بات۔ منٹو نے اس احساس پر کاری ضرب لگائی۔ جیتے جاگتے آدمیوں کو ان مسئلوں اور معاملوں کے ساتھ پیش کیا۔ اس نے ہمیں دوسرے فنکاروں کی طرح آئینہ نہیں دکھایا۔ ہمیں ایک دوسرے کے سامنے آئینہ کر دیا ہے۔ اب اس میں اس کا کیا قصور کہ کچھ آئینے زیادہ شفاف ہو گئے ہیں اور کچھ ٹوٹ بھی گئے ہیں۔ کوئی کرچی اٹھا کے دیکھئے شاید اس پر آپ کا ہی نام لکھا ہو۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

فتح مند لہو میں ڈوبے ہوئے

تاریخ کے قدیم و عظیم تسلسل میں افغانستان کی صورت حال نہ نئی ہے نہ پرانی۔ غیرت ایمانی اور حریت جاودانی کے لیے انسانیوں نے بالعموم اور مسلمانوں نے بالخصوص قربانیوں کے ڈھیر لگا رکھے ہیں۔ پہلا شہید کون تھا' آخری کون ہوگا۔ اس کے لیے شمار اور معیار کی بات ہی بے معنی ہے۔

تاریخ و تہذیب ایثار اور جہاد کے اس مقام پر ہمیشہ شادماں و کامراں ہی دکھائی دیتی ہے۔ افغانستان میں جو جنگ لڑی جا رہی ہے۔ وہ فلسطین' کشمیر اور ویت نام سے مختلف نہیں۔ مگر اس وقت جانباز ساعتوں کے درمیان افغان مجاہدین کا انداز کچھ اور طرح سے دلگداز ہے۔ جس بھی خطہ غیرت پر خون بہتا ہے۔ وہ دنیا کے نقشے پر کسی چمکدار منظر کی طرح نمودار ہوتا ہے۔ یہ ہوتا ہے دوسری بار عمل میں آنے کا عمل' یعنی اپنے ملک پر اپنے ملک کو دوبارہ قائم کرنے کی تحریک۔

علامہ اقبال نے جن کو اوغافل افغان کہا تھا۔ انہوں نے اپنی خودی پہچان لی ہے۔ وہ جہاں بھر کے تمام حریت پسندوں کی پہچان بن رہے ہیں۔ وہ کائنات کو ایک اور زندہ چہرہ عطا کر رہے ہیں اور زندگی کو ایک نیا نام۔ میرے خیال میں ان دنوں عالم جدوجہد میں مسلم افغانیوں سے زیادہ پرجلال جانفشانیوں جیسی مثال تو دکھائی دیتی ہے۔ مگر کم کم۔ بے ارادہ نگاہ ایرانیوں کی طرف اٹھتی ہے۔ اور ہندوستان کے نومسلم ہریجنوں کی طرف اور سکھوں کی طرف۔ یہ سب اپنے دین کو اپنا آئین بنانے کی تیاریاں ہیں۔ زندگی کو شرمندگی اور درندگی سے بچانے کے لیے جس راستے پر انسان چل نکلے ہیں' وہ ان کا دیکھا ہوا ہے۔ ایسے میں سرزمین پر اپنی سرزمین بچھانے کو بے تاب ہیں۔ وہ اپنے نظریئے کو نظر بد سے بچانے کی جانگدار کوشش میں ہیں۔ اس سے بڑا ظلم کوئی ہوگا کہ کوئی کسی سے اس کی مٹی چھین لے اور پھر اسے اپنے رنگ میں رنگنے کی زبردستی کرے۔ ثابت قدمی کے تمام معرکوں میں بکھرتی ہوئی لہولہان مٹی ان طائروں سے زیادہ دلنواز ہے جو زخمی ہو کر بھی اڑتے رہنے کی لازوال خواہش کے ہمسفر رہتے ہیں۔

سرخ رنگ کے شیدائیوں کو کیوں دکھائی نہیں دیتا کہ افغان مجاہدین کے خون کا رنگ بھی سرخ ہے۔ رنگوں کی نمائش کے رسیا کیا نہیں جانتے کہ سب رنگ فطرت کے ہیں۔ فطرت اللہ کی مظہر ہے۔ ہر سمت میں اس کی حکمرانی ہے اور حکمرانی ہے ان کی جو حق کے لیے لڑتے ہیں۔ حق جو سچائی ہے' حق جو استحقاق ہے' اس طرح لڑنا شاید امن پسندی کی رفیع الشان مثال ہے۔ مجھے تو لگتا ہے جیسے وہ

KitaabPoint.blogspot.com

ہماری لڑائی لڑ رہے ہیں۔ اور تاریخی و تہذیبی صورت حال کے حوالے سے یوں وہ سب کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ کبھی ایک انسان ساری انسانیت کا ترجمان بن جاتا ہے اور کہیں ایک قوم سب قوموں کی نمائندگی کرنے لگتی ہے۔

ظلم روس اور امریکہ کی طرف سے ہو یا کسی بھی طاقت کی طرف سے اسے ظلم ہی کہا جائے گا۔ اس کی مذمت نہ کرنا بجائے خود ایک مذموم فعل ہے۔ بہادروں کی تعریف کرنا بھی بہادری ہے۔ ظلم کے خلاف چپ رہنا بھی ظلم ہے۔ گھٹیا درجے کا ظلم۔ آؤ اللہ اور اس کے رسول کا نام لے کر دنیا جہان کے ہر طرح کے ظالموں پر لعنت بھیجیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں افغان مجاہدین یا کہیں بھی جدوجہد کرنے والوں کو مظلوم سمجھتا ہوں۔ وہ زندہ تر اور پائندہ تر ہیں۔ ابھی کچھ بعد افغانیوں کا رقص بسمل ان کے روایتی بھنگڑے میں مل جائے گا۔ تمام انسانوں کے لیے جسم و جان اور خاک و آفاق کی آزادی اور عالمی مسرت کا یہ رقص حریت مبارکباد کا منتظر ہے۔ اور مضطرب بھی۔ تب ایک بار بھی انقلاب کی تازہ اور مکمل معنویت ایک اور شان سے خوابوں اور کتابوں میں تحریر ہوگی اور فتح مند لہو میں ڈوب کر ابھرنے والوں کے لیے آرزو رنگ لفظ اپنی سرمستی میں سرشار ہو چکے ہوں گے۔ اقبال نے یہ بھی کہا تھا۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں

اب خورشید نصف النہار پر آ کھڑا ہے۔ ایک دن یہ سوا نیزے پر بھی آنے والا ہے۔ ظلم کا انجام ایک بڑا ظلم ہے۔ شہیدوں کے لیے اجر خود ان کی موت ہے۔ جو زندگی ہی زندگی ہے۔ قریہ عشق محمد میں رہنے والوں سے یہ دنیا تو چھینی جا سکتی ہے۔ وہ دنیا ان سے کون چھین سکتا ہے۔

جب روس افغانستان سے چلا جائے گا تو خطرہ ہے کہ افغان ایک دوسرے کو خلاف صف آراء ہو جائیں بلکہ صفیں توڑ کر ایک دوسرے سے لڑیں گے۔ کیا اس جنگ کو بھی جہاد کہا جا سکے گا۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

ٹیسٹ کرکٹ اور ہماری سیاست

مرحوم صدر ضیاء الحق کے زمانے میں کرکٹ ڈپلومیسی ایک سیاسی اقدام اور سیاسی اصطلاح کے طور پر معروف ہوئی۔ لگتا ہے جیسے کرکٹ اور ہماری سیاست میں بہت ساری مطابقتیں ہیں۔ آج کل ہمارے ہاں سیاسی صورت حال ٹیسٹ کرکٹ سے بہت ملتی جلتی ہے۔ دو سیاسی ٹیمیں میدان میں ہیں۔ محاذ آرائی زوروں پر ہے۔ مگر اب تک ہار جیت کا فیصلہ نہیں ہو پا رہا۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان چار ٹیسٹ کرکٹ میچ ہو چکے ہیں مگر چاروں میچوں کے بعد کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ بھارت اور پاکستان کی تاریخ میں بھی ابھی تک کوئی فیصلہ کن گھڑی نہیں آئی۔

کرکٹ کا کھیل مغرب کا ایک تحفہ ہے۔ مگر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اصل میں یہ گلی ڈنڈے کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہ بات کسی حد تک قرین قیاس بھی ہے مگر اسے ثابت کرنا بے فائدہ ہے کیونکہ ہمارے دیہاتوں میں اب گلی ڈنڈے کا رواج بھی ختم ہو گیا ہے۔ وہاں بھی اب ٹی وی ہر گھر میں موجود ہے۔ انٹرنیشنل کرکٹ کی طرح ہم اگر چاہیں تو دوسرے شعبوں اور میدانوں میں بھی اپنی برتری منوا سکتے ہیں مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ طلوبہ شعبے میں ہمارے پاس عمران خان جیسا ایک نہ ایک آدمی ہونا چاہیے۔ عمران خان نے کرکٹ کو ایک وقار اور مقبولیت عطا کی ہے۔ محنت' استقامت اور دیانت سے اس نے یہ مقام حاصل کیا ہے کہ وہ زندگی ہی میں ایک لیجنڈ بن گیا ہے۔ عمران خان نے پاکستان کا نام بلند کیا ہے۔ اس کے ساتھ لوگوں کی بے مثال محبت میں اس جذبے کو بھی بڑا دخل ہے۔

ایک زمانے میں کچھ ایسی ہی محبت محمد علی کلے کے ساتھ وابستہ ہوئی تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ اسلام کا نام لیتا ہے۔ ورنہ باکسنگ ایسا کھیل نہیں کہ اس میں کس طرح کی کشش محسوس ہو۔ کچھ قوموں کے لیے باکسنگ اب بھی ایک اہم کھیل ہے مگر پاکستانیوں کی رغبت اس ضمن میں اس طرح ختم ہوئی ہے جیسے یہ کوئی دیکھنے کی چیز ہی نہیں۔ ہمیں اب بنفس نفیس ایک دوسرے کے ساتھ مکہ بازی میں مزہ آتا ہے۔

کرکٹ میں چونکہ ون مین شو زیادہ ہوتا ہے۔ ٹیم ورک کے باوجود ایک باؤلر اور بیٹسمین ساری توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ میچ کا کوئی فیصلہ ہو یا نہ ہو۔ مین آف دی میچ کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ پانچویں دن جب یہ طے ہوتا ہے کہ اب ہار جیت کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ میچ

KitaabPoint.blogspot.com

پھر بھی جاری رہتا ہے۔ رنز بنیں نہ بیں کوئی آؤٹ ہو نہ ہو میچ چلتا رہتا ہے۔ یہاں یہ بات ایک لمحہ فکریہ ہے کہ انگلستان میں بالعموم ایسی وکٹیں بنائی جاتی ہیں کہ اکثر و بیشتر میچ کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ آخر ہمارے ہاں ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ یہ کام عمران خان بھی نہیں کرا سکا۔ وہ کسی حد تک اس سلسلے میں تو کامیاب ہوا ہے کہ مستحق نوجوانوں کو ٹیم میں شامل کیا جائے ورنہ کسی میدان میں کسی شعبے میں بھی ابھی تک وہ لوگ نہیں ہیں جو واقعی اہل ہیں اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں کو عدم فیصلہ کی کیفیت میں مبتلا رکھا جاتا ہے۔ ٹیسٹ کرکٹ میچ ہو رہا ہے۔ لوگ پریشان ہیں کہ پانچ روزہ ٹیسٹ کی طرح یہ سیاسی میچ بھی کہیں پانچ سال اسی انداز میں نہ چلتا رہے اور آخر میں پتہ چلے کہ ہم وہیں ہیں جہاں پانچ سال پہلے تھے اور پھر سیاسی ٹیسٹ میچ نئے سرے سے شروع ہو جائے۔

میری عمران خان سے گزارش ہے کہ اس نے کرکٹ میچ کو جو دلکش اسلوب سے نوازا ہے اس حوالے سے بھی کوئی انقلابی کام کر جائے کہ ٹیسٹ کو ایک نیا زمانہ ملے۔ اگر ایسا ہو کہ ٹیسٹ میں بھی دونوں ٹیمیں ایک ایک اننگز کھیلیں تو اس صورت حال میں کم از کم فیصلہ تو ہو جایا کرے گا ورنہ ٹیسٹ کرکٹ میں لوگوں کی کم ہوتی ہوئی دلچسپی کو بحال کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔

ہمارے ہاں جمہوری عمل اور سیاسی عمل کی موجودہ روش میں بھی لوگوں کی دلچسپی خطرناک حد تک ختم ہو رہی ہے۔ ایک طرح کے مخالفانہ بیانات ایک طرح کی سازشیں ایک طرح کی مفاد پرستانہ چالیں اور ایک طرح کی تقریریں سن سن کر لوگ بیزار ہو رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سیاسی میچ تو ہوتا رہے اور دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔ سیاسی میدان میں بھی جمہوری عمل میں بھی انقلابی اقدامات کی ضرورت ہے۔ اب وہی ہیرو ہو گا جو کچھ نہ کچھ خلاف توقع کر گزرے گا۔ مین آف دی میچ کو اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے اس دن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ جب میچ کے انداز و اطوار بدلیں گے اور فیصلہ کن نتیجے کے لیے سب شرکاء پورے خلوص کے ساتھ آمادہ ہوں گے۔ اس سلسلے میں امپائر کی نیت اور دیانت بھی بڑی اہم ہے۔ آخر میں عمران خان سے گزارش ہے کہ یہ کارنامہ بھی وہ سرانجام دے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف سے صرف اتنا کہے کہ وہ سیاسی میدان کو کھیل کا میدان بنا دیں مگر میدان جنگ نہ بنائیں۔ عمران کان بے نظیر بھٹو کے ساتھ آکسفورڈ میں پڑھتے رہے ہیں۔ نواز شریف کے ساتھ کرکٹ کھیلتے رہے ہیں۔

نواز شریف وزیر اعظم بن گئے تو بھی باغ جناح میں کرکٹ کھیلنے آتے رہے۔ یہ بھی سپورٹس مین سپرٹ کی بات ہے۔ وہ سیاسی میدان میں بھی ایک اچھے کھیل ماحول پیدا کریں۔ انہوں نے ایک بار 49 رنز بنائے تو کہا گیا کہ انعام باؤلر کو ملنا چاہیے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

محمد نقوش کا سفر آخرت

ہم اپنے آپ پاس شکایت کے طور پر یا رسماً کبھی کبھی یہ جملہ سنتے رہتے ہیں کہ یہ قحط الرجال کا دور ہے مگر اس دوران کوئی نہ کوئی ایسا آدمی ہمارے درمیان سے اٹھ جاتا ہے کہ سب لوگ حیران سے ہو جاتے ہیں اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہو نہ ہو اپنے مخصوص میدان کا یہ وہی آدمی ہو جس کے نہ ہونے کا ہم ماتم کر رہے تھے۔ ہر دور میں ہوتے ہیں ایسے آدمی جو ہمارے درمیان نہیں رہتے تو ان کی کوئی نہ کوئی بڑائی ہم پر منکشف ہوتی ہے۔ کوئی زمانہ بھی اتنا گیا گزرا نہیں ہوتا۔ طفیل صاحب ایک ایسے ہی آدمی تھے جن کی موت نے ان کے کمالات کے پہاڑ ہمارے سامنے لا کھڑے کئے ہیں۔ اتنی طویل اور گہری جدوجہد کرنے والے آدمی واقعی کم کم ہوتے ہیں۔ انہوں نے میدان ادب میں جو نقوش چھوڑے ہیں انہیں کوئی مٹا نہیں سکتا اور ابھی ان کے نقش قدم پر چلنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ اس طرح کا آدمی جب بھی مرتا ہے تو لگتا ہے جیسے اب کوئی نہ آئے گا پھر کوئی آدمی پیدا ہو جاتا ہے مگر وہ اس جیسا تو نہیں ہوتا۔ پھر اس شخص جیسا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ ہر شخص میں کچھ نہ کچھ ایسا ہوتا ہے جو کسی میں نہیں ہوتا اسی کو انفرادیت کہتے ہیں۔ یہ ایک تسلسل ہے جو ٹوٹتا نہیں۔ طفیل صاحب جیسی مثال مشکل ہے پیدا ہو گی بے مثال آدمی ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے۔

تاریخ ادب میں شاعر ناول نگار نقاد کے طور پر ایک لمبی فہرست بنائی جا سکتی ہے مگر ایک رسالے کے مدیر کی حیثیت سے بہت مختصر فہرست بنائی جا سکتی ہے۔ فہرست جو بھی ہے اس میں سرفہرست طفیل صاحب کا نام ہو گا۔ ادبی رسالہ ان کی پہچان بن گیا تھا لوگ انہیں محمد نقوش کہنے لگے تھے۔ ناشر کی حیثیت سے بھی ان کے مقابلے کے لوگ کم کم ہیں۔ خاکہ نگاری کے حوالے سے بھی ان کا اپنا ایک مقام ہے۔ طفیل صاحب کے کام کا کوئی محقق ہی جائزہ لے سکتا ہے۔ مقام شکر ہے کہ ان کی زندگی میں ان کے بارے میں ایک مکمل کتاب ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے تحریر کر کے شائع کرا دی۔ یہ کتاب طفیل صاحب کے اعتراف کا ایک بڑا اظہار ہے اور ہم سب کی طرف سے ایک طرح کا خراج تحسین ہے کسی بھی شخص کی زندگی میں اس طرح کی کتاب ایک اچھی روایت ہے۔ یہ کتابیں حیات جاوید کا موجب ہوتی ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے ہم عصر اور ہم عمر لوگوں کو اختلاف بھی تھا مگر سچا اختلاف رشتے کے رستے میں دیوار نہیں بنا کرتا۔ ہمارے علمی ادارے مرنے کے بعد آدمی کے بارے میں تحقیق کی اجازت مرحمت فرماتے ہیں۔ اردو ادب کے کسی موضوع پر تحقیق کرنے والا طفیل صاحب سے ملاقات کئے بغیر کسی سمت آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہ تجربہ مجھے بھی ہوا میں نے بیسویں صدی

KitaabPoint.blogspot.com

کے ایک بڑے مستعد صحافی ادیب شاعر مورخ وسوانح نگار محمد الدین فوق پر کام شروع کیا تو ڈر تھا کہ ان پر زیادہ مواد نہیں ملے گا ''نقوش'' کے مختلف شمارے پھر سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ جا بجا فوق کا تذکرہ بکھرا پڑا ہے۔ یہ کوئی رسمی بات نہیں کہ اپنے خاص میدان میں طفیل صاحب کا کوئی متبادل نہیں۔

طفیل صاحب کی نماز جنازہ کے ساتھ ہی ایک عورت کا جنازہ بھی پہنچ گیا مگر صفیں ٹوٹ گئیں۔ ہماری صفیں اتنی جلدی کیوں ٹوٹ جاتی ہیں۔ لوگ ادھر ادھر گپ شپ میں لگ گئے۔ میرے بائیں طرف علی اکبر عباس کھڑا تھا اور دائیں طرف اگلی صف میں جاوید طفیل نظر آ رہے تھے۔ دو چار اور بھی ادیب و شاعر ہوں گے۔ نماز کے بعد پتہ چلا کہ گورنر پنجاب مخدوم سجاد حسین قریشی نے اس گمنام عورت کی نماز جنازہ بھی ادا کی اور اس کے جنازے کو کندھا دیا۔ سرکاری ڈیوٹی پر اور بھی آدمی تھے مگر قریشی صاحب کی شرکت اب ذاتی نوعیت کی بن گئی تھی۔ ہمارے اچھے انفرادی عمل اجتماعی عمل بننے کی قوت کیوں نہیں رکھتے۔ یہ ایک سیاسی عمل تھا تو یہ انداز سیاست عام کب ہوگا۔ کہتے ہیں یہ باتیں ان لوگوں نے صدر ضیاء سے سیکھی ہیں۔ اس بات کا علم سب لوگوں کو ہے مگر ان باتوں کے اثرات اور ثمرات عام لوتوں تک کب پہنچیں گے۔ ہمارے ہاں حقائق اور امیدیں ابھی تک ''مگر'' کے نرغے میں ہیں۔ یہ ''مگر'' طفیل صاحب کی موت پر بھی بری طرح یاد آ رہا ہے۔ ہماری سوگواریاں اور ناگواریاں ہم رنگ ہوئی جا رہی ہیں۔

صدر ضیاء نے طفیل صاحب کو اپنا ذاتی دوست کہا ہے۔ ملک کے سربراہ سے کتنے ہی اختلاف کیوں نہ ہوں وہ ملک کا سربراہ تو ہوتا ہے۔ اس کی طرف سے یہ فقرہ ہم سب کی عزت ہے۔ ہم باہر کے کسی ملک کے سربراہ کی طرف سے اس طرح کی بات کو سراہتے ہیں اور اپنے ملک میں تھوڑی سی کشادگی کا مظاہرہ نہیں کر پاتے۔ ہمارے ہاں بڑا بڑا ادیب و شاعر و فنکار فوت ہوا مگر ایوانوں کی طرف سے حرف تعزیت اڑتا ہوا بھی کبھی کسی تک نہ پہنچا حکومت نے طفیل صاحب کی مساعی جلیلہ کو سراہا۔ انہیں نوازا اور یہ کوئی سیاسی سرگرمی نہ تھی ایسی کارروائی تھی جسے ادب برائے ادب کی ذیل میں رکھا جانا چاہیے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

قائداعظم کے جانشین کا المیہ

14 اگست 1947ء کو تحریک پاکستان اپنے معلوم مگر غیر متوقع نتیجے پر پہنچ گئی۔ پاکستان بن گیا اس طرح بنا کہ پھر پچیس سال بھی نہیں ہو پائے تھے کہ ٹوٹ گیا۔ پاکستان کے علیحدہ ہونے والے حصے کا نام بنگلہ دیش رکھا گیا کاش ایسا ہوتا کہ اس کا نام ہی نہ بدلتا' آخر مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی دو ملک رہے پھر آپس میں جڑ بھی گئے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان سے علیحدہ ہو کر بھی مشرقی پاکستان رہتا۔ اس طرح تو یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ مغربی پاکستان کو پاکستان کیوں کہنا شروع کر دیا گیا۔ شاید صرف مغربی پاکستان کی حکومت ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے لیے کافی تھی جس طرح مسلم لیگ کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور ہر ٹکڑے کو اصلی تے وڈی مسلم لیگ کہا گیا خدانخواستہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پاکستان کے مزید ٹکڑے ہو جائیں اور اس میں سے ایک ٹکڑے کو پاکستان کہہ دیا جائے آج کل سندھو دیش کے اندیشے ہماری پریشان فضاؤں میں گردش کر رہے ہیں۔

برصغیر کے تمام علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کی طرح میانوالی کے مسلمانوں نے بھی تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالستار خان نیازی کا نام نمایاں ہے ان کے علاوہ ملک امیر محمد خان سکندر خان بی اے امیر عبداللہ خان روکھڑی' امان اللہ خان' شیر مان خیل اور بہت سے لوگوں نے اپنی حیثیت میں اپنا کردار ادا کیا۔ سکندر خان بی اے کو قائداعظم کی حفاظت کرنے والے دستے کے سربراہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

جب تحریک پاکستان کے کارکنوں کی خدمات کے اعتراف کے طور پر تمغات دیئے جا رہے تھے تو اس سلسلے کا تصور پیش کرنے والے ڈاکٹر صفدر محمود کا خیال تھا کہ اس طرح تحریک پاکستان کی یاد نئی نسل کے دلوں میں نقش کی جا سکتی ہے۔ کچھ دل جلوں نے تو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ آخر کو پنجاب ہی کا نام پاکستان ہوگا۔

میانوالی کے جن تین آدمیوں کو تحریک پاکستان کے حوالے سے تمغہ خدمت عطاء کیا گیا ان میں مولانا عبدالستار خان نیازی' امیر عبداللہ خان روکھڑی اور سکندر خان بی اے شامل ہیں۔ سکندر خان بی اے کی بہادری اور دردمندی کی تعریف خود قائداعظم نے بھی کی تھی۔ مولانا عبدالستار خان نیازی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے قائداعظم کے ساتھ تحریک پاکستان میں حصہ لے کر میانوالی کا نام روشن کیا۔ سردار عبدالرب نشتر کے علاوہ عبدالستار خان نیازی کو بھی قائداعظم کا جانشین کہا جا سکتا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

قائداعظم کی وفات کے بعد لیاقت علی خان نے اپنے اقتدار کے استحکام کی خاطر مسلم لیگ کو ایک آلے کے طور پر استعمال کیا۔ کچھ ناراض مسلم لیگی لیاقت علی خان کو قائداعظم کی موت کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ آج کل جس ایم کیو ایم کا چرچا ہے اس کی بنیاد رکھنے والوں میں جنرل ضیاء الحق کا نام لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے چرچے ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ہونے لگ پڑے تھے۔ غوث علی شاہ کے بعد جنرل اسلم بیگ کا نام بھی اس سلسلے میں لیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے جام صادق صاحب سرفہرست ہوئے تو پھر نواز شریف صاحب بھی شامل ہوئے۔ بی بی بینظیر بھی ایم کیو ایم کی وجہ سے وزیراعظم بن پائیں۔ ان تمام نامی گرامی لوگوں کے علاوہ جس شخص نے اصل میں ایم کیو ایم کی بنیاد رکھی وہ لیاقت علی خان تھے۔ جب مہاجرین پاکستان آ رہے تھے تو اس وقت کے وزیراعظم لیاقت علی خان نے ان مہاجروں کو کو جو اردو بولتے تھے' کراچی میں آباد کر دیا۔ اس وقت بھی کچھ لوگ تھے جن کے ذہنوں میں مہاجر اسٹیٹ کا نظریہ کلبلا رہا تھا۔ مولانا عبدالستار خان نیازی نے لیاقت علی خان کی مخالفت حسب معمول جذبات میں آ کر کی۔ لیکن اس کا پس منظر بھی کچھ نہ کچھ تھا۔ اس کے بعد مولانا عبدالستار خان نیازی نے حکمرانوں کی مخالفت کرنا شروع کی تو کرتے ہی چلے گئے۔ جس حکمران کی حمایت مولانا نیازی نے کی تو وہ آدھے پاکستان کا وزیراعظم ہے۔ کاش وہ ان حکمرانوں میں سے کسی ایک کی کابینہ میں وزارت قبول کرتے جو پورے پاکستان کا وزیراعظم یا صدر تھا جبکہ ان میں سے بہت سے آدھے پاکستان کے وزیراعظم سے کم تر نہیں تھے۔ مولانا نیازی نے میانوالی کی سیاسی عظمت کا جھنڈا بلند رکھا' اور یہ وہ لیڈر ہے جس کی شہرت یہ رہی ہے کہ اس نے مفاہمت نہیں کی۔ سمجھوتہ نہیں کیا کوئی پیشکش قبول نہیں کی۔ مولانا نیازی نے عمر کے آخری حصے میں وہ کام کیا ہے جس کے لیے کوئی خاص جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ہم آج بھی اس شخص کی عزت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ اپنے رابطے کی وجہ عزت سمجھتے ہیں۔ اللہ کرے ان کی شخصیت پر کوئی داغ نہ آئے۔ اگرچہ اس کے خطرات بہت ہیں۔ میں نے ایک جگہ پہلے بھی لکھا تھا کہ یہ وزارت کے لیے عزت ہے کہ وہ مولانا نیازی کی جھولی میں ڈالی گئی۔ کبھی ایسا نہ ہو کہ وزارت کے بعد مولانا کی جھولی خالی کی خالی رہ جائے۔ ہمیں کسی بھی دوسری حکومت کی طرح نواز حکومت سے بھی ان مقاصد کی تکمیل ہوتی نظر نہیں آئی جو تحریک پاکستان کے دنوں میں قائداعظم اور ان کے ساتھیوں کے دلوں میں تڑپتے تھے۔ سوچنے کی بات ہے کہ یہ وہ شخص ہے جسے لوگوں کی طرف سے مجاہد ملت کا لقب ملا۔ اب وہ صرف وفاقی وزیر ہے۔

میانوالی کے لوگ ووٹ دیتے وقت یہ خیال کرتے تھے کہ کن لوگوں کو ووٹ دنیاداری کی وجہ سے دیا جا رہا ہے اور کس ایک شخص کو اخروی بھلائی کے لیے ووٹ دیا جا رہا ہے۔ اب میانوالی کے لوگوں کے پاس یہ چوائس بھی نہیں رہا۔ اس سے پہلے بھی میانوالی کے

KitaabPoint.blogspot.com

دو ایم این اے وفاقی وزیر رہ چکے ہیں۔ اب صرف اتنا ہوا ہے کہ اس میں ایک نام اور شامل ہو گیا ہے۔ میانوالی کے حوالے سے اور قومی سطح پر ان 3 وزیروں کا حساب ابھی برابر ہے۔ ہم تحریک پاکستان کو یاد کرتے ہوئے ایک گہرے ملال کا شکار ہیں۔ صاحب جمال و کمال مولانا نیازی سے اپیل ہے کہ وہ اپنے حال پر نظر رکھیں..... اور اس الزام کا کوئی رد پیش کریں۔ یہ میانوالی کے سارے دردمندوں کے حق میں انتقام بنتا جا رہا ہے۔ پہلے دوست دشمن مولانا کے بارے میں بات کرتے ہوئے ان کے اخلاص پر شک نہیں کرتے تھے۔ اب ان کا کردار ہی مشکوک بنانے کی کامیاب کوششیں ہو رہی ہیں۔ جبکہ پہلے ایسی ناکام کوشش بھی نہیں ہوتی تھی۔ وزیر کی حیثیت سے غیر مستحق لوگوں پر ان کی نوازشوں کی بارشوں نے سازشوں کا منہ کھول دیا ہے۔ اس حج پر بہت کم حاجیوں نے مولانا کے حق میں کلمہ خیر کہا ہے۔ اس کے باوجود ہم مولانا کے لیے دعائے خیر کرتے ہیں۔ مجاہد ملت کا جہاد اب صرف اتنا ہے کہ وہ حکومت کے دفاع میں اپنا جلال و جمال استعمال کریں۔ یہی کام اپنی حکومت کے لیے ڈاکٹر شیر افگن نے ادا کیا تھا۔ مقبول خان بھی عزت مندی حاصل نہ کر سکا۔ کوثر نیازی کامیاب وزیر تھے مگر وہ میانوالی کے ووٹوں سے اسمبلی میں نہیں گئے تھے۔ کوثر نیازی نے مذہبی امور کی وزارت کو دانشمندی اور مہارت سے نبھایا۔

1988ء کی قومی اسمبلی میں محترمہ بینظیر بھٹو قائد ایوان تھیں اور وہ چل کے مولانا نیازی کے پاس ان کی نشست پر گئیں اور کہا۔ ہم آپ کی عزت کرتے ہیں۔ 1990ء کی اسمبلی میں وہ قائد حزب اختلاف تھیں اور انہوں نے مولانا نیازی کی جو بے عزتی کی۔ اس سے دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ وہ شخص جو اپنی فطرت میں لیڈر ہے اپنے بارے میں سرکاری درباری ملا کا خطاب سن کر کیا محسوس کرتا ہوگا۔ ہم جوان سے محبت کرتے ہیں، بہت برا محسوس کر رہے ہیں۔ مولانا یہ تو سوچتے کہ کیا یہ عہد کفر کے فتوؤں کے لیے سازگار ہے۔ اسلام کو صرف حکمرانوں نے استحصال کرنے اور استقبال کرانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ ایک عاشق رسول کو یہ بھی سوچنا چاہیے تھا کہ قانون بنا کر کسی کے ساتھ محبت نہیں کرائی جا سکتی۔ قانون بنتا ہے تو اسے توڑنے والے زیادہ دیدہ دلیر ہو جاتے ہیں۔

مولانا نیازی کا کردار ناموس رسالت کے تحفظ کے لیے ایک نادان دوست کا سا ہے۔ عشق رسول مسلمانوں کے دلوں میں جذب و مستی کا واحد ذریعہ ہے۔ یہ باطنی کیفیت ہے۔ اسے ظاہری کشمکش سے متنازعہ بنانا ایک سیاسی فیصلہ ہے۔ تحریک ختم نبوت کو یاد کر کے مولانا صرف اپنی صفائی پیش کرتے رہتے ہیں۔ پھانسی کی کوٹھڑی میں ابدی لمحے گزارنے والا قصر وزارت کے بے حیثیت عارضی دنوں کو اپنی زندگی میں کیسے شامل کر سکے گا۔ مولانا نیازی کے لیڈر قائداعظم اور استاد علامہ اقبال کی بھی داڑھی نہیں تھی۔ ان کے موجودہ لیڈر نواز شریف کی بھی داڑھی نہیں۔ پھر وہ معذرت خواہانہ رویہ کیوں اختیار کرتے ہیں۔

ہم نے مولانا کو لکشمی بلڈنگ اور کرشن نگر میں اپنے بہنوئی فقیر مزاج غلام سرور خان کے گھر معمولی سے صوفے پر بیٹھے دیکھا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

اس تمکنیت سے شاہ جہان بھی تخت طاؤس پر نہ بیٹھا ہوگا۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے مزاج میں تکبر ہے' بے نیازی نہیں' افسوس کہ اقبال کے شاگردوں کو یہ شعر یاد نہیں؟

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

نواز شریف کے پاس آخر کیا ہے کہ اس نے مولانا نیازی جیسے قلندر کو اپنا وزیر بنالیا بلکہ وزیر بے تدبیر بنالیا۔ نواز شریف کی اس سے بڑی ''کامیابی'' کیا ہوگی کہ مولانا جیسا صاحب دل اور صاحب جرات ان کے لیے اپنی شخصیت کی استقامت بھی داؤ پر لگا چکا۔ اب تو سب کچھ داؤ پر لگ گیا ہے۔ ہم سب ہار گئے ہیں۔ شاید جنت اور وزارت میں کوئی فرق نہیں جنت کو عربی میں خلد کہتے ہیں۔ خالد بھی خلد سے نکلا ہے۔ اتفاق سے وزیر مذہبی امور کا مکمل مالک کوئی خالد نیازی تھا۔ خالد نیازی اتنا ماہر اور مشتاق آدمی ہے کہ اس نے حج کے ویزے بھی جنت کی ٹکٹوں کی طرح تقسیم کئے۔ نجانے اس موقع پر ہمیں یہ ضرب المثل کیوں یاد آئی۔ ''ایک ٹکٹ میں دو دو مزے''

افسوس ہے کہ ایک ہی کابینہ میں مولانا نیازی کو دو دفعہ وزارت سے جانا پڑا۔ مزید افسوس یہ ہے کہ وہ 93ء کے انتخابات میں قومی اسمبلی کے دو حلقوں سے ہار گئے۔ کاش وہ وزیر نہ بنتے تو پھر کاش وہ اس کے بعد انتخاب نہ لڑتے۔ اپنے عقیدت مندوں کو دگنی شرمندگی سے بچاتے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

سراج منیر بیوی کی جدائی میں مبتلا تھا

26 ستمبر کو سراج منیر کی دوسری برسی سے یہ خیال آتا ہے کہ وہ مر گیا ہے تو یقین ہی نہیں آتا۔

انوکھی چمک اس کی آنکھوں میں تھی
ہمیں کیا خبر تھی کہ مر جائے گا

ابھی کچھ دن پہلے اس کی کتاب شائع ہوئی ہے۔ ''کہانی کے رنگ'' اس کی اپنی بھید بھری کہانی کے رنگ کن لفظوں میں ظاہر ہوں گے۔ ابھی سراج منیر کی کئی کتابیں شائع ہونے والی ہیں۔ نجانے دیر کیوں ہو رہی ہے۔ اس کی بیوی عطیہ سراج منیر نے اس کے بارے میں دو کتابوں کا وعدہ کر رکھا ہے۔ ان خطوط کا مجموعہ بھی شائع ہوگا جو سراج منیر نے جدہ سے عطیہ بی بی کو لکھے تھے۔ ان تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہی بیوی کی جدائی میں مبتلا تھا۔ اس کی شخصیت میں جدائی کی خوشبو ہر وقت بے قرار رہتی تھی۔ ان خطوط میں سراج عشق کی کسی ان دیکھی منزل پر نظر آتا ہے۔ عطیہ نے تو اسے اس حال میں دیکھا تھا۔ اس میں وہ سراج عطیہ کو آہوئے دشت دل کہہ کر مخاطب ہوتا ہے۔ یہی کتاب کا نام ہوگا۔ عطیہ بی بی نے سراج فاؤنڈیشن قائم کی ہے۔ 26 ستمبر کو برسی اور سراج سیمینار بھی ہوگا۔ پچھلے سال ادارہ ہم سخن ساتھی کے زیر اہتمام ہونے والی تقریب میں عطیہ نے بہت خوبصورت گفتگو کی تھی۔ جن لفظوں میں ملال کی کچھ کیفیت ہوگی ان میں جمال تو ہوگا۔ عطیہ نے سراج ایوارڈ دینے کا بھی اعلان کیا تھا۔ اس سال یہ ایوارڈ ایک بہت مقتدر علمی شخصیت ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کو دیا جا رہا ہے۔ ایوارڈ کے لیے دس ہزار کی رقم کا بندوبست عطیہ نے ذاتی طور پر کیا ہے۔ یہ اولیت بھی اس کی ہے سراج کے والد بہت علمی دینی روحانی شخصیت مولانا سید محمد متین ہاشمی صاحب بھی اس سال فوت ہو گئے۔ ایک صاحب علم و عرفان گھرانہ تنہا خاموشیوں کا مسکن بنتا جا رہا ہے۔ اب سراج کی علمی نسبت کو سنبھالنے والی ایک ہی شخصیت رہ گئی ہے اور وہ اس کی بیوی شاعرہ ادیبہ پروفیسر عطیہ ہے۔ انہوں نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے وہ چاہتی ہے کہ یہ فکری اضطراب سراج کے سب دوست محسوس کریں۔ وہ سراج کی علمی جدوجہد کو فکری منیر کے نام سے پکارنے لگی ہیں۔ اب سراج کی گمشدہ آوازوں کا سراغ لگانا مشکل نہیں رہا۔ ورنہ وہ لوگ تو اسے بھول گئے جو اس کی زندگی میں ایک تنگ دائرے کی طرح اس کے اردگرد رہتے تھے۔ وہ لوگ کہاں گئے جو اس کی موجودگی سے ہی اپنے لیے فائدے تلاش کر لیتے تھے۔ سیاست دانوں کی بات تو چھوڑیئے کہ وہ تو صرف

KitaabPoint.blogspot.com

موقع کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ اس کے ادیب و شاعر دوست بھی کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ پچھلے برس سراج کی تقریب بری میں اسے دور دور سے دیکھنے والوں کی کثرت تھی وہ جو اسے دیکھتے تھے اور سنتے تھے اور حیرت زدہ تھے۔ اپنے ذہنوں کے رخ اس آواز کی طرف رکھتے تھے۔ جس میں راز ہی راز ابھر رہے تھے۔ وہ اس کی محبت میں آبدیدہ تھے۔

سراج بہت آگے جانے والوں کو بھی پیچھے چھوڑ جانا چاہتا تھا۔ اس چاہت میں وہ ان دیکھے جہانوں کی طرف چلا گیا۔ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ نجانے کیا کیا کرنا چاہتا تھا۔ اس ذوق وشوق اور جوش وخروش میں وہ ان میدانوں میں چلا گیا جو اس کے لیے نہیں بنے تھے۔ اس نے اپنی آرزوؤں اور اپنے ارادوں کو متصادم کر لیا تھا۔ اپنے اندر کشمکش کو شورش بننے سے نہ روک سکا۔ سیاست والے اس سے خوف زدہ تھے کہ یہ پڑھا لکھا بندہ کہاں سے آ گیا۔ وہ زندہ رہتا تو..... اور..... اس کے بعد کوئی بھی پیش گوئی کی جا سکتی تھی۔ وہ غیر معمولی آدمی تھا اور غیر متوقع طور پر کامیابیوں کی معراج پر پہنچ جاتا تھا۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ یہ کامیابیاں اس کی کامیابیاں تھیں۔ شاید اس کا خیال تھا کہ سیاسی معرکے کے بغیر علمی کارنامے کی کوئی وقعت نہیں یہ سوچ غلط بھی نہ تھی۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے دانشوروں اور ادیبوں کا کیا حشر ہوا۔ لیڈروں میں قائداعظم کے بعد دو ایک نام لیے جا سکتے ہیں جو صاحب کمال ہوئے۔ شاید حکومت والوں سے حکمت روٹھی رہتی ہے۔ سراج صدر ضیاء کا بہت قائل تھا۔ اس نے اپنے بہت سارے صدر ضیاء کے راستے میں بکھیر دیئے تھے اس کی موت کے بعد اس نے وہ ارادے ان لوگوں کے رستوں میں بکھرے رہنے دیئے جو خوابوں اور خیالوں کو صرف روندنا جانتے ہیں۔ وہ صرف خواہشوں سے بنے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ گندی خواہشوں سے بنے ہوئے لوگ۔ سراج کی دوست روح سے معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ حکمرانوں کے قریب اس کی سوچوں پر بھی ان خواہشوں کا رنگ چڑھنے لگ گیا تھا۔ یہ رنگ کچا ہوتا ہے۔ اس سے صاف دل لوگوں کا لباس بہت جلد آلودہ ہو جاتا ہے۔ ذہنی طور پر سراج آسودہ بھی نہ رہا تھا۔ فطرت نے اسے بچانے کے لیے ظالمانہ انداز اختیار کیا جبکہ کئی مراعات یافتہ ادیب شاعر اپنی ساکھ گنواتے جا رہے ہیں۔

نواز شریف کو یہ دکھ تھا کہ سراج انہیں چھوڑ کر غلام مصطفیٰ جتوئی کے پاس چلا گیا ہے۔ یہ سیاسی دکھ تھا۔ سراج نے اپنی ساری دمکتی ہوئی امیدیں جتوئی کی جھولی میں ڈال دیں۔ اس کی جھولی بھر گئی مگر سراج کا دل خالی ہونے لگا۔ جتوئی کے لیے سراج وہی باتیں کرتا تھا جو اس نے نواز شریف کے لیے کہی تھیں۔ اس نے اصل میں یہ باتیں ضیاء الحق کے لیے کہی تھیں۔ ضیاء کی موت نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ ضیاء کے بعد اس کے پسندیدہ لوگوں میں وہ پہلا آدمی تھا جو اس کے تعاقب میں اس پار چلا گیا۔ اب زندگی کے سفر میں سب راستے اس کے لیے بند ہونے لگے تھے۔ اصل میں وہ ان راستوں کا مسافر نہ تھا۔

KitaabPoint.blogspot.com

سراج کی موت کے بعد زود فراموشی بہت قابل افسوس ہے اس کے جنازے میں علم و ادب کے راستوں والے لوگ تھے۔ سیاست دان بہت کم تھے۔ وزیر اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی بھی نہ تھا اسلام آباد سے سراج کی لاش ہی آئی اور تنہا آئی۔ لوگ نواز شریف کی راہ تکتے رہے۔ کچھ دن بعد وہ سراج کے والد کے پاس گئے اور سراج کو یاد کرتے رہے۔ جتوئی صاحب سے تو یہ بھی نہ ہوا۔

اس سے بھی زیادہ رکھ کی بات ہوئی جب ایک پریس کانفرنس میں نگران وزیر اعظم سے پوچھا گیا کہ سراج آپ کا ساتھی تھا اور بہت معرکے کا نوجوان دانشور تھا۔ اس کے لیے آپ نے کیوں کچھ نہ کیا تو جتوئی صاحب خفا ہو گئے اور کہا۔ ہم نے اس کے گھر والوں کو ایک پلاٹ تو دے دیا ہے ہم اور اس کے لیے کیا کریں۔ یہ حکمران صرف سرکاری پلاٹ ہی دے سکتے ہیں اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اس عنایت بے بہا کے لیے جتوئی صاحب مبارکباد وصول کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

دے جا سخیا راہ خدا

کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ احمد ندیم قاسمی کئی دوسرے ادیبوں کے ساتھ باجماعت بھیک مانگتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ پروین عاطف' صدیقہ جاوید' یونس جاوید' یونس ادیب' فردوس جمال' فریال گوہر' جمال شاہ اور ادب وفن سے متعلق کئی خواتین وحضرات موجود تھے۔ یہ سلسلہ کئی دنوں سے چل رہا ہے۔ اس سب کارروائی کی محرک پروین عاطف ہیں۔ اس سے پہلے بیگم ایلس فیض' ارشاد حسین کاظمی' فرخ سہیل' افضل توصیف' منور سعید' اقبال باہو' سائرہ ہاشمی' خدیجہ گوہر شائستہ جبیں اور کئی دوسرے بھی مانگ چکے ہیں۔ سنا ہے ہزاروں روپے اکٹھے ہو رہے ہیں۔ یہ دھندا عراق کے زخمی بچوں' عورتوں اور بوڑھیوں کی طبی امداد کے لیے شروع کیا گیا ہے۔

پروین عاطف' فردوس جمال اور فریال گوہر تو مستقل بھکاری ہیں۔ یہ لوگ اس خطاب سے خفا نہ ہوں گے کہ ان تک کئی لوگوں سے وہ یہ خطاب سن چکے ہیں۔ وہ اس راستے پر اتنے آگے جا چکے ہیں کہ جھڑکیاں اور گالیاں کھا کے بھی بے مزا نہ ہوں گے۔ جب شاہین عتیق الرحمٰن سے پانچ دس روپے کے لیے درخواست کی گئی تو انہوں نے سب لوگوں کو چور کے لقب سے نوازا اور اس ناراضگی کا اظہار کیا جو وہ سچ مچ جھولی پھیلائے ہوئے اور درخواست تھامے ہوئے لوگوں سے کرتی ہیں۔

فردوس جمال نے جس طرح لوگوں کی منتیں کیں لگتا تھا وہ اپنے بچوں کے لیے مانگ رہا ہو۔ دنیا میں کوئی ایک مظلوم زخمی بھوکا بچہ سب کا بچہ ہے۔ فردوس جمال کے انداز میں اداکاری نام کو نہ تھی۔ خلوص ہی خلوص اور درد ہی درد تھا۔ فریال گوہر مظلوم بچوں کا ذکر کرتے ہوئے رو پڑیں۔ منتیں کرتا ہوا فردوس جمال بہت پیارا لگا۔ دیر تک جھولی پھیلائے ہوئے اور بھی پیارا لگا۔ چاہے خون میں لتھڑے ہوئے بچوں کے لیے ہی مانگا جائے آدمی کی انا تو ٹوٹتی ہے۔ صاحب کمال لوگ صاحب دل بھی ہوتے ہیں۔

پروین عاطف کا جذبہ اور عملی کارروائی قابل داد ہے۔ کاش انہیں یہ خیال ذرا جلدی آتا تو اب تک لاکھوں روپے جمع ہو چکے ہوتے۔ ہم فتح وشکست کے مغالطوں میں گھرے ہوئے سمجھتے ہیں کہ شاید جنگ چھڑنے کے ایک ماہ بعد لوگ زخمی ہونا شروع ہوں گے۔

ایک پرانا محاورہ ہے کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود' نجانے اب اس روایت کی معنویت کس طرح آشکار ہو

KitaabPoint.blogspot.com

گی۔کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری طرف سے امداد پہنچنے سے پہلے زخمی بچوں کی چیخیں اور مظلوم عورتوں کی سسکیاں ان کے اپنے لہو میں ڈوب جائیں۔منیر نیازی نے ہم سب کے لیے کہا ہے۔

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں

میں سوچ رہا ہوں کہ کیا اس اقدام پر دیر آید درست آید والی ضرب المثل صادق آتی ہے۔بہرحال پروین عاطف کی ایما پر فنکاروں اور ادیبوں کی یہ کوشش مبارک باد کے قابل ہے۔

اب جو صورت حال عراق میں سامنے آئی ہے اس میں یقیناً اس طرح کی غریبانہ بلکہ ادیبانہ امداد کی بھی بڑی ضرورت ہے۔اب وہاں اور طرح کے ظلم کا آغاز ہوگا۔عراقیوں کے لیے آزمائش کا ایک نیا زمانہ شروع ہونے والا ہے۔اس سے پہلے کہ وہاں بچے عورتیں اور بوڑھے ظالموں کے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہوں۔ہم سب ان کے لیے جھولیاں پھیلا دیں۔

ہم بہت پہلے ٹولیوں کی صورت میں جھولیوں کو لہراتے ہوئے مردوں اور بچوں کو مانگتے اور کورس کی شکل میں گاتے ہوئے دیکھتے تھے تو بڑا مزا آتا تھا۔

دے جا سخیا راہ خدا

ہم دور تک ان لوگوں کے ساتھ ساتھ چلتے تھے لیکن خدا کی قسم اب کے زیادہ مزا آیا' جب آدمی زخم زخم لوگوں کے لیے خود کرچی کرچی ہو جائے تو اس سے بڑا نشہ کوئی اور نہیں۔

مجھے یقین ہے کہ دنیا بھر کے مظلوم اور غریب لوگوں کی بھی سنی جائے گی۔آج دنیا بھر کے مظلوم لوگوں اور مسلمانوں کی امداد کے لیے متحد ہو کر ایک سچا مظاہرہ کیا گیا ہے۔کب ایسا ہوگا کہ ہم دشمن کے خلاف بھی متحد ہوں گے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

پاکستان فورم میں مزاحیہ مشاعرہ

مشاعرے بھی ہماری ادبی زندگی کا اہم ترین اظہار ہیں۔ اب تو یہ تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا بھی محور بن چکے ہیں۔ ہر سال جہاں میلے لگتے ہیں اور مختلف تقریبات ہوتی ہیں اب مشاعرے بھی ایک لازمی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ لاہور کے مشاعرے پورے برصغیر میں ایک معروف سرگرمی کے طور پر سامنے آئے۔

اب بھی پاکستان میں لوگوں کے ذوق وشوق کی تربیت اور تفریح طبع کے لیے مشاعروں سے زیادہ ضروری سرگرمی اور کوئی نہیں۔ چھوٹے شہروں میں تو یہ موقعہ سال میں ایک بار ہی آتا ہے۔ بھارت میں مشاعرہ ورائٹی شو بن گیا ہے۔ گائیکی اور صداکاری کے مظاہرے نے تخلیقی تجربے کی فطری سرشاری کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ پاکستانی لوگ اس شاعر کو زیادہ پسند کرتے ہیں جو مزاحیہ اشعار پڑھے۔ وہ مکمل طور پر اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بڑا مزاح اپنے اندر بڑی حقیقتوں کو چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سچا مزاح آنسوؤں کی پھوار سے پیدا ہوتا ہے۔ ہر کامیڈی کے پیچھے کوئی نہ کوئی ٹریجڈی ہوتی ہے۔ اس پر غور نہ بھی ہو تو اس مصروف زندگی میں پریشانیوں اور مشکلات کے درمیان دو چار لمحے فرصت فراغت اور مسرت کے آدمی کو زندہ تر کر دیتے ہیں۔ شادمانی کا احساس زندگی گزارنے کا تازہ ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔

پاکستان فورم کے تحت الحمرا ہال نمبر ایک میں خالصتاً مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد ایک بڑا ادبی واقعہ ہے جو اس لحاظ سے منفرد بھی ہے کہ ہماری ادبی تاریخ میں اس کی مثال نہ ہونے کے برابر ہے۔ مشاعرے میں 20 سے زیادہ نامور اور معروف شعراء نے حصہ لیا۔ یہ کل پاکستان مزاحیہ مشاعرے سے بڑی تقریب تھی جو پاکستان ٹیلی ویژن نے منعقد کیا تھا۔ ہر شاعر نے دل کھول کر پڑھا اور خواتین وحضرات خوب لطف اندوز ہوئے۔ تین گھنٹے تک پورا ہال سامعین کی تالیوں اور قہقہوں سے گونجتا رہا۔ کئی مقامات پر سامعین اور شعراء کے درمیان دلچسپ مکالموں کا تبادلہ بھی ہوا۔ ہال میں موجود لوگوں نے اپنی بھرپور شرکت کو محسوس کیا۔

مشاعرے کی صدارت برصغیر کے نامور شاعر سید ضمیر جعفری نے کی۔ نظامت کے فرائض بہت خوش اسلوبی اور خوش طبعی سے ضیاء الحق قاسمی نے سرانجام دیئے۔ جب بابا عبیر ابوذری نے علامہ اقبال کی مشہور غزل

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

KitaabPoint.blogspot.com

کی مزاحیہ پیروڈی کی اور یہ شعر پڑھا۔

وہ اک نار ہی تو جلاتی نہیں ہے
محلے میں چنگاریاں اور بھی ہیں

تو ضیاء الحق قاسمی نے برجستہ جواب دیا۔

قناعت نہ کر صرف دو بیویوں پر
شریعت میں دو بیویاں اور بھی ہیں

تقریباً ہر شاعر نے دو تین چیزیں سنائیں۔ کئی شعراء کو بار بار فرمائشیں کر کے اپنی چیزیں سنانے پر خواتین و حضرات نے مائل کیا۔ یوں یہ بہار یہ رنگ کی محفل ایک اجتماعی دلنواز ماحول میں تبدیلی ہوگئی۔ جب ضمیر جعفری کئی قطعات اور نظمیں سنانے کے بعد جانے لگے تو حاضرین نے انہیں پھر واپس بلا لیا اور ان کو اپنی مشہور نظم مسز ولیم سنانے کے لیے گزارش کی۔ انہوں نے نظم سنانے سے پہلے کہا کہ یہ ایک غیر ملکی شاعری کی نظم کا ترجمہ سا ہے مگر میں نے جس انداز میں لکھا ہے یہ نظم میری نہیں تو اس کی بھی نہیں رہی۔

ہال میں تل دھرنے کی کوئی جگہ نہ تھی' کئی لوگ دعوتی کارڈ فراہم نہ ہونے کی وجہ سے واپس چلے گئے۔ ہال میں ضیاء شاہد' رشید بھٹی' رانا طاہر محمود' مس گھوش' مقصود بٹ' ڈاکٹر بشیر گواریہ' چوہدری عبدالحمید' راجہ جمیل اللہ خان' راجہ طارق اللہ خان' ڈاکٹر خواجہ خورشید اور سینکڑوں خواتین و حضرات نے شرکت کی۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

سلیم طاہر اور کھدر پوش ایوارڈ

ہمارے ہاں ایک عجیب نفسیات بن گئی ہے کہ جو شخص انتخابات میں ہار جائے وہ کہتا ہے کہ دھاندلی ہوئی ہے۔ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ جیتنا صرف اس کا حق ہے۔ قومی ایوارڈز کے حوالے سے بھی یہ بات سامنے آئی ہے کہ ہر لکھنے والا اپنے آپ کو ایوارڈ کا مستحق سمجھتا ہے۔ ایوارڈ کی تقسیم اور طریق کار پر تنقید کرتا ہے۔ کچھ ادیب اور شاعر ایسے ہیں جو اپنے آپ کو نوبل امن انعام کے مستحق سمجھتے ہیں۔ انہیں اس سلسلے میں بین الاقوامی معاملات پر بھی اعتراض ہے۔ کچھ ادیبوں کو ایوارڈ مل چکا ہے مگر انہیں افسوس رہتا ہے کہ اگلے سال کسی اور کو مل جائے گا۔ یہ بات تو ہر حال میں طے ہے کہ ہمارے ہاں قومی اور بین الاقوامی طور پر پسند و ناپسند کا کچھ نہ کچھ دخل ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کی موجودگی میں رابندر ناتھ ٹیگور کو نوبل انعام دیا جانا ایک مضحکہ خیز اقدام لگتا ہے۔ اہل مغرب کی اسلام دشمنی اس سلسلے میں بھی واضح نظر آتی ہے۔ جہاں تک سویت یونین کے لینن پرائز کا تعلق ہے تو اس کے لیے سیاسی اور نظریاتی وابستگی ایک بنیادی شرط ہے۔

ہمارے ہاں جو قومی ایوارڈ دیئے جاتے ہیں اس میں متعلقہ شخص کی خدمات اور مقام کا خیال رکھا جاتا ہے مگر اس کے علاوہ بھی ترجیحات ہوتی ہیں۔ جن کا تعلق سیاسی ہم آہنگی ذاتی پسند اور دوستوں کی سفارشات سے ہوتا ہے۔ بینظیر بھٹو صاحبہ کے زمانے میں ان ادیبوں اور شاعروں کے ایوارڈ منسوخ کر دیئے گئے، جنہیں صدر ضیاء کے زمانے میں ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ غالباً ان لوگوں میں زیڈ اے سلہری الطاف حسن قریشی اور مظفر وارثی بھی شامل ہیں۔ ان تینوں حضرات کو اس سال یوم پاکستان کے موقع پر ایوارڈ دیا گیا ہے۔

حکومت پاکستان کے علاوہ پاکستان رائٹرز گلڈ آدم جی ایوارڈ مسعود کھدر پوش ٹرسٹ کی طرف سے دیئے جانے والے اعزازات پر مختلف اعتراضات ہوتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات کچھ مصنفین کو اچھی کتابوں پر ایوارڈ دے دیا جاتا ہے کہ اسی سال شائع ہونے والی بہت ایسی کتابوں کی موجودگی میں یہ فیصلہ ایک زیادتی کی طرح لگتا ہے۔ انعامات کے لئے مصنفین کی کمیٹی کے ممبران بھی برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ اعزازات کی تقسیم میں منصفانہ طریقہ کار اشد ضرورت ہے۔

یہ سب تمہید اس واقعے کے لیے بیان کی گئی ہے جو مسعود کھدر پوش ایوارڈ کے حوالے سے پیش آیا ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے

KitaabPoint.blogspot.com

مشہور پروڈیوسر کمپیئر اور شاعر سلیم طاہر کے پنجابی شعر مجموعے تانگھ تریل کو 1986ء میں خصوصی انعامات کے لیے مصنفین کی کمیٹی میں غور کے لیے پیش کیا گیا۔ اس کمیٹی میں حفیظ تائب' اختر حسین اختر' منظور وزیر آبادی اور شریف صابر شامل تھے۔ تین مصنفین نے سلیم طاہر کی کتاب تانگھ تریل کے حق میں رائے دی۔ صرف شریف صابر نے گوجرانولہ کے شاعر غلام مصطفیٰ بسمل کے حق میں ووٹ دیا۔ چنانچہ یہ فیصلہ سلیم طاہر کے حق میں ہوا مگر اعلان غلام مصطفیٰ بسمل کے لیے ہو گیا اور انہیں ایوارڈ دے دیا گیا۔ سلیم طاہر بے نیاز آدمی ہے۔ وہ تخلیقی سرمستی میں سرشار رہتا ہے۔ اس نے اس سلسلے میں کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔

21 جنوری 1991ء کو مسعود کھدر پوش ٹرسٹ کی طرف سے لکھا ہوا خط ملا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ٹرسٹیوں کے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ 1986ء میں ایک جج نے دھوکے اور ہیرا پھیری سے آپ کا انعام کسی اور شاعر کو دلوا دیا۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا ہے کہ 1986ء کا خصوصی انعام آپ کو دیا جائے۔

یہ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ کوئی انعام کالعدم قرار دے کر اصل حق دار کو دیا گیا ہو۔ یہ بات بڑی جرات کی بات ہے اس طرح مسعود کھدر پوش ٹرسٹ کی نیک نامی میں اضافہ ہوگا۔ مسعود کھدر پوش مرحوم کی صاحبزادی شیریں مسعود اپنے والد کی درویشی اور دانشوری کے ورثے کو محفوظ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں ورنہ ہمارے ہاں لوگ سمجھتے ہیں کہ ورثے میں مال و جائیداد کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

سلیم طاہر نے ایک ملاقات میں اس واقعے کو ایک یادگار معرکہ کہا ہے۔ سلیم طاہر اردو اور پنجابی کا اچھا شاعر ہے۔ تانگھ تریل میں اس کی پنجابی نظمیں شامل ہیں۔ وہ بڑی آسودگی اور سادگی سے گہری اور پیاری باتیں کر جاتا ہے۔ اپنی شاعری میں وہ محبت کرنے والا دھیما آدمی نظر آتا ہے جبکہ ٹیلی ویژن پروگرام ''میں اور آپ'' میں ایک مضبوط اور بہادر آدمی کے طور پر متعارف ہوا ہے۔ کئی دفعہ اس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی مگر گھبراہٹ یا پریشانی کا کوئی تاثر اس کے لہجے کو نہ چھو سکا۔ یہ واحد پروگرام ہے جس کی عوام اور حکام نے یکساں طور پر تعریف کی ہے۔ لوگوں کے مسائل کے حل کے لیے ان پروگراموں سے بڑی مدد لی جا سکتی ہے۔

ٹیلی ویژن میں سروس کے حوالے سے پروموشن میں بھی سلیم طاہر سے زیادتی ہو رہی ہے۔ اس نے چپ سادھ رکھی ہے۔ ہم اس کے لیے خصوصی مراعات کے خواہش مند ہیں۔ اسے اپنا حق بہر حال ملنا چاہیے۔ ہم سب مسعود کھدر پوش ٹرسٹ کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے چار سال بعد ہی سہی ایک غلطی کا ازالہ تو کیا۔ قومی اور عوامی سطح پر یہ رویہ اپنا لیا جائے تو ایک معاشرتی انقلاب آ جائے۔ معاشی انقلاب ہی معاشرتی انقلاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

سیاست اور ٹی وی کی چربہ پالیسی

کہا جاتا ہے کہ پاکستان ٹیلی ویژن کا تقریباً ہر پروگرام کسی نہ کسی پچھلے پروگرام کا چربہ ہوتا ہے۔ یہ بات ڈراموں کے حوالے سے تو خاص طور پر ہوتی رہتی ہے۔ کچھ خصوصی پروگراموں کے بارے میں بھی یہ کہا جانے لگا ہے۔ مثلاً ربیع الاول کے مہینے میں عید میلاد النبی کے دنوں میں لگتا ہے کہ پچھلے سال والے پروگرام دکھائے جا رہے ہیں نعتیہ مشاعرے میں اکثر شعراء ایک ہی نعت بار بار پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی نعتیں سامعین ایک آدھ بار یاد کر کے بھول چکے ہیں' کہ چلیں اگلے سال پھر سن لیں گے۔ محرم کے دنوں میں بھی یہی ہوتا ہے۔

خبرنامہ پر تو یہ اعتراض مکمل طور پر عائد ہوتا ہے۔ صدر ایوب' صدر یحییٰ صدر اور وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو' صدر ضیاء الحق' وزیر اعظم محمد خان جونیجو' صدر غلام اسحاق خان وزیر اعظم بے نظیر بھٹو' نگران وزیر اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی' وزیر اعظم محمد نواز شریف کا انداز اپنا اپنا تھا۔ ان کا سیاسی راز تو یقیناً اپنا اپنا تھا مگر خبرنامے میں ان سب کے حوالے سے پہلے نمبر پر ہمیشہ جو خبر ٹیلی کاسٹ کی جاتی رہی ہے اور کی جاتی ہے وہ ایک جیسی ہوتی ہے بلکہ ایک ہی ہوتی ہے مثلاً ہم نظام اسلام نافذ کر کے رہیں گے۔ بے چارے حکمران تین چار سال یا آٹھ دس سال کے بعد خود ہی نہیں رہتے تو اسلامی نظام کیا نافذ کریں۔ دوسری خبر جو بار بار سنائی جاتی ہے میری حکومت غریبوں کی حالت تبدیل کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ خبر کے بعد اس ارادے کو تہہ کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ تہہ موٹی ہو جاتی ہے اگر تہہ سے مراد دریا بلکہ دل دریا کی تہ (اتھاہ) ہے تو وہ کبھی ملی ہی نہیں۔ چنانچہ یہ خبر برس ہا برس سے نشر ہو رہی ہے۔ یہ بات ایوب' یحییٰ' بھٹو' ضیاء' جونیجو' بینظیر' جتوئی' نواز شریف نے اتنی بار کہی ہے کہ اب یہ دوسرے کا چربہ معلوم نہیں ہوتی بلکہ لگتا ہے کہ یہ حکمرانوں کا تکیہ کلام ہے۔ البتہ یہ بات ان کے نام سے ٹیلی ویژن سے اس وقت خبرنامے میں چلے گی جب وہ صدر یا وزیر اعظم ہوں گے۔ یہ بات بالکل اسی طرح کہی گئی جو پہلے صدر یا وزیر اعظم نے کہی تھی۔

خبرنامے میں خبروں کی تقسیم بھی وہی کی وہی رہتی ہے جو پہلے تھی۔ ہمارے ملک میں صرف یہی تقسیم مساوات اور انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہوتی ہے۔ چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو ان کی سیاسی طاقت کے مطابق وقت دیا جائے گا۔ وفاقی وزیروں کو کبھی کبھی بدمزگی ہوتی ہے۔ مثلاً ٹیلی ویژن کے اعلیٰ حکام کو کبھی کبھی کسی وزیر صاحب کی طرف سے یہ فون ہوتا ہے کہ میری خبر نو بج کر

KitaabPoint.blogspot.com

اٹھائیس منٹ پر کیوں دکھائی گئی۔ نو بج کر پچیس منٹ پر کیوں نہیں دکھائی گئی۔ مجھے آدھا منٹ ملا ہے تو فلاں وزیر کو پون منٹ کیوں دیا گیا۔ اس حوالے سے کبھی مختلف صوبوں کی محرومی اور پسماندگی کا شوشہ بھی چھوڑ دیا جاتا ہے۔

خبروں کی تقسیم صرف محترمہ بینظیر بھٹو کے زمانے میں گڑبڑ ہوئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی حکومت وقت سے پہلے چلی گئی۔ اس معاملے میں بے انصافی برداشت نہیں کی جاسکتی۔ بے انصافی برداشت کرنے کے دوسرے مواقع بہت ہیں اور بے چارے عوام اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ بے چارے لوگوں کو جس بات کا عادی بنایا جائے بن جاتے ہیں۔ انہیں ڈرامہ دیکھنے اور خبرنامہ سننے کا عادی بنادیا گیا ہے۔ انہیں پتہ ہے کہ ہمارے ڈرامہ نگار اور حکمران اللہ کے فضل سے ایک جیسے ہیں ایک جیسی بات کرتے ہیں اور ایک جیسے کام کرتے ہیں۔

وہ جس آدمی کے بارے میں سوچتے ہیں کہ شاید پہلے سے مختلف ہو مگر وہ تو وہی ہوتا ہے جو پہلے والا تھا۔ پاکستانی فلمیں پاکستانی ڈرامہ ٹیلی ویژن پر دیکھنے سے لگتا ہے کہ یہ تو ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ فلمیں آدمی اپنی مرضی سے دیکھتا ہے۔ ٹی وی مجبوراً دیکھنا پڑتا ہے۔ ٹی وی والوں کا خیال ہے کہ اگر برسوں سے لوگ ایک ہی سیاسی ڈرامہ دیکھ رہے ہیں تو ہم انہیں کیوں مختلف ڈرامہ دکھائیں۔ ہماری حکومت جب سے نوجوان لوگوں کے ہاتھ میں آئی ہے ڈرامہ نویسی کا کام بھی لڑکوں کے حوالے کر دیا ہے۔ چنانچہ ہم ایک ہی سیاسی ڈرامہ اور ٹی وی ڈرامہ دیکھنے پر مجبور ہیں۔ ڈاکٹر یونس بٹ نے افراتفری کو افراتفریح کہہ کر بہت بامعنی بات کی ہے۔

اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک ناول پر مبنی ٹی وی سیریل ''عروسہ'' کی بات کروں۔ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول مراۃ العروس کا ہو بہو چربہ ہے۔ حد یہ کہ صبح کی نشریات میں یہ دکھایا بھی جاچکا ہے۔ پروفیسر نواز کی ڈرامائی تشکیل کو پروڈیوسر شوکت زین العابدین نے پیش کیا تھا۔ شوکت محنت کرتا ہے ہمت نہیں کرتا۔ چنانچہ اپنے ہر پروگرام کے بعد وہ ہسپتال ضرور جاتا ہے۔ وہاں ٹی وی کے حوالے سے بات کرنا منع ہوتا ہے۔ ہمارے حکمران بھی اقتدار کے لیے محنت تو کرتے ہیں ہمت نہیں کرتے۔

ٹی وی سیریل ''عروسہ'' کا انجام اتنا برا اور تکلیف دہ تھا کہ اپنے حکمرانوں کا انجام یاد آ گیا۔ پورے سیریل میں عروسہ کی مقبولیت عروج پر نظر آتی ہے مگر آخری دو قسطوں کا جو حال کیا گیا' بالکل یہی ہمارے حکمرانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ آخری قسطوں میں عروسہ کی احمقانہ سادگی سے شک پڑ جاتا ہے کہ پہلے اس نے جو اچھا کام کیا ہے کیا واقعی اس نے کیا ہے۔ آخر میں جو دو قسطیں ڈالی گئی تھیں حالانکہ ان کی ضرورت نہیں تھی۔ صدر ایوب اور صدر ضیاء سے آخری دنوں میں کیا کچھ نہیں کرایا گیا تھا۔ دوسرے حکمرانوں کی

KitaabPoint.blogspot.com

کارروائیوں بلکہ حرکتوں کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ پہلے جو ہیرو ہوتا ہے آخر میں زیرو ہو جاتا ہے۔

ہمارے حزب اختلاف کے لیڈروں کا حال بھی حکمرانوں سے مختلف نہیں۔ میں نے 1970ء میں نواب زادہ نصراللہ خان کی تقریر سنی تھی۔ انہوں نے جو اشعار اس وقت پڑھے تھے وہی اشعار 1990ء میں پڑھ رہے ہیں۔

ہمارے ہر ڈرامہ سیریل کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ ڈرامہ نگاروں کے مطابق مداخلت بہت ہوتی ہے۔ مداخلت کا لفظ سیاسی ہے۔ اب میں کیا کہوں کہ سیاسی ڈرامے میں کیا ہوتا ہے۔ انجام اچھا نہیں ہوتا۔ ہماری نظر انجام پر ہوتی ہی نہیں ہم آغاز کے راز سے بھی واقف نہیں۔ اگر آغاز اور انجام کو مربوط رکھا جائے تو کچھ بھی غیر متوقع نہ ہو۔ موجودہ حالات میں میں توقع رکھنا ہی حماقت ہے' ہم حماقتیں کم کرتے ہیں مزید حماقتیں زیادہ کرتے ہیں۔

آخری بات یہ کہ ٹی وی سیریل عروسہ میں غزالہ کیفی نے ایک کشش ایک وقار ایک مقصد کو آغاز سے انجام تک قائم رکھا۔ میرے خیال میں یہ سیریل وہاں ختم ہو گیا تھا جب عروسہ کی منگنی پر اس کے طلاق یافتہ والدین اکٹھے ہوتے تھے۔ اس نے دو بچھڑے ہوؤں کو ملا دیا۔ میاں بیوی سابق ہو سکتے ہیں' والدین تو سابق نہیں ہو سکتے' کاش ہم رشتے کے اندر چھپے ہوئے جذبے سے باخبر ہوتے بلکہ اس کے مالک ہوتے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

گوہر سلطانہ کے لیے

پہلے اگر کہیں قتل ہوتا تھا تو پوری بستی ایک پراسرار دہشت میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ خوف سے بھری ہوئی دردمندی دلوں کو گھیرے رکھتی۔ محسوس ہوتا جیسے وہ ہو گیا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا جو نہیں ہونے والا تھا۔ اب قتل بلکہ قتل وغارت کی خبریں اوپر تلے آتی چلی جاتی ہیں اور لوگ انہیں پڑھتے سنتے ہیں جیسے کوئی دلچسپ کہانی ہوتی ہے۔ پھر یوں کہ جیسے یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہمارے ہاں اور تیسری دنیا میں لوگ مکھی مچھر کی طرح مارے جاتے ہیں' کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ ایسی خبر دو ایک روز تک نہ آئے تو لگتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ افسوس ناک حیرت ہے کہ یہ واقعات زیادہ تر مسلمان ملکوں' غریب ملکوں میں ہوتے ہیں۔

موت کئی رستوں سے آتی ہے' کبھی کبھی اس راستے سے آتی ہے کہ پہلے پتہ ہی نہیں ہوتا' یہ رستہ پھر غائب ہو جاتا ہے۔ قتل کی طرح خودکشی بھی جانا پہچانا رستہ ہے' یہ دونوں وارداتیں مشترک ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ یہ بھی ہوتا رہتا ہے کہ ظالم اور مظلوم دونوں ایک ہی شخصیت میں سمٹ آئیں قاتل اور مقتول دونوں کردار ایک عمل میں وجود پالیں۔

مجھے کراچی کی ایک شاعرہ سارہ شگفتہ کی خودکشی کا خیال آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قتل تھا۔ اس کے قاتلوں تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ پہچاننے کے لیے کسی خاص کوشش کی ضرورت نہ تھی۔ سارہ شگفتہ کی کتاب ''آنکھیں'' کے آخر میں ''پہلا حرف'' کے نام سے جو تحریر ہے وہ ایک مکمل ایف آئی آر ہے۔ تھانے والے تو بعض اوقات آنکھوں دیکھی واردات کی ایف آئی آر درج نہیں کرتے۔ سارہ شگفتہ کی ایف آئی آر وقت کی عدالت میں زیر سماعت ہے۔ وقت کے فیصلوں میں اندھیر یہ ہے کہ دیر ہو جاتی ہے ہماری عدالتیں یہ اندھیر بھی کرتی ہیں اندھیر کے ساتھ اندھیر ابھی شامل ہوتا ہے تو انصاف ناممکن ہو جاتا ہے۔

گوہر سلطانہ کی موت بھی ایک بھید کی طرح گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ موت بذات خود ایک بھید ہے۔ بعض اوقات موت اسی طرح آتی ہے کہ بھید ہی بھید بکھرتے چلے جاتے ہیں۔ نجانے کیوں قاتل اور ظالم کا پتہ نہ چلے تو وہ کچھ اور قاتل اور ظالم لگنے لگتے ہیں۔ نام کے بغیر دعا اور بددعا بے تاثیر سی لگتی ہیں۔ قتل اور ظلم کی نوعیت سیاسی ہو تو اس کے خلاف ردعمل نمایاں اور شدید ہو جاتا ہے' بالعموم یہ ردعمل ردی عمل سے زیادہ نہیں ہوتا۔ قانون نافذ کرنے والوں کی خبریں ردی کی ٹوکری سے کم نہیں ہوتیں۔

گوہر سلطانہ کا قتل سیاسی نہیں نجانے یہ کیوں مجھے سیاسی سا لگتا ہے جس عہد میں قتل گاہیں قاتلوں کے لیے پناہ گاہیں بن جائیں

KitaabPoint.blogspot.com

اور ظالموں تک پہنچنے میں دشواریاں حائل ہوں تو سوچنا پڑتا ہے کہ اصل میں حکومت کس کی ہے۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وارداتوں کو روکے یہ تو ہو کہ واردات ایسی حکایت نہ بن جائے جس کے کئی عنوان ہوں۔ حکایت میں کئی حکایتوں کو شامل کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ شکایتوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ یہ گندگی کے ڈھیر سے زیادہ نہیں ہوتا۔ لوگ ادھر سے گزرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد اس ڈھیر کو کہیں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کوئی قتل ہوتا ہے تو ایسی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں کہ اصل بات گم ہو جاتی ہے۔

ہم ایسی عورتوں کے لیے جینا ممکن کیوں نہیں رہنے دیتے جو صاف کمال بننے کی خواہش میں زندہ رہنا چاہتی ہیں۔ ایک خاتون دانشور جو زندہ رہنے کا سلیقہ تقسیم کرنا چاہتی ہے اور اپنی زندگی جینا چاہتی ہے آخر وہ کیوں ایسا نہیں کر سکتی۔ خودکشی کر لیتی ہے یا اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ اپنی موت کے بارے میں گوہر سلطانہ نے جو باتیں کیں اپنی نظموں میں جو کچھ اظہار کیا وہ صاحبان اختیار کے لیے لمحہ فکریہ ہے اب تو ہر لمحہ فکریہ ایک المیہ بن جاتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ گوہر سلطانہ کے دوستوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی وہ ایک بہادر عورت تھی تو پھر اس کے دوست اتنے بزدل کیوں ہیں کہ اس کے قاتلوں کی طرح چھپے بیٹھے ہیں۔

صرف احمد سلیم کا نام سامنے آیا ہے وہ منافق نہیں مرنجان مرنج ادیب ہے۔ اس کے لیے گوہر سلطانہ کے بھائی نے بھی اچھے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ مگر ایسا کیوں ہے کہ جو خاتون احمد سلیم کی دوست بنتی ہے اس کے دشمن دیدہ دلیر ہو جاتے ہیں' شگفتہ بھی احمد سلیم کی دوست تھی۔ گوہر سلطانہ کے بھائی صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ اب گوہر سلطانہ کو لاوارث نہ سمجھا جائے۔ لاش وارثوں کے ہی حوالے کی جاتی ہے۔ پولیس نے بھی گوہر سلطانہ کا سامان اس کے بھائی کے حوالے کر دیا ہے۔ سامان تو محفوظ ہو گیا ہے۔ گوہر سلطانہ مزید غیر محفوظ ہو گئی ہے۔ اس کے تنہا ہونے کی ذمہ داری اس کے شوہر کے علاوہ اس کے بھائی پر عائد ہوتی تھی۔ گوہر سلطانہ کے بارے میں ایسی ایسی باتیں بتائی جا رہی ہیں جو اس کی زندگی میں ممکن ہی نہ تھیں۔ طلاق اس کے ماتھے کا جھومر بنا' اب اس کے شوہر کے گلے کا ہار ہے' شہرت اس کے سب عزیزوں کو مل رہی ہے۔

گوہر سلطانہ کا قاتل کون ہے' غالباً یہ بھی ان قاتلوں کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے جو سزا اور جزا کو ملا جلا دیتے ہیں۔ ان ناموں کو ترتیب سے لکھا جائے تو ایک پوری کتاب بن سکتی ہے۔ اس کتاب کا انتساب گوہر سلطانہ کے نام ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ بھی مقتول مشہور ہوئے' اپنے شعبے میں ممتاز بھی تھے مگر متنازعہ بھی تھے۔ ظاہر ہے یہ انتساب علامہ احسان الٰہی ظہیر کے نام تو نہیں ہو سکتا۔

KitaabPoint.blogspot.com

یہ انتساب کسی ڈی آئی جی پولیس کے نام بھی ہوسکتا ہے' مگر وہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جب تک قاتل پولیس والوں کے سامنے خود نہ پیش ہو جائے' اسے تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ تلاش ہو جائے تو پکڑنا مشکل ہوتا ہے۔ صرف وہ قاتل پولیس والوں کے لیے اصل مجرم ہوتے ہیں جو اپنی کسی عزیزہ کو قتل کر کے آلہ قتل لہراتے ہوئے خود تھانہ پہنچ جاتے ہیں اور پولیس والے اس کو پکڑ لیتے ہیں۔ جو قاتل موقعہ واردات سے بھاگ جاتے ہیں پولیس انہیں بہت بے اصول قاتل سمجھتی ہے۔ پولیس اصل قاتلوں مجرموں تک کیوں نہیں پہنچ سکتی' کیوں پہنچنا نہیں چاہتی؟ اس سوال کا ڈی آئی جی رانا مقبول احمد کے پاس کیا جواب ہے۔ رانا صاحب تقریر کریں تو ادیب لگتے ہیں' ایک ادیبہ کے بزدلانہ قتل پر ان کا کیا تاثر ہے۔ میں گوہر سلطانہ کو نہیں جانتا مگر میں نے اپنے اندر چاہا کہ لوگ میرے ساتھ اظہار تعزیت کریں۔ میں نے آخر خود اپنے ساتھ اظہار تعزیت کیا۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

سیاسی قربانی کا تسلسل

غنی کاشمیری بہت قلندر شاعر تھا۔ اس کی شہرت برصغیر میں پھیلی تو مغل بادشاہ کو بھی اس سے ملنے کا شوق ہوا۔ کشمیر کے گورنر نے بادشاہ کا پیغام غنی کاشمیری کو پہنچایا تو اس نے کہا کہ میں دربار شاہی میں نہیں جاؤں گا۔ گورنر نے کہا کہ بادشاہ کے حکم کی تعمیل کے لیے کیا کیا جائے؟ غنی کاشمیری نے گورنر سے کہا کہ تم بادشاہ کو لکھ دو کہ غنی پاگل ہو گیا ہے۔ گورنر حیران ہوا کہ میں یہ بات کیسے لکھ سکتا ہوں تو غنی نے وہیں کپڑے پھاڑ ڈالے۔ سر میں خاک ڈال لی اور جنگل کی طرف نکل گیا۔

راجیو گاندھی کی بیوہ اور اندرا گاندھی کی بہو سونیا گاندھی نے کانگریس کی سیاسی ساکھ کو نہرو خاندان کے خون سے ہرا بھرا رکھنے والے سیاستدانوں کی یہ پیشکش ٹھکرا دی ہے کہ وہ کانگریس کی قیادت قبول کر لیں۔ سونیا نے قربانی کا بکرا بلکہ بکری بننے سے انکار کر دیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے تو راجیو کو بھی سیاست میں حصہ لینے سے منع کیا تھا۔ غنی کاشمیری کو تو شاہی دربار سے خلعت انعام میں ملی۔ جمہوری دربار میں جانے پر تو یقیناً تاج و تخت ملے گا۔ وہ عقلمند عورت ہے' اسے پتہ ہے کہ تخت اور تختے میں زیادہ فرق نہیں ہے اور وہ اندرا اور راجیو گاندھی کے نقش قدم پر چل کر حکمرانی تو حاصل کر لے گی' قربانی بھی اس راہ پر دینا پڑتی ہے۔

وہ مجبور ہو کر بھارت چھوڑ دینے کا فیصلہ بھی کر سکتی ہے۔ مگر ابھی اسے اپنے بچوں کے ارادوں کا علم نہیں۔ سنا ہے بینظیر بھٹو نے سونیا کو کانگریس کی قیادت قبول کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ بلکہ دیوانیاں دو' بلکہ دیوانیاں تین چار' بنگلہ دیش کی خالدہ ضیاء کی خامیابی سے بھی سیاسی عورتوں کی امید تازہ ہو گئی ہے اگر سونیا بھارت کی وزیر اعظم بن گئیں اور اس نے چاہا تو ضرور بن جائیں گی۔ اگر یہ کسی خفیہ طاقت کی خواہش ہے تو بھی وہ ضرور بنیں گی' کیونکہ اپنی مطلب کی حکومت لانے کے لیے یہ جدید ترین طریقہ کامیاب ہے۔ اندرا کو مروایا گیا اور اس کے نتیجے میں راجیو کو اقتدار میں آنے سے کوئی نہ روک سکا جبکہ اندرا کی کامیابی مشکوک تھی۔

مغربی اجارہ داری مشرقی دنیا کو ذہنی طور پر پسماندہ ہونے کا طعنہ دیتے ہیں اور عورتوں کے حقوق کے ٹھیکیدار بن جاتے ہیں۔ ان کے سارے ملکوں میں اتنی عورتیں سربراہ مملکت نہیں بن سکیں۔ جتنی انہوں نے مشرق میں بنوا دیں اور طعنہ پھر بھی اپنی جگہ پر کہ ہم عورت کے حقوق کو پامال کر رہے ہیں۔ امریکہ میں تو اب تک کوئی عورت صدر نہیں بن سکی۔ میں عورت کی سربراہی کے خلاف نہیں میں

KitaabPoint.blogspot.com

صرف مغرب کے اس ذہنی رویے کی نشاندہی کر رہا ہوں جو اس نے ہمارے بارے میں بنا رکھا ہے۔ ہماری عورتوں کو سیاسی میدان میں لانے کے لیے ان کے باپوں اور شوہروں کو قتل کرانا ایک مشغلہ بنا لیا گیا ہے۔ سری لنکا کے بندرانائیکے کو مروایا گیا تو مسز بندرانائیکے آئی۔ بنگلہ دیش کے صدر ضیاء الرحمان کو قتل کر دیا گیا تو محترمہ خالدہ ضیاء آئیں۔ اکینو کے قتل کے بعد مسز اکینو آئیں۔ اب سونیا گاندھی کی وزارت عظمیٰ ثابت کر دے گی کہ راجیو گاندھی کے قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟ خفیہ ایجنسیاں غریب قوموں کے جذبات سے کھیل کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتی ہیں۔ برصغیر میں عورت کی حکمرانی کی ہیٹ ٹرک مکمل ہو جائے گی۔ ویسے ہیٹ ٹرک تاریخی طور پر ہو چکی ہے کہ تینوں ملکوں میں عورت حکمران رہ چکی ہیں۔ ایسی خبریں آ رہی ہیں کہ سونیا کی بجائے اس کی بیٹی پریانکا زیادہ پرجوش ہے مگر ابھی پریانکا کی عمر چھوٹی ہے چنانچہ اس کے لیے ایک آدھ قربانی کی ضرورت ہے۔ موروثی سیاست کے دائروں میں اس سوال کا جواب کہ میں کب برسر اقتدار آؤں گا؟ کہا جائے گا بس ایک آدھ مقبول لیڈر کے قتل کے بعد۔ مجھے پھر غنی کاشمیری یاد آتا ہے کہ وہ جب گھر میں ہوتا تو دروازے کو تالہ لگا کر رکھتا اور جب باہر جاتا تو دروازہ کھلا چھوڑ جاتا! کسی نے پوچھا کہ یہ کیا راز ہے؟ تو سچے شاعر نے کہا کہ گھر میں سب سے قیمتی چیز میں خود ہوں' لہٰذا حفاظت کی ضرورت مجھے ہے۔

راجیو گاندھی کی زندگی وزارت عظمیٰ سے کہیں قیمتی تھی۔ سونیا کے لیے بھی قیمتی چیز یہی تھی اپنے بارے میں اور اپنے بچوں کے بارے میں بھی اس کا یہی خیال ہوگا۔ اسے چاہیے کہ شاعری شروع کر دے۔ ویسے سنا ہے کہ وہ بہت اچھی بیوی تھی۔ وہ راجیو گاندھی سے زیادہ اچھی ہندی زبان جانتی ہے۔ شاعری سے بھی اسے یقیناً دلچسپی ہوگی۔ وہ غنی کاشمیری کو پڑھے۔ نہرو خاندان کی سیاسی کارروائیوں کا شکار ہو کر پنجاب میں سکھ قربان ہو رہے ہیں۔ کشمیر میں مسلمان قربان ہو رہے ہیں۔ مسلمان تو ذبح ہو رہے ہیں اور پورے بھارت میں ہو رہے ہیں۔ وہ عورت جس نے راجیو کو قتل کرنے کے لیے خود کو قربان کر دیا اور وہ عورتیں جو بھارتی زندگی کا سامنا کرتے ہوئے کشمیر میں اپنے آپ کو قتل کر رہی ہیں۔ بھارت کی سیاسی تاریخ میں انہیں بھی بھلایا نہ جا سکے گا۔

عورت ہی عورت کے دکھ کو سمجھ سکتی ہے اور عورت ہی عورت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ کیا کہتی ہے اس ضمن میں سونیا رانی؟

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

کشمیر کا صدام حسین

پیر پگاڑا کے بیانات لوگ اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کالم پڑھ رہے ہوں۔ آج کل وزیر اعظم آزاد کشمیر ممتاز حسین راٹھور کے بیانات بھی خاصے دلچسپ ہوتے ہیں۔ پیر صاحب مذاق مذاق میں خاصی سنجیدہ باتیں کر جاتے ہیں۔ راٹھور صاحب سنجیدگی سے بات کرتے ہیں مگر لگتی مذاق ہے۔ یہ تو اپنا اپنا اسلوب ہے اور کہتے ہیں کہ اسلوب شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔

جن دنوں خلیج کی جنگ زوروں پر تھی اور لوگ صدام حسین کو امریکہ کے خلاف ڈٹ جانے پر ہیرو کے روپ میں دیکھ رہے تھے اس کے حق میں ہر روز مظاہرے ہو رہے تھے جو اصل میں حکومت کے خلاف ہوتے تھے۔ اس طرح کچھ سیاست دانوں نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کی اور عادی مظاہرین نے ایک ٹکٹ میں دو مزے اٹھائے۔ ادھر بارود کی بارش ہوتی تھی۔ ادھر بیانات کی برسات جاری تھی۔ مینہ رک گیا مگر چھت ابھی تک ٹپک رہی ہے۔

ان دنوں صدام حسین کی تصویریں شہر کی دیواروں اور لوگوں کے سینوں پر نظر آئی تھیں۔ وہ مقبولیت کے معراج پر تھا۔ پیپلز پارٹی کے جیالے اپنی لیڈر کے برعکس صدام حسین کے نعرے لگا کر اپنا را نجھا راضی کر رہے تھے۔ ناراض وہ اپنی ہیر کو نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ صدام حسین ہار گیا مگر اس کے حمایتی نہیں ہارے۔ تب ممتاز حسین راٹھور نے ایک بیان دیا تھا کہ اس وقت دنیا میں دو لیڈر امریکہ کی آنکھ میں کھٹک رہے ہیں۔ ایک صدام حسین اور دوسرا ممتاز حسین۔ راٹھور صاحب اس عمر میں اپنا نام نہ بدل سکتے تھے ورنہ وہ خود کو ''ممتام'' حسین کہتے تاکہ قافیہ بھی مل جاتا۔ وہ اچھے رہے کہ صدام حسین کا قافیہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں مجھے وہ شاعر یاد آ رہا ہے جس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شاعر کو کہا کہ بس دنیا میں دو ہی شاعر ہیں۔ ایک آپ اور ایک میں۔ آپ بھی کیا ہیں بس میں ہی میں ہوں۔

راٹھور صاحب کی حد تک تو یہ بات درست ثابت ہوگئی ہے۔ صدام حسین کی پٹائی کے بعد اب ممتاز حسین ہی باقی رہ گئے ہیں۔ وہ کشمیر کی آزادی کے لیے سکڈ میزائل کی طرح تباہ کن بیانات داغ رہے ہیں۔ وہ تو اب پتہ چلا کہ سکڈ میزائل تو فیل ہو گئے۔ کشمیر کے ضمن میں ہمارے بیانات کا حشر بھی یہی ہوا ہے۔ اس کے لیے کچھ اور ہی حکمت عملی اپنانا پڑے گی۔ مقبوضہ کشمیر میں جتنے مظالم ہو رہے ہیں وہ فلسطین میں ہونے والے مظالم سے کم نہیں۔ ممتاز حسین سے گزارش ہے کہ وہ صدام حسین کے نقش قدم پر نہ چل پڑیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

یہ مرحلے جلد بازی سے طے ہونے والے نہیں ہوتے۔ تدبیر اور اتحاد سے پایہ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔

راٹھور صاحب کو معلوم ہے کہ کشمیر کا ایک لیڈر تھا' شیخ عبداللہ۔ اس میں قومی سطح کے لیڈر کے اوصاف تھے مگر اس کا کیا حشر ہوا؟ وادی میں اب تک ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کے نعرے گونج رہے ہیں۔ جس نے بھی اس تصور سے غداری کی وہ خوار ہوا۔ صدر آزاد کشمیر سردار عبدالقیوم خان کو سیاسی حلقوں میں ایک مقام حاصل ہے۔ ان کی زندگی ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کی آرزو کی تصویر ہے۔ ان سے اختلافات ہو سکتے ہیں مگر ان کے لیے راٹھور صاحب کا بیان بہت عجیب و غریب ہے کہ وہ میری اجازت کے بغیر راولپنڈی بھی نہیں جا سکتے۔ مجھے ایک سردار صاحب یاد آ گئے ہیں جو گیٹ پر چوکیدار کے طور پر تعینات تھے۔ لوگ بلا روک ٹوک آ جا رہے تھے۔ ایک شریف آدمی نے مروتاً ان سے پوچھ لیا کہ میں اندر جا سکتا ہوں؟ سردار صاحب نے کہا کہ نہیں۔ یہاں آرام سے کھڑے ہو جاؤ۔ وہ بے چارا کھڑا ہو گیا۔ لوگ بدستور آ جا رہے تھے۔ شریف آدمی نے ہمت کر کے پوچھ لیا کہ جناب ان لوگوں کو آپ کیوں نہیں روکتے تو سردار صاحب نے بڑی سادگی سے جواب دیا کہ انہوں نے کوئی مجھ سے پوچھا ہے؟

صدر قیوم خان اگر راولپنڈی چلے جاتے ہیں تو وہ راٹھور صاحب سے پوچھتے نہیں۔ ورنہ وہ مظفر آباد کے ایوان صدر کے ''قیدی'' ہوتے۔

صدر اور وزیر اعظم کے اختلافات پاکستان میں سیاسی زندگی کے لیے کبھی اچھے نہیں ہوئے تو آزاد کشمیر کے لیے کس طرح بہتر ہو سکتے ہیں۔ حکومت پاکستان سے بگاڑ کر بھی راٹھور صاحب کچھ اچھا نہیں کریں گے۔ وہ پیپلز پارٹی کے ایک مخلص اور مستعد کارکن ہیں۔ اس سے پہلے خان عبدالرحمٰن خان کی حکومت میں وزیر رہ چکے ہیں۔ اپنی پارٹی سے وفاداری ایک اچھی مثال ہے۔ انہوں نے بینظیر بھٹو کو کشمیر ہاؤس راولپنڈی میں گارڈ آف آنر پیش کر دیا۔ وہ لاڑکانہ کو اپنا سیاسی کعبہ بنا رہے ہیں۔ یہ باتیں اس صورت میں اور بھی قابل تحسین ہیں جبکہ بینظیر بھٹو وزیر اعظم نہیں ہیں۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ہماری تمنا ہے کہ کشمیر آزاد ہو اور راٹھور صاحب کو سری نگر کے قبرستان میں جگہ ملے۔ وہ لاڑکانہ میں دفن ہونا پسند کرتے ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اتنی بات راٹھور صاحب اپنے ذہن میں رکھیں کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔ ہم راٹھور صاحب کی وفاداریوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر ان کے بیانات سے حکومت پاکستان کو چڑانے کا تاثر ملتا ہے۔ انہوں نے ایک دفعہ اس طرح بات کی کہ نواز شریف وزیر اعظم ہیں تو میں بھی وزیر اعظم ہوں۔ یہ بات بظاہر بہت سادہ اور ٹھیک

KitaabPoint.blogspot.com

ہے۔ برابری کے دعوے میں بھی ایک طنز ہے اور یہاں مقابلے کی دعوت کا انداز بنتا دکھائی دیتا ہے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

ایک چیونٹی اور ایک ہاتھی پل پر سے گزر رہے تھے۔ پل ہل رہا تھا۔ چیونٹی نے ہاتھی سے کہا کہ پتہ نہیں کیا بات ہے' جب تم اور میں ایک ساتھ پل پر سے گزرتے ہیں تو پل ہلتا کیوں ہے؟ میری دعا ہے کہ پل ہلتا رہے مگر ٹوٹ نہ جائے۔ اعتماد اور رواداری ایسا پل ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتا۔ ہمارے سیاست دان صرف بیان دینے میں تھوڑی سی احتیاط کر لیا کریں تو ہمارے بہت سارے مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔ میرے خیال میں اگر پاکستان اور بھارت دونوں تھوڑی دیر کے لیے ذرا دور ہو کے بیٹھیں اور کشمیریوں کو موقع دیں کہ وہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کریں۔ اگر کشمیر خود مختار ہو جائے تو وہ آزاد تو ہو گا اور بہر حال ایک مسلمان ریاست ہو گی۔ ہم نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا تو کشمیر کے لیے کیا جھجک ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

چند لمحے گورنر ہاؤس میں

گورنر پنجاب اور میرا معاملہ آج کل ایک جیسا ہے۔ کہیں کہیں معاملہ مقابلہ بن گیا ہے۔ میاں اظہر نے کہا ہے کہ وہ آج کل بہت خوش ہیں' ان کی بیوی راولپنڈی گئی ہوئی ہے جبکہ میری میانوالی گئی ہوئی ہے۔ اس معاملے میں میرا پلہ بھاری ہے کیونکہ میانوالی میں پنڈی سے زیادہ گرمی پڑ رہی ہے۔ اس کے باوجود کہ مجھے چائے خود بنانا پڑتی ہے اور دودھ کو جاگ بھی خود لگانا پڑتی ہے۔ البتہ وہ لوگ مجھ سے بھی آگے ہیں جو بیوی کی موجودگی میں بھی چائے خود بناتے ہیں۔

میاں صاحب نے کہا کہ وہ بیوی سے ڈرتے تھے یعنی آج کل نہیں ڈرتے تو پھر ان کے ساتھ کیا مقابلہ جو آج بھی بیوی سے ڈرتے ہیں۔ میرا پلہ یہاں بھی بھاری ہے۔ میں اتنا بے بس ہوں کہ کہہ بھی نہیں سکتا کہ میں بیوی سے ڈرتا ہوں۔ ایک شخص ہانپتا کانپتا تھانے پہنچا اور انسپکٹر سے کہا کہ مجھے جیل بھیج دیجئے میں نے اپنی بیوی کو مار دیا ہے۔ انسپکٹر گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور پوچھا کیا وہ واقعی مر گئی ہے۔

یہی تو مصیبت ہے۔ اس شخص نے کہا کہ وہ بچ گئی ہے مجھے جلدی سے جیل بھیج دیجئے۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس شخص کو جیل نصیب ہوئی کہ نہیں۔ میاں اظہر صاحب کو گورنر ہاؤس بھیج دیا گیا ہے۔ میرا حال دیکھیں کہ میں ابھی تک گھر میں ہوں۔

مشہور شاعر ضمیر جعفری سب سے اچھے رہے۔

میری بیوی قبر میں لیٹی ہے جس ہنگام سے
میں بھی ہوں آرام سے اور وہ بھی آرام سے

ایک دن میں نے جعفری صاحب سے مرحومہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا اوئے آہستہ بول وہ ساتھ والے کمرے میں موجود ہے۔ میں نے پریشان ہو کر پوچھا کہ پھر یہ شعر آپ نے اپنی کونسی بیوی کے بارے میں کہا ہے تو انہوں نے کہا کہ کہا تو انہی کے بارے میں ہے۔ یہی چار بیویوں کے برابر ہیں۔ پھر کہا کہ چار میں نے مولویوں کے ڈر سے کہا ہے کہ شریعت میں چار بیویوں کی اجازت ہے ورنہ میں کم از کم ایک سو بیویاں کہتا۔ ایک ٹھیک ٹھاک بیوی کئی سو بیویوں سے زیادہ خطرناک بلکہ عبرت ناک ہوتی ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

ایک ایسی ہی بیوی نے شوہر سے پوچھا کہ اگر خدانخواستہ گھر میں چور آ جائیں تو تم کیا کرو گے۔ اس نے جواب دیا کہ وہی کروں گا جو وہ کہیں گے۔ میں نے گھر میں اپنی مرضی سے کوئی کام کیا ہے؟

محترم میاں اظہر صاحب سے بہتر آدمی کون تھا جسے گورنر ہاؤس میں بھیجا جاتا۔ وہ یہاں بھی اسی طرح رہ رہے ہیں جس طرح شوہر ہاؤس میں رہتے تھے۔

یہ گھر آج کل پرسکون اور پر بہار ہے۔ یہاں صرف خاص بندے ہی نہیں آ سکتے' جس کا جی چاہے آئے اور میاں صاحب سے گپ شپ لگائے۔ وہ تو جیسے انتظار میں بیٹھے ہوتے ہیں جس سکول والوں کو کہیں فنکشن کرنے کے لیے جگہ نہیں ملتی وہ بچوں کو لے کر گورنر ہاؤس آ جاتے ہیں۔ دہشت حیرت میں بدلتی چلی جاتی ہے۔

اظہر صاحب سے پہلے کھر نے اس گھر میں کچھ عرصہ گزارا۔ انہوں نے اسے شادی گھر بنا دیا تھا۔ تب یہاں عورتیں بہت آتی تھیں اور یوں آتی تھیں جیسے شادی میں آئی ہوں۔ کچھ کا انداز تو ایسا ہوتا تھا جیسے شادی کے لیے آ رہی ہوں۔

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔

ملک امیر محمد خان کے زمانے میں عورتوں کا داخلہ گورنر ہاؤس میں بند تھا۔ تب یہاں بچے بھی نہ آتے تھے۔ وہ مغربی پاکستان کے گورنر تھے۔ ان کی وہی حیثیت تھی جو ان کے بعد پورے پاکستان کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی ہوتی تھی۔ کہتے ہیں کہ وہ گورنر ہاؤس میں کچھ وقت اور رہتے تو دوبارہ مارشل لاء کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ وہ واحد حکمران تھے جو اخبار والوں سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ میاں اظہر صاحب نے تو صاف اعلان کیا ہے کہ میں اخبار والوں سے ڈرتا ہوں۔ حالانکہ اخبار والے ہمیشہ ان کی شرافت کی تعریف ہی کرتے ہیں۔ ویسے اب ملک میں کوئی ایسا واقعہ ہی نہیں ہوتا کہ جس کی خبر بن کر شائع ہو اور لوگ خوش ہوں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ میاں صاحب اخبار پڑھتے ہیں۔

میاں صاحب نے ایک گاؤں کا اچانک دورہ کیا تھا۔ تو وہاں عورتوں اور بچوں نے رو رو کے اپنے اوپر ڈھائے جانے والے مظالم کے بارے میں بتایا تھا۔ صوبے کے گورنر کو دیکھ کر بے چارے لوگ دلیر ہو گئے تھے ورنہ تو وہ فریاد سے بھی محروم ہیں۔ وہ تو ڈر کے مارے رو بھی نہیں سکتے۔ ان کے آنسوؤں سے لکھی خبر میاں صاحب نے پڑھی ہوگی۔ ظلم ڈھانے والوں کے نام بھی شائع ہوئے تھے مگر اس کے بعد اس سلسلے میں کوئی خبر نہیں آئی۔ ایسی خبریں پڑھنے کو کیوں نہیں ملتیں جو خبریں ملتی ہیں ان کی اشاعت سے لوگ ڈریں گے نہیں تو کیا کریں گے۔

KitaabPoint.blogspot.com

جنرل ٹکا خان بھی موزوں ترین گورنر تھے۔ نہ انہیں سنائی دیتا تھا نہ دکھائی دیتا تھا۔ ان کے زمانے میں گورنر ہاؤس ریسٹ ہاؤس بن گیا تھا۔ اسے گیسٹ ہاؤس کہنا چاہیے اس عمر میں آدمی اپنے گھر میں بھی مہمان ہوتا ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

مرارجی ڈیسائی کا قرض

صحافی زیداے سلہری' الطاف حسن قریشی اور شاعر مظفر وارثی کو تو قومی ایوارڈ مل گیا ہے مگر بھارت کے ایک سابق وزیراعظم پاکستان دوست اور سچے ہندو لیڈر مرارجی ڈیسائی کو نشان پاکستان نہیں ملا۔ جبکہ انہیں بھی یہ ایوارڈ مرحوم صدر ضیاء الحق نے اگست 88ء کو دینے کا اعلان کیا تھا۔ پھر 17 اگست کا سانحہ ہوا اور دسمبر 88ء میں محترمہ بینظیر بھٹو برسر اقتدار آ گئیں۔ انہوں نے ضیائی باقیات کو مٹانے کے لیے اندھا دھند کچھ واقعات کئے۔ چنانچہ سلہری صاحب قریشی صاحب اور وارثی صاحب کے علاوہ ڈیسائی صاحب کا ایوارڈ بھی منسوخ کر دیا گیا۔ اب جو ڈیسائی صاحب کو ایوارڈ دینے کا معاملہ ملتوی کیا گیا ہے تو اس کی وجوہات وہ نہیں جو محترمہ کے ذہن میں تھیں۔ محترمہ بینظیر بھٹو تو راجیو گاندھی کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھیں جبکہ اب نواز شریف محترمہ بینظیر کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔ دونوں وجوہات میں جو فرق ہے اسے بیان کرنے کے لیے پوری کتاب چاہیے۔ شری مرارجی ڈیسائی بھارت میں سب سے مخلص پاکستانی لابی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس میں پاکستان کا کوئی عمل دخل نہیں۔ ڈیسائی صاحب نہرو خاندان کو پسند نہیں کرتے انہوں نے ہمیشہ ان کی بے جا پاکستان دشمنی کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ ہندو سیاست میں وہ سب سے موثر آواز ہے جو مسلمانوں اور پاکستانیوں کے لیے خیر کی خوشبو تقسیم کرتی ہے۔ جرات اور دیانت کے بغیر اچھی اور سچی باتیں نہیں کہی جا سکتیں۔ وہ جو بے نیازانہ مستی میں کہہ جاتے ہیں کوئی دوسرا اس طرح نہیں کہہ سکتا۔ اس طرح کی بات کبھی کوئی مسلمان لیڈر کہہ دے تو اس کا جینا حرام کر دیا جاتا ہے۔ ڈیسائی صاحب نے اپنی وزارت عظمیٰ کے دوران ایک بڑی طاقت کے کہنے کے باوجود پاکستان کے کے ساتھ جنگ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے نہرو' اندرا اور راجیو کی اس پالیسی سے کبھی اتفاق نہیں کیا کہ پاکستان کی مخالفت کے نعرے سے اپنے وطن کے غریب لوگوں کو بے وقوف بنایا جائے۔ بھارت میں کسی ہندو لیڈر کی طرف سے پاکستان کے خلاف بات نہ کرنا حیران کن بات ہے۔ بھارت اور کسی حد تک پاکستان کی سیاست ایک دوسرے سے مخالفت کے سہارے چل رہی ہے۔ کچھ بھارتی حکمرانوں اور سیاست دانوں کے انتہا پسندانہ رویئے نے اس صورت حال کو بہت زیادہ بگاڑ دیا ہے۔

بھارتی حکومت کو جب کوئی مشکل پیش آتی ہے تو وہ پاکستان کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتی ہے۔ ایک بھارتی وزیر کو بتایا گیا کہ شہر سے تین میل کے فاصلے پر ایک بس اور ٹرک کی ٹکر ہو گئی ہے تو اس نے فوراً بیان جاری کر دیا کہ اس واقعہ میں یقیناً پاکستان کا ہاتھ ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

بے چارے بھارتی مسلمانوں پر پاکستانی ایجنٹ ہونے کا الزام بڑی آسانی سے لگا دیا جاتا ہے۔ آج کل کشمیری مسلمان اسی الزام کا وحشیانہ شکار بنے ہوئے ہیں۔ کشمیر میں آتش چنار کو ایک دن آتش فشاں بننا ہی تھا۔

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

متعصب ہندوؤں کو خالصتان تحریک کے حوالے سے سکھوں اور مسلمانوں میں بڑی مشابہتیں نظر آنے لگی ہیں۔ اس ضمن میں دلیل یہ ہے کہ جو لطیفے مسلمان پاکستان میں سکھوں کے نام سے سناتے ہیں' وہی لطیفے سکھ بھارت میں پاکستانی مسلمانوں کے نام سے سناتے ہیں۔ بھارتی مسلمانوں کے نام سے لطیفہ سنایا جائے تو کھل کر ہنسی نہیں آتی اور اس الزام کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ بھارت میں سکھ مسلم اتحاد کے ذریعے بھارت کے مزید ٹکڑے کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔ ویسے دل لگی اور دلیری میں سکھوں اور پٹھانوں میں کچھ صفات مشترک ہیں اور پٹھان بہت پکے مسلمان ہیں۔ ہندوستان پر پٹھان مسلمانوں کی برتری کی تاریخ بہت طویل ہے۔

بھارتی حکمران وطن دشمن پاکستانی لیڈروں اور دانشوروں کی پذیرائی کر کے پاکستانیوں کو چڑانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انہوں نے سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان کو اپنا سب سے بڑا اعزاز دے دیا اور اس واقعے کو پوری دنیا میں پاکستان کے خلاف زہریلے پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کیا۔ ہمارے ہاں جو دانشور اور سیاست دان پاکستان قائداعظم اور علامہ اقبال کے خلاف باتیں کرتے ہیں تو بھارتی حکومت ان کی سرپرستی کرتے ہوئے باقاعدہ مہم چلا دیتی ہے۔ پاکستان میں پاکستان کی مخالفت بڑا آسان کام بنتا جارہا ہے۔ ایسا شخص چند دنوں میں مشہور اور مالدار ہو جاتا ہے جبکہ بھارت میں پاکستان کی جائز حمایت میں بولنا بھی مشکل کام ہے۔ چنانچہ ڈیسائی صاحب کے علاوہ کوئی نمایاں نام نہیں جو اس طرح کھلم کھلا بات کر سکے۔ ڈیسائی صاحب بجا طور پر نشان پاکستان کے مستحق ہیں۔ نجانے مرحوم صدر ضیاء الحق سے پہلے پاکستانی قیادت کو اس کا خیال کیوں نہ آیا۔ یہ ایک غیر معمولی اور غیر متوقع فیصلہ تھا' جو پاکستانیوں کے لیے خوشگوار حیرانی اور بھارتیوں کے لیے ناگوار پریشانی کا باعث ہوا۔ پہلی بار پاکستان کے معاملے میں سفارتی سطح پر بھارت کو دفاعی انداز اختیار کرنا پڑا۔ ورنہ ان کی طرف سے جمہوریت اور ثقافت کے بہانے سے برتری کا غبار پھیلانے کی کوشش مسلسل جاری ہے۔ پاکستانی قیادت کی بھارت کے حوالے سے چھوٹی موٹی سیاست ختم ہوئی تو وہاں ایک کھلبلی مچ گئی۔ راجیو گاندھی کے ایما پر سفارتی حلقے سرگرم ہوئے اور یہ کوشش کی گئی کہ ڈیسائی صاحب یہ ایوارڈ لینے میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ ان کی مشکل اس طرح حل ہوئی کہ محترمہ بینظیر بھٹو پاکستان کی حکمران بن گئیں اور یہ یادگار واقعہ وقوع پذیر نہ ہو سکا۔

KitaabPoint.blogspot.com

ڈیسائی صاحب نے 88ء میں ایوارڈ لینے کے لیے پاکستان آنے کا اعلان کیا تھا۔ یہ اعلان انہوں نے اب بھی کیا ہے۔ ڈیسائی صاحب کی جرات قابل داد ہے۔ وہ بڑے دلچسپ انسان ہیں۔ وہ پیر پگاڑا صاحب کی طرح باتیں تو نہیں کرتے۔ سچی بات کہنے سے نہیں گھبراتے۔ کبھی کبھی وہ بچوں کی طرح سچ بول دیتے ہیں۔ بزرگوں میں بچوں والی صفات پیدا ہو جائیں تو ان کی صحت بہت بہتر ہو جاتی ہے۔ ڈیسائی صاحب اسلامی نظام کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک دفعہ پیشاب پینے کی عادت کو اپنی طویل عمری کے راز کے طور پر بیان کر دیا۔ کئی لوگ باوجود کوشش کے دوا کے طور پر بھی ایسا نہیں کر سکے۔ ڈیسائی صاحب جب بھارت کے وزیر اعظم تھے تو انہوں نے شراب کی فروخت کے لیے دو دن کا ناغہ مقرر کر دیا۔ جس طرح ہمارے ہاں گوشت کے لیے دو دن کا ناغہ ہوتا ہے اس طرح گوشت خوری اور شراب نوشی میں کمی تو خیر کیا ہوتی مگر اس عادت کی حوصلہ شکنی ضرور ہوئی۔ ہمارے ہاں لوگ گوشت سے وہ کام لینے کی کوشش کرتے ہیں جو شراب سے بھی ممکن نہیں ویسے پاکستان میں بھارتی شراب بکثرت مل جاتی ہے البتہ بھارت میں ڈیسائی صاحب کے اس فیصلے کو بھی اسلامی اور پاکستانی کہا گیا۔

بھارت کو بڑی مشکل سے ایک سیکولر وزیر اعظم نصیب ہوا تھا مگر..... !

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

ردِانقلاب......روسی انقلاب

روس میں انقلاب آیا اور آ کے چلا بھی گیا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کے

ایسے انقلاب دو چار اور آئے اور آ کے چلے گئے تو انقلاب اور آوارگی کا مفہوم ایک ہو جائے گا۔ کسی کو پوری طرح خوش بھی نہیں ہونے دیا گیا۔ کسی کو حیران نہیں ہونے دیا گیا۔ کسی کو کھل کر پریشان نہیں ہونے دیا گیا۔ یہ بڑی زیادتی ہے۔ اس انقلاب سے تو اضطراب بہتر تھا۔ البتہ جو کچھ اب ہو رہا ہے لگتا ہے ردِانقلاب زیادہ انقلاب ہے۔ ڈر ہے کہ یہ ردِانقلاب روسی انقلاب نہ بن جائے۔ امریکی ٹی وی کے سامنے ماسکو میں لینن کا مجسمہ گرانے والے روسی انقلابی نہیں ہو سکتے۔ کمیونسٹ پارٹی ختم کے جی بی معطل' انقلاب تو یہ ہے جیسے یہی کچھ کرنے کے لیے سارا ڈرامہ کیا گیا تھا۔ کمبل گم کرنے کے بعد ایک شریف آدمی نے کہا تھا۔ کہاں کا میلہ یہ سب کچھ میرے کمبل کے لیے کیا گیا تھا۔ روسی عوام تو شاید کمیونزم کا کمبل اوڑھنے کے فوراً بعد چھوڑنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ کمبل انہیں نہیں چھوڑتا تھا۔ وہ روایت سچی لگتی ہے کہ لوگ جسے کمبل سمجھ رہے تھے وہ تو ریچھ تھا۔ جس نے مضمحل شخص کو جپھا مارا ہوا تھا۔ جسے وہ درانتی سمجھے تھے وہ ریچھ کے ہاتھ تھے۔ وہ کمبل بھی ہوتا تو اسے اتار پھینکنا ممکن نہ تھا۔ اس کے ٹکڑے کئے بغیر نجات مشکل تھی۔ روسیوں نے اب جابر ریچھ کے ساتھ یہی کیا۔ روسیوں کے جھنڈے پر بھی کسی کمبل کا گمان گزرتا تھا۔ اس پر درانتی بھی ہے۔ تھکے ہوئے ریچھ کی طرح کام کرانے والے کسان نے بجا کہا تھا۔

میں تھک گیا ہوں۔

میری درانتی کی نوک مٹی میں پھنس گئی ہے۔

روسیوں کو کمیونزم سے نجات مبارک مگر ان سے ایک شکایت بھی ہے۔ روسیوں کے لیے لینن کے احسانات کچھ کم نہیں۔ زار روس کے جبر و استبداد کے پنجے سے انہیں آزاد کرانے والا لینن ہی تھا۔ لینن کی ''لاش'' کو ماسکو کی گلیوں میں جس طرح گھسیٹا گیا۔ افسوس ناک ہی نہیں شرمناک بھی ہے۔ میں اسلامی اخوت' معاشی انصاف اور انسانی مساوات کا پرچارک ہوں مگر روسی کمیونزم کے قطعاً حق میں نہیں۔ ایک مفکر اور لیڈر کے طور پر میرے دل میں لینن کے لیے احترام کے جذبات ہیں۔ لینن دنیا بھر کے انسانوں کے ایک

KitaabPoint.blogspot.com

مظلوم گروہ کا لیڈر ہے۔ روس میں ایک مذاقیہ انقلاب کے خلاف غصے کے اظہار کا یہ طریقہ بالکل مستحسن نہیں۔ سقوط مشرقی پاکستان اور ایک دکھ بھری زندگی کا بدلہ خاکم بدہن قائداعظم کی تصویر پھاڑ کر تو نہیں لیا جا سکتا۔ لیڈرز سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے مگر ان کی توہین ایک مذموم فعل ہے۔ کل امریکہ میں روس جیسی صورت حال پیدا ہوگی۔ جلد یا بدیر ایسا ہوگا کہ اب باری امریکہ کی ہے۔

ہر فرعونے راموسیٰ

کبھی کسی نے سوچا تھا کہ روس اس مقام پر جا کھڑا ہوگا۔ اس طرح کے مقام پر جا کے کیا امریکی واشنگٹن اور لنکن کے مجسمے گرا کر وحشیانہ رقص کریں گے۔ وہ ایسا کریں گے کیونکہ روسیوں اور امریکیوں میں کچھ فرق نہیں۔ اندھی طاقت والوں کا انجام ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ البتہ لندن کے چوراہوں پر شہسوار مجسمے سلامت رہیں گے۔ روایت پرست انگریز اپنے ہیروز کو محترم سمجھتے ہیں۔ جمہوریت کے عشق میں بھی انہوں نے اپنے بادشاہوں کو محبوب بنایا ہوا ہے۔ ان کا عروج و زوال حادثاتی نہیں۔ چنانچہ وہ جذباتی نہیں۔

جذبات کے نشے میں چور، چور بلکہ ڈاکو بن جانے والے روسی نہیں جانتے کہ ہیرو کبھی زیرو نہیں بن جاتے۔ تاریخ کو تبدیل کرنا انسان کے بس میں نہیں۔ اگر یہ صورت حال روس کے ''شاندار مستقبل'' کی ترجمان ہے تو جو لوگ اس ''عظیم'' روسی انقلاب کے ناکام ہیروز ہیں، لینن کی جگہ ان کے لیڈر کا مجسمہ لگا یا جائے کہ یہ نہ ہوتے تو جو کچھ اب ہو رہا ہے کیسے ہوتا؟

امریکیوں نے روسیوں کے بارے میں جو لطیفے بنا رکھے تھے، حقیقت بنتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک روسی نعرے لگا رہا تھا۔ روسی لیڈر احمق اور جھوٹے ہیں۔ ڈیوٹی پر موجود سپاہی نے اسے پکڑ لیا تو وہ کہنے لگا میں تو امریکیوں کے خلاف نعرے لگا رہا تھا۔ سپاہی بولا اوئے مجھے بے وقوف بناتے ہو۔ کیا مجھے معلوم نہیں کہ احمق اور جھوٹے کون ہیں؟

روس میں انقلاب آیا۔ پارلیمنٹ نہیں ٹوٹی، کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ کابینہ جوں کی توں موجود رہی۔ گورباچوف کے ساتھ عزیز مہمانوں جیسا سلوک کیا گیا۔ یہ ضرب المثل تو ہمارا ہر شادی شدہ بلکہ غیر شادی شدہ آدمی بھی جانتا ہے۔

گربہ کشتن روز اول

ہمارے کئی مردان باصفا دوسری ضروری تیاریوں کے ساتھ ساتھ بلی مارنے کی پریکٹس بھی کرتے رہتے ہیں مگر انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ اصلی بلی تو بیوی خود ہے جو ڈرانے اور ڈرامے کے فرق کو مٹا دیتی ہے۔ ایسی بلی کو شیر کی خالہ کہتے ہیں۔

ہمارے شیر مرد بالآخر ساری فتوحات کے بعد اس بلی کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ اب تو نوبت یہ آ گئی ہے کہ بیوی صاحبہ چوہوں کا ڈراوا دے کے میاں کو بلی مارنے ہی نہیں دیتی۔ چنانچہ گربہ کشتن والا محاورہ پرانا ہو گیا ہے۔ آپ گربہ کو گورباچوف پڑھیں تو ساری

KitaabPoint.blogspot.com

بات سمجھ میں آ جائے گی۔

انقلابیوں نے یلسن کو بھی کچھ نہ کہا۔ اسے کھلا چھوڑ دیا۔ وہ ان کے ناک کے نیچے تحریک مزاحمت چلاتا رہا۔ امریکی اور برطانوی قیادت سے فون پر رابطہ رکھے رہا۔ شاید اسی کے کہنے پر گورباکشتن روز اول والی روایت پر عمل نہ کیا گیا ہو۔

کہا جا رہا ہے کہ یہ سی آئی اے کی سازش ہے۔ یلسن کو سی آئی اے کا ایجنٹ کہا جا رہا ہے۔ لوگ گورباچوف کی خدمات بھلا دینے والے نہیں۔ اسی کی رضامندی سے امریکہ عراقیوں کو ذبح کرتا رہا۔ نیو ورلڈ آرڈر کی ذمہ داری روسی قیادت ہے۔ یلسن جو گورباچوف کا مخالف تھا' اس کی حمایت میں ڈٹ گیا۔ دونوں آمنے سامنے تھے اب شانہ بشانہ ہیں۔ ایک پراسرار ہے تو دوسرا پر خطر آدمی ہے۔ عنقریب دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے بلکہ زیروزبر کرنے کی کوشش کریں گے۔ امریکی دونوں کو تھپکی دیں گے۔ ان کے نزدیک ان دونوں کی حیثیت بھی اپنے ہاں کی حزب اقتدار اور حزب اختلاف سے مختلف نہ ہوگی۔ وہ کبھی اس کے ساتھ ہوں گے کبھی اس کے ساتھ' دونوں اپنے جو ہوئے۔

امریکہ اب نئی سیاسی ازدواجی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے گربہ کشتن کے قائل نہیں۔ گھر میں بلی چوہے اور کتے کو اکٹھا کر دیتے ہیں اور آرام سے تماشا دیکھتے ہیں۔ سنا تھا عراق میں عرب دنیا کے بعد امریکہ کا ہدف پاکستان اور مسلم دنیا ہوگی۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

بھوک میلہ

کسی نیم سیاسی تجزیئے کے بغیر ذاتی طور پر میرا تجربہ یہ ہے کہ بھوک ہڑتال کا تجربہ کچھ ٹھیک نہیں۔ بچپن میں ہم اکثر گھر والوں کے خلاف بھوک ہڑتال کر دیتے اور اس کا نتیجہ روتے روتے کچھ کھائے بغیر سو جانے کے علاوہ کچھ نہ نکلتا۔ اس حال میں البتہ کھانا ہمارا معمول تھا۔ مار کھانا، قسم کھانا اور غصہ کھانا بھی ہماری روٹین بن گئی تھی۔ تب یہ خوراک چونکہ کچھ زیادہ ہو گئی لہٰذا ہماری صحت پر اس کے بڑے برے اثرات پڑے۔

پھر ہم نے بھوک ہڑتال تو نہ کی' کرنا پڑی۔ جب ہم نے ایم اے کیا و گھر سے پیسے لینا بند کر دیئے۔ ہوسٹل کا میس بھی بند کر دیا گیا تو کبھی کبھی اپنے خلاف بھوک ہڑتال کر دیتے۔ یہ ہم مجبوراً کرتے تھے۔ کچھ کھانے کو ہوتا ہی نہ تھا۔ یہ بھی علامتی ہڑتال ہوتی تھی۔ پی ڈی اے کی ہڑتال کی طرح انہوں نے بھی یہ کام مجبوراً کیا ہے۔ وہ کچھ اور کر سکتے تو بھوک ہڑتال کیوں کرتے؟ میرے خیال میں یہ بے بسی کا اظہار ہے۔

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

جب طاقت ہو تو ہاتھ دوسرے کے گریبان پر اور جب ہاتھ میں کچھ نہ ہو تو اپنا گریباں کس کے لیے ہے؟ اس سے کم از کم یہ تو ہو گا کہ لوگ دیکھیں گے کچھ ہمدردی کریں گے۔ چنانچہ احتجاج تو ریکارڈ ہو جائے گا۔ پارٹی کے کچھ جیالے شغلاً بھوک ہڑتال کرنے چلے گئے۔ چلو رونق میلہ ہی سہی۔ چنانچہ 4 اگست کو بڑے بڑے شہروں میں بڑی رونقیں رہیں۔ سنا ہے جیالوں نے کھانے پینے کی چیزیں بھی اڑائیں۔ ہم تو کالج میں اپنی بھوک ہڑتال اکثر مزیدار کھیر کے ساتھ توڑتے تھے۔ اللہ کا ایک محبوب بندہ کبھی کبھی ہمارے لیے بھجوا دیتا تھا۔ چنانچہ اب ہم سے کوئی پوچھ لے کہ آپ کو کھانے میں کیا چیز پسند ہے تو ہم کہتے ہیں ''کھیر''۔ پھر یوں ہوا کہ مشہور صحافی صدر میر نے پاکستان پریس ٹرسٹ توڑنے اور پی پی ایل کو بحال کرنے کے لیے بھوک ہڑتال کرنے کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے دیکھا کہ کالم لکھنے اور مضمون لکھنے سے کچھ نہیں ہوتا تو بھوک ہڑتال ہی سہی۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ قلم چھوڑ ہڑتال کرتے۔ پاکستان پریس ٹرسٹ ہماری صحافیانہ تاریخ کا شرمناک باب ہے۔ پیپلز پارٹی والے بھی میر صاحب کے ساتھ شامل ہو گئے۔ جو سیاسی پارٹی اقتدار میں نہیں ہوتی تو اسے ملک خطرے میں نظر آنے لگتا ہے۔ ملک ٹوٹ گیا' پریس ٹرسٹ نہ ٹوٹا۔

KitaabPoint.blogspot.com

ریگل مال روڈ والے پریس کلب سے ہر روز پانچ پانچ لوگ بھوک ہڑتال کرنے کے لیے جلوس کے ساتھ پاکستان ٹائمز کے دفتر کے سامنے جاتے تھے اور بھوک ہڑتالیوں کے کیمپ میں شامل ہو جاتے تھے۔ ہم دونوں جگہوں پر تماشا دیکھنے جاتے۔ بالکل ایسا ہی سماں ہوتا جو 4 اگست کو اسمبلی کے سامنے تھا۔ بھوک ہڑتالی ہاروں سے لدے دولہا بنے بیٹھے ہیں۔ تصویریں اتر رہی ہیں جس کی تصویر زندگی بھر اخبار میں نہیں چھپی' اب چھپ گئی۔ ہم پریس کلب میں کھڑے تھے اور بھوک ہڑتالی جانبازوں کا اعلان ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر سہیل احمد خان نے میرا نام بھی بھوک ہڑتالیوں میں لکھوا دیا۔ اب بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ خان صاحب دوست اور استاد ہیں اور پٹھان بھی۔ ہم بھی اکڑفوں میں آ کے پھنس گئے۔ ہاروں میں لدے ہوئے ہم یوں نکلے جیسے برات جا رہی ہو۔ ویسے آپس کی بات ہے میری شادی بھی یوں ہوئی تھی جیسے میں ہڑتال پر جا رہا ہوں۔ نہ بینڈ باجے نہ ہار نہ جلوس۔ اب بھی یوں لگتا ہے کہ سترہ برس کے بعد بھی ہم علامتی بھوک ہڑتال پہ ہیں' کیونکہ اب بھی ہمارے پاس احتجاج کا ایک ہی طریقہ ہے بھوک ہڑتال! اس کا بھی نتیجہ غلط ہی نکلتا ہے۔ اب ہماری بیوی بھی ہمارے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھانے کو ترجیح دینے لگی ہے۔

ہڑتالی کیمپ میں تیسرے دن ہم پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ مگر ہم اس وقت حیران ہوئے جب پیپلز پارٹی کے ایم پی اے حفیظ کاروار تیسرے دن بھی دھڑلے سے تقریر کر رہے تھے۔ چنانچہ چوتھے روز ہم نے بھی تقریر کر دی اور اخبارات نے اسے نمایاں طور پر شائع کیا۔ پھر تو جناب دس دن کی بھوک ہڑتالی نے ایسا مزا دیا کہ اب تک نہیں بھولا۔ انہی دنوں ذوالفقار علی بھٹو اور احمد رضا قصوری کے اختلافات شروع ہوئے۔ یہ فقرہ گول باغ میں سنا گیا۔

''رضا! تمہیں لیڈر بننے کا بڑا شوق ہے؟'' اور پولیس نے ہڑتالی کیمپ پر حملہ کر دیا۔ صفدر میر جیل پہنچ گئے اور ہم ہسپتال خدانخواستہ ہم زخمی نہیں ہوئے تھے۔ یہ واقعہ بھی اتفاقاً ہو گیا تھا۔ بھٹو صاحب کی پارٹی چھ سال تک اقتدار میں رہی مگر نیشنل پریس ٹرسٹ نہ ٹوٹا۔ احمد رضا قصوری نے بھی بھٹو صاحب سے لڑائیاں جاری رکھیں مگر ٹرسٹ کے ضمن میں کبھی کوئی بات نہ کی۔ تب ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ بھوک ہڑتالیوں سے کچھ نہیں ہوتا۔

ایم کیو ایم کے لیڈر الطاف حسین نے اس بھوک ہڑتال کی مذمت کی ہے مگر انہوں نے بھی بھوک ہڑتال کی تھی اور نڈھال بھی ہوئے تھے۔ کچھ مہاجر عورتیں مرد اپنے لیڈر کے لیے دھاڑیں مار مار کے رو رہے تھے تو ایک سیانے نے ان سے کہا کہ مطمئن رہو اس طرح آج تک کوئی نہیں مرا۔ گاندھی مرن برت رکھ کے نہیں مرا تھا۔

وزیر اعظم کے مشیر شیخ رشید عجب آدمی ہیں۔ وہ اسلام آباد میں ہڑتالی کیمپ کے اردگرد چکر لگاتے رہے۔ سنا ہے کیمپ بھی انہوں

KitaabPoint.blogspot.com

نے ہی لگا کر دیئے تھے۔ دراصل اس بھوک ہڑتال کی ناکامی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ حکومت نے کچھ زیادہ ہی تعاون کر دیا۔

آخر میں صرف ایک بات تمام لیڈروں سے کہنا ہے کہ اس زمین پر اس ملک میں کئی لوگ ہیں جو بھوکے ہیں۔ ان کی بھوک ہڑتالی کا تنا نوٹس کیوں نہیں لیا جاتا؟ افریقہ کے قحط زدگان کی بھوک ہڑتال کس کے خلاف ہے؟

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

کلرک بادشاہ اور نوکر شاہی

پچھلے دنوں کلرکوں کی ہڑتالوں کا بڑا شور رہا۔ زور بھی رہا۔ اب ہڑتالیں ہمارا معمول بنتی جا رہی ہیں۔ ہماری انتظامیہ یعنی بیورو کریسی نے فیصلہ کیا ہے کہ کوئی بات آسانی سے نہیں ماننی' یہ بھی ایک سنسنی خیز بات ہے کہ بیورو کریسی نے کبھی ہڑتال نہیں کی۔ ان کا اپنا کام کبھی نہیں رکا۔ زندگی کی تمام سہولتیں' مراعات ان کو حاصل ہیں۔ اپنے حق سے زیادہ ان کو ملتا ہے۔ بلکہ وہ خود اپنے آپ کو دیتے ہیں' دیتے رہے ہیں جبکہ دوسرے محکمے والوں کو ذلیل و خوار کرنا ان کا مشغلہ ہے۔ کون سا محکمہ ہے جس نے ہڑتال نہ کی ہو۔ معماران قوم استادوں کے جلوس پر لاٹھی چارج تک کرانے سے گریز نہیں کرتے جو ترقی 81ء میں ملنا ہوتی ہے وہ 91ء تک نہیں دی جاتی۔ اس عمل میں کلرک برادری ان کی شریک ہے۔ چنانچہ کلرکوں کی ہڑتال کے دوران کسی کو کلرکوں سے ہمدردی نہیں ہوئی۔ یہ عام حالات میں افسروں سے بڑے افسر ہوتے ہیں۔ خلق خدا نوکر شاہی سے تو تنگ ہے کلرک بادشاہ بھی لوگوں کو اپنی رعایا سمجھتے ہیں۔ فائلوں کو دبانے میں کلرک ہی افسروں کی مدد کرتے ہیں۔ اس ملک میں جتنا بگاڑ پیدا ہوا ہے افسروں اور کلرکوں کی ملی بھگت سے پیدا ہوا ہے۔ افسر شاہی کے بارے میں تو پھر بھی بات ہوگی۔ بس اتنا عرض ہے کہ لفظ بیورو کریسی پر غور کریں۔ اسے اردو میں اس طرح پڑھا جائے تو بات سمجھ میں آ جائے گی۔ اس کا صحیح تلفظ بھی یہی ہے۔ برا کریسی یعنی چنگا نہ کریسی۔ انہوں نے اپنے کلرکوں سے بھی چنگا نہیں کیا۔ ان کے ساتھ بھی انہوں نے وہی سلوک کیا جو وہ استادوں اور دوسرے ملازموں کے ساتھ کرتے ہیں۔ دوسروں کی توہین میں ہمارے دفتروں کو بڑا کمال حاصل ہے۔ کلرکوں کو شہروں میں وہی طاقت حاصل ہے جو دیہاتوں میں پٹواریوں کو حاصل ہے۔ عام لوگ نہ ڈپٹی کمشنروں سے مل سکتے ہیں نہ ڈپٹی سیکرٹریوں سے۔ وہ پٹواری کو جانتے ہیں یا کلرک کو۔ ان کے لیے تو سب کچھ یہی ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ عمومی تاثر پٹواری یا کلرک بننے سے پہلے اتنا اچھا نہیں ہوتا جب کوئی پٹواری یا کلرک بن جائے تو پھر وہ اس منصب سے آگے ترقی ہی نہیں کرنا چاہتا۔ یوں بھی پٹواری اور کلرک کو بہت کم ترقی کرتے دیکھا گیا ہے۔ عیش کرتے ضرور دیکھا گیا ہے۔ ڈپٹی سیکرٹری کے کلرک بہادر کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کے مجھے یاد آیا کہ ایک اچھی بھلی عورت نے خوش ہو کے ڈپٹی کمشنر کو دعا دی تھی کہ اللہ تجھے پٹواری بنائے۔ پٹواریوں کی جو خدمتیں ہوتی ہیں' ڈی سی صاحبان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

مجھے پٹواری اور کلرک ایک ہی برادری کے آدمی نظر آتے ہیں۔ کاغذات کے ہیر پھیر میں دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر

KitaabPoint.blogspot.com

ہیں۔ سیدھے سادھے لوگ کلرکوں کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یہ تاثر بری طرح قائم ہے کہ افسر کلرکوں کی ہدایت کے مطابق دستخط کرتے ہیں۔ افسر صرف دستخط ہی کرتے ہیں۔

امتحانات کے حوالے سے بورڈ اور یونیورسٹی کے کلرکوں کے ایسے ایسے کارنامے سامنے آ رہے ہیں کہ آدمی حیران ہو جاتا ہے بلکہ پریشان ہو جاتا ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ کالجوں میں پروفیسر کسی طالب علم کی لاکھ غیر حاضریاں لگاتا رہے، کبھی اس کے لیکچر شارٹ نہیں ہوتے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کا ایک ہیڈ کلرک تھا کوئی پرنسپل اس کے لکھے ہوئے کے خلاف ایکشن نہیں لے سکتا تھا۔ جہاں تک ڈپٹی سیکرٹریوں اور ڈپٹی کمشنروں کا تعلق ہے تو ان کے دفتر کا چپڑاسی بھی حاکم اعلیٰ ہوتا ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں کو ان کی خوشامدیں کرتے دیکھا گیا ہے۔

ہمارا ملک کاغذی کارروائی پر چل رہا ہے اس لحاظ سے سب سے ہم لوگ کلرک ہیں۔ سید محمد جعفری نے کلرکوں کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا ہے۔

روز اول جو حق نے بنایا کلرک کو
لوح و قلم کا جلوہ دکھایا کلرک کو
کرسی پہ پھر بٹھایا اٹھایا کلرک کو
افسر کے ساتھ پن سے لگایا کلرک کو
آدم کا رف ڈرافٹ ہے کب تک ہنسو گے تم
اپروو ہو کے آیا تو سجدے کرو گے تم

بیوروکریسی کے ساتھ ایک لفظ کلرکریسی بھی بن گیا ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ افسروں سے اپنے مطالبات منوانے کے لیے کلرکوں کو بھی ہڑتال کا رستہ اختیار کرنا پڑا۔ یہ خاصا تحقیق طلب معاملہ ہے۔ کلرکوں سے زیادہ افسروں کا وفادار کون ہے۔ وہ افسروں اور لوگوں کے درمیان ایک خلا کا کام دیتے ہیں۔ افسروں کے سامنے بھیگی بلی۔ لوگوں کے آگے جنگلی بلے۔ کلرکوں سے زیادہ افسروں کو کون جانتا ہے؟ انہوں نے ہڑتال کر کے یہ بتا دی ہے کہ یہاں کوئی کام ہڑتال کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یوں بھی ہمارے ملک میں ہڑتالی سیاست کا روج پڑ گیا ہے۔ افسر شاہی بہت چالاک ہے۔ ایک طرف دو کلرکوں کو آگے کر کے بدنام کرتی ہے دوسری طرف سیاست دانوں کو استعمال کر کے غیر مقبول کرتی ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

آج کل کلرکوں کی ہڑتال کے حوالے سے جو بیانات بینظیر بھٹو اور حزب اختلاف کے لیڈر دے رہے تھے اگر حکومت بینظیر بھٹو کی ہوتی تو تمام مسلم لیگی قیادت کلرکوں کی حمایت میں سیکرٹریٹ کے دروازے پر پہنچ گئی ہوتی۔ بیوروکریسی داد کے قابل ہے کہ وہ تمام لیڈروں سے ایک سا کام لے رہی ہے۔ غریب وزیر اعلیٰ وائیں صاحب جیسے کھرے انسان سے بھی کلرکوں کے خلاف غصے والا بیان دلوا کر افسر شاہی نے کمال کر دیا۔ پھر وائیں صاحب سے توقع نہیں کہ وہ اصلی حکمرانوں جیسا رویہ اختیار کرتے۔ ہڑتال کے دوران کسی افسر کے خلاف نعرہ نہیں لگا۔ نعرے جناب وائیں صاحب کے خلاف ہی لگتے رہے۔ اس صورت حال کی نوبت کیوں آئی؟ اس صورت حال کے لیے کس کس نے کیا کیا منصوبہ بنایا۔ کیا اس سلسلے میں سچی طرح کوئی کارروائی کی جا سکتی ہے؟

کلرکوں سے گزارش ہے کہ وہ پھر افسروں کا دم چھلا نہ بن جائیں بلکہ دفتروں کے ماحول کو ستائے ہوئے عوام کی پناہ گاہ بنائیں۔ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے ذلت و خواری کی روٹین کب تبدیل ہوگی؟

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

سیاست میں غیر جانبداری ممکن ہے؟

اس وقت پورے ماحول پر سیاسی اضطراب کی حکومت ہے ورنہ حکمرانوں کو بھی یقین نہیں کہ ملک پر کس کی حکومت ہے۔ یہ کہنا ایک مذاق ہے کہ قوم دو حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ یہ بھی ہوتا تو گھبرانے کی کوئی بات نہ تھی ہمیشہ یہ ہوتا آیا ہے کہ میدان میں دو آدمی یا دو گروپ آمنے سامنے ہوتے ہیں جب میدان میں بہت سے پہلوان بلکہ تماشائی بھی شامل ہو جائیں بلکہ کشتی کرنے لگیں اور یہ بھی پتہ نہ چلے کہ کون کس سے کشتی کر رہا ہے تو پھر افراتفری کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوا۔

اب حزب اختلاف میں جو لوگ ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کس کے ساتھ ہیں اور کس کے مخالف ہیں۔ بظاہر لگتا ہے کہ لڑائی وزیر اعظم اور صدر کے درمیان تھی جبکہ فریق تو بینظیر بھٹو نواب زادہ نصر اللہ خان اور کئی دوسرے لیڈر بھی تھے ضرورت ایسے لیڈر کی ہے جو غیر جانبدار ہو اس میں ایک نقطہ یہ بھی ہے کہ سب اسے غیر جانبدار سمجھیں غیر جانبدار آدمی جب کوئی کردار ادا کرے گا تو کسی کو سچا اور کسی کو جھوٹا کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوگا۔ ہمارے ہاں جو آدمی الیکشن ہار جائے تو اس کے خیال میں الیکشن غیر جانبدارانہ نہیں ہوتے۔ فیصلہ اس کے نزدیک منصفانہ ہے جس کے حق میں ہے بلکہ حق وہی ہے جو جس کے حق میں ہے۔ ایسے میں سیاسی غیر جانبداری تو ناممکن ہے غیر جانبداری بھی ناممکن ہے۔ یوں یہ انسانی فطرت کے بھی خلاف ہے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ملک کی وفاداریوں میں بھی جانبدار ہیں کہ ہم صرف اپنے آپ کو ملک کا وفادار سمجھتے ہیں جس ملک میں اپنے سیاسی مخالف کو ملک دشمن قرار دے دیا جائے وہاں کسی بات کے سچے ہونے کا تصور نہیں ہو سکتا۔ جب ہم اپنے مخالف کو برملا جھوٹا سمجھیں گے تو غیر جانبداری تو ایک مہمل بات ہو جائے گی ہم تو ملک کی محبت میں اتنے بھی فراخدل نہیں کہ دوسرے کی محبت کو تسلیم کر لیں۔ ہم قائداعظم کی قیادت پر ایمان رکھتے ہوئے غیر جانبدار نہیں ہم اپنے پیغمبر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے معاملے میں غیر جانبدار نہیں۔ جس کا ایمان ہمارے ایمان کے مطابق نہیں ہم اسے کفر سے بدتر سمجھتے ہیں۔

وہ مسلمان تھا جس نے ایک یہودی سے جھگڑے کے دوران رسول کریم کو ثالث ماننے سے گریز کیا تھا جبکہ یہودی نے یہ بات مان لی تھی اس مسلمان کو حضرت عمر کے غضب کا شکار ہونا پڑا اس سے ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ حق و انصاف کے معاملے میں رسول اکرم سے زیادہ غیر جانبدار شخصیت کوئی نہیں۔ چنانچہ آج تک ان کا یہ وصف ایک ابدی حقیقت کے طور پر زندہ ہے انہوں نے فرمایا تھا

KitaabPoint.blogspot.com

کہ میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے گی تو اس کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے۔ ہمارے ملک میں بااختیار لوگ اپنے عزیزوں' دوستوں بلکہ ووٹروں کو جرم کے باوجود جس طرح سزا سے صاف بچا لیتے ہیں ایسے میں جانبداری ایک ظلم بن جاتی ہے۔

سیاسی صورت حال میں جانبداری بے چارے عوام کے لیے ظلم بلکہ ظلم وستم بنی ہوئی ہے۔ آپ یقین کریں کہ ہماری 50 فیصد سے زیادہ آبادی بہت سے معاملوں میں غیر جانبدار ہے وہ ووٹ دیتے وقت بھی اپنی ترجیحات کا استعمال آزادانہ نہیں کر سکتے۔ ووٹ دیتے وقت بھی ہزار طرح کے دباؤ ان کے ذہن ودل پر ہوتے ہیں۔ چلئے سیاسی طور پر غیر جانبداری ممکن نہیں جبکہ اصولی طور پر یہ بھی ممکن ہے کہ جب ایک آدمی ملک کا صدر یا وزیراعظم بن گیا تو پھر وہ سارے ملک کے لوگوں کا وزیراعظم ہے ان کا بھی جنہوں نے اسے ووٹ نہیں دیا۔ ہمیں ایسا ایک بھی وزیراعظم یا صدر نہیں ملا۔ جب ایسا ایک بھی لیڈر ہوا تو پھر یہ پاکستان کی خوش نصیبی کا پہلا دن ہوگا۔

ہماری تنگ نظری اتنے عروج پر پہنچ چکی ہے کہ مخالف سیاسی لیڈر کے ساتھ ملاقات سے بھی گریز کیا جاتا ہے۔ ایسا ہو تو کئی سیاسی سکینڈل چلائے جاتے ہیں اور لیڈر صاحب کو سوائے تردید کرنے کے کوئی راستہ نظر نہیں آتا اس کے نزدیک تردید اور تصدیق ایک ہی عمل ہے جب تحمل ختم ہوتا ہے تو تدبر بھی ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہم ایک بے تدبیر قیادت کا تماشہ دیکھنے پر مجبور ہیں۔ ساری دنیا ہم پر ہنس رہی ہے۔ ہمارے دشمن بغلیں بجا رہے ہیں۔

ہمارا یہ حال ہے کہ ہم ایک سیاسی ابتری کا شکار ہیں ہمارے پاس ایک بھی آدمی ایسا نہیں جس پر سب فریق متفق ہو سکیں۔ ہماری اسمبلیوں کے سپیکر بھی غیر جانبدار ہیں۔ اس وقت فوج کے سربراہ جنرل وحید صاحب کا کردار اتنا غیر جانبدارانہ ہے کہ کسی فریق نے ان پر اعتراض نہیں کیا' مگر ان کی بھی مداخلت زیادہ ہوئی تو یہی سیاست دان ان کے مخالف ہو جائیں گے۔ اختیار اور اقتدار کسی کو غیر جانبدار نہیں رہنے دیتا جبکہ غیر جانبدار ہونے کے لیے ضروری ہے کمزور اور لاتعلق آدمی کو غیر جانبداری کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہماری فوج قومی فوج ہے مگر اس کی غور جانبداری بھی مشکوک کر دی گئی ہے۔ ایک بڑے سیاسی لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد فوج کو اپنی غیر جانبداری ثابت کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا ہوگا۔ اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ سیاست میں نہ الجھیں' مگر اس آسانی میں مشکل ہے۔ سیاست دان لڑ رہے ہوں اور ایک افراتفری ہو تو فوج والے کب تک صبر کریں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ کبھی بھی فوج کا سیاسی قیادت سنبھالنے کا عمل ناجائز نہیں تھا' مگر وہ منصفانہ الیکشن کرا کے پھر اپنے میدان میں چلے جائیں۔ اس میں ایک بات غور طلب ہے کہ سیاست دان یہ مواقع فوج کو بار بار فراہم کریں گے تو نتیجہ یہی نکلے گا۔ یہاں نتیجے کی بجائے انجام کا

KitaabPoint.blogspot.com

لفظ ہونا چاہیے۔

خاکم بدہن ہمیں اپنا انجام کچھ اچھا نظر نہیں آ رہا ہمارے سیاست دان جتنے کرپٹ ہو چکے ہیں ان پر کسی طرح اعتبار کرنے کو دل آمادہ نہیں ہوتا۔ اب کے ان کا جتنا مذاق اڑایا گیا ہے یہ پوری قوم کے لیے شرمناک ہے۔ ہم یہ سوچتے ہیں تو بھی اپنے آپ سے گھن آتی ہے کہ یہ ہمارے رہنما ہیں۔ یہ ہمارے لیے پالیسیاں بناتے ہیں اور ہمارے مستقبل کے معمار ہیں۔ میں بڑے دکھ سے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ہم اس زمانے میں زندہ رہنے پر مجبور ہیں جب یہ لوگ ہمارے لیڈر ہیں۔ جو آدمی پرلے درجے کا جھوٹا ہو وہ غیر جانبدار کیسے ہو سکتا ہے ناجائز ذرائع سے دولت کے انبار لگانے والے شخص کو اس کا دوست بھی غیر جانبدار نہیں سمجھے گا۔ وہی تو اسے جانبدار بنانے والا ہے۔

کسی زندہ معاشرے میں انتظامیہ کو مکمل غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہیں سیاست دان غیر جانبدار نہیں رہنے دیتے اپنے سیاسی مخالفین کو کچلنے کے لیے انہیں افسروں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے افسر اتنے مغرور اور خود پسند ہیں کہ ان کا غیر جانبدار ہونا ایک بھولی بسری بات بن چکی ہے۔ عام لوگ تو ان کے دفتروں کے پاس سے بھاگ کر گزرتے ہیں۔ میں ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جو ایسے راستے پر چلتے ہی نہیں جو تھانے کی طرف جاتا ہے وہ لمبا چکر کاٹ کر اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔

چلیے کوئی ادارہ نہ سہی عدلیہ تو غیر جانبدار ہوتی ہے۔ اب یہ بات بھی قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ عدلیہ میں جو لوگ ہیں وہ ہم میں سے ہی ہیں۔ عدل و انصاف کی توقع ہی نہیں رہی۔ لوگ عدالتوں کے خلاف مظاہرے کرنے لگیں تو وہ غیر جانبدار ہو کر بھی غیر جانبدار نہیں ہوتیں۔ ڈاکٹر خیال کا یہ فقرہ فکر انگیز بھی ہے اور معنی خیز بھی کہ جج صرف فیصلہ کرتا ہے۔ انصاف نہیں کرتا جہاں یہ باتیں عام ہوں کہ اگر سندھی وزیر اعظم کی اسمبلی ٹوٹے تو بحال نہ کی جائے اور پنجابی وزیر اعظم کی اسمبلی بحال ہو جائے جہاں ملک کی ایک اہم لیڈر محترمہ بینظیر بھٹو یہ کہے کہ نواز شریف کے پاس کیا چمک ہے کہ سارے فیصلے اس کے حق میں ہوتے ہیں۔ چمک کا لفظ ایک علامت بن جائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس ملک میں ایک ادارہ بھی ایسا ہے جس کے بارے میں کہا جا سکے کہ وہ غیر جانبدار ہے۔

اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ غیر جانبداری ایک وصف ہے اور یہ انسانوں کا وصف ہے ایسے انسان اپنے درمیان تلاش کرنے چاہئیں۔ یہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

عدالت کے کٹہرے میں

ایک زمانہ تھا کہ مال روڈ لاہور پر واقع ہائی کورٹ کی پراسرار اور پرجلال عمارت کے پاس سے گزرتے ہوئے لوگوں پر ایک انجانا سا دبدبہ طاری ہو جاتا تھا۔ عدل و انصاف دلوں میں احترام پیدا کرتا ہے۔ احترام کے جذبات میں جو لذت ہوتی ہے وہ بندے کو طاقتور اور بہادر بناتی ہے۔ جس معاشرے میں عدل و انصاف کی روایت نہ رہے وہاں لوگ بزدل اور ظالم ہو جاتے ہیں لیکن ظلم و ستم اور بے انصافی کا دھڑکا عارضی ہوتا ہے۔ دل میں نفرت اور بغاوت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

ہم چھوٹے تھے تو سکول کی ٹوٹی پھوٹی عمارت ہمیں آسیب زدہ لگتی تھی۔ ہم کبھی رات کو اس طرف نہ آتے تھے۔ ہمارا بس چلتا تو ہم دن کو بھی ادھر نہ آتے۔ ہمارے مدرسے اب اپنا کردار بھلا بیٹھے ہیں۔ وائٹ ہیڈ نے کہا کہ سچا استاد وہ ہے جو طالب علموں کے دلوں میں زندہ رہتا ہے اور ان کے ذہنوں میں بیدار ہوتا ہے۔ یہ کون استاد ہے جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے مگر اس کا ذہن خالی ہے جو کام دماغ سے لینے والا ہے وہ بھی ہاتھوں سے لیتا ہے۔ انصاف کرنے والا جج خدا کا نمائندہ ہے۔ کیا دن تھے کہ جب کسی سے زیادتی ہوتی تھی تو وہ کہتا تھا کہ عدالت میں چلا جاؤں گا۔ سننے والا سہم جاتا تھا۔ اب یہ بات کہی جائے تو اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ عدالتوں کی طرف جانے والے راستے دشوار گزار بنا دیئے گئے ہیں۔ حصول انصاف میں اتنی رکاوٹیں پیش آتی ہیں کہ بندہ بے انصافی کی صورت حال میں صبر کر کے بیٹھ رہتا ہے۔

پچھلے دنوں ہائی کورٹ نے صوبہ بھر میں پولیس کی زیادتیوں کا نوٹس لیا ہے۔ ایسے ایسے روح فرسا واقعات سامنے آئے ہیں کہ جن سے بے خبری اور بے نیازی ایک ظلم ہے۔ جو کچھ ہمارے قانون میں ہوتا ہے وہ بڑے سے بڑے عقوبت خانوں میں بھی نہیں ہوتا۔ چھوٹے شہروں میں آج بھی لوگ تھانے کے پاس سے بھاگ کر گزرتے ہیں۔ بڑی عمر کے لوگ بھی تھانے کو اس طرح دیکھتے ہیں جس طرح ہم بچپن میں سکول کو دیکھتے تھے۔ دیہاتی سکولوں کے استادوں اور تھانے کے حوالداروں میں کوئی فرق نہیں۔ آپ تھانیدار کو ہیڈ ماسٹر کہہ سکتے ہیں۔ ہمارے لیے عجیب و غریب بات تھی کہ جاگیردار یا تھانیدار کے سامنے ہمارا ظلم ماسٹر اس طرح کھڑا ہوتا تھا جس طرح ہم اس کے سامنے کھڑے ہوتے تھے۔ سکولوں اور تھانوں کی حالت بدلنے کی ضرورت ایک جیسی شدید ہے۔

بیوروکریسی نے ہماری عدالتوں کا بھی وہ حال کیا ہے جو انہوں نے دوسرے محکموں کا کیا ہے۔ ہائی کورٹ کے پاس اپنے فنڈز

KitaabPoint.blogspot.com

نہیں اپنی فورس نہیں۔ پولیس والوں کے خلاف بھی عدالت کوئی ایکشن لینا چاہے تو اسے پولیس والوں ہی کی مدد لینا پڑتی ہے۔ عدالت کا بیلف بھی اسی پولیس پر مشتمل ہوتا ہے۔ حوالدار کی انکوائری ہو تو کارروائی کے کاغذات اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ تھانیدار کے پاس بھی پہنچ جائیں تو سمجھیں اس کے پاس ہی پہنچ گئے۔ اس سے آگے حیران کن بات یہ ہے کہ عدالتیں تمام فیصلے انہی کی لکھی ہوئی ایف آئی آر اور تفتیش کی بنیاد پر کرتی ہیں۔ ہائی کورٹ کا تو خیر ایک ڈیکورم ہے۔ چھوٹی عدالتوں کا حال کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ ایک سول جج نے جب تھانیدار صاحب کی بات نہ مانی تو غنڈے بھجوا کر اسے پٹوا دیا۔ سوجے ہوئے منہ اور پھٹے ہوئے کپڑوں کے ساتھ جج صاحب اسی تھانیدار کی خدمت میں پرچہ درج کروانے گئے تو اس سے پہلے تو ان کو وہی جواب دیا گیا جو بالعموم لوگوں کو دیا جاتا ہے۔ یعنی پرچہ درج کرنے سے انکار کر دیا۔ بحث ہوئی بڑی مشکلوں سے پرچہ درج ہوا۔ تفتیش بھی تھانیدار صاحب نے ہی کرنا تھی۔ جج صاحب شرم کے مارے کئی دن عدالت میں نہ گئے۔ پھر وہاں سے تبادلہ کرا کے چلے گئے۔ ہائی کورٹ کے پاس جو اختیارات ہیں وہ تھوڑی بہت شرائط کے ساتھ چھوٹی عدالتوں کو بھی ملنے چاہئیں تاکہ عدالتوں کا مکمل وقار بحال ہو سکے۔ بیوروکریسی اپنے شعبے کے علاوہ کسی اور محکمے والوں کی ترقی ہونے ہی نہیں دیتی۔ بعض اوقات کالج استاد ساری عمر پڑھا پڑھا کے اسی گریڈ اور حیثیت میں ریٹائر ہو جاتا ہے۔ جج بھی ریٹائر ہوتے وقت ریٹائر سینئر سول جج ہوتا ہے۔ بہت کم لوگ سیشن جج بنتے ہیں۔ ہائی کورٹ کا جج بننے کے لیے تو اور راستے ہیں۔ اکا دکا جج اس راستے کے مسافر بن پاتے ہیں۔ حکومتیں اپنے من پسند وکیلوں کو بھی ہائی کورٹ کا جج بنا دیتی ہیں۔ ایک دفعہ ایک وکیل کو چیف جسٹس بھی بنا دیا گیا تھا۔ پروفیسر، جج اور بیوروکریسی کا نمائندہ اسسٹنٹ کمشنر تینوں 17 گریڈ کے افسر ہوتے ہیں۔ جہاں تک حیثیت کا تعلق ہے، اے سی تو بادشاہ ہوتا ہے۔ سب فنڈز اور اختیارات اس کے پاس ہوتے ہیں۔ وہ چشم زدن میں ڈی سی بنتا ہے اور سیکرٹری کی سطح تک تو با آسانی چلا جاتا ہے۔ ساری رونقیں سارے میلے انہیں افسروں کے گرد ہوتے ہیں۔ ستم یہ ہے کہ ان کو ہائی کورٹ کی طرف سے عدالتی اختیارات بھی مل جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ افسران انتظامی امور کے انچارج ہوتے ہیں اور عدالتی امور کے بھی وارث، یہ افسران صرف بے انصافیوں کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کی موجودگی میں انصاف کی فضا پیدا کرنے کی بات بے معنی ہے۔ اتنا تو ہو کہ ان سے عدالتی اختیار لے لیے جائیں۔ کئی دوسرے منصوبوں کے علاوہ کئی بار کمیٹیاں بنیں جو انتظامیہ اور عدلیہ کو الگ الگ کرنے کی تجاویز پیش کر کے تھک گئیں مگر پرنالہ وہیں ہے۔ اس پرنالے کا گندہ پانی غریبوں اور مظلوموں کے گھروں میں گرتا ہے اور گرتا رہتا ہے۔ ظلم اور بے انصافی کی برسات ہمارے ہاں سارا سال رہتی ہے۔ اس برسات میں ہمارے چھوٹے بڑے سیاست دان، جاگیردار اور وڈیرے پکنک مناتے ہیں۔ افسران بھی پکنک میں شامل ہوتے ہیں۔ بیوروکریسی اتنی زور آور ہے کہ سیاست دانوں کو بھی انگلیوں پر نچاتی ہے۔ سب محکموں والوں کو خوار کرتی ہے۔ عدالتیں بھی اس کی دست برد سے محفوظ نہیں بلکہ سب کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ ہائی کورٹ جب کبھی کوئی بجٹ بنا کے بھیجتی ہے۔ سیکرٹریٹ کی طرف سے

KitaabPoint.blogspot.com

اعتراض لگ کے آ جاتا ہے۔ منظوری ہو بھی تو اس میں کئی ماہ لگ جاتے ہیں بلکہ سال بھی لگ جاتے ہیں۔ ہائی کورٹ کی اپنی آمدنی بھی ہے۔ اس میں بھی بیوروکریسی حائل ہے۔ دیوانی مقدمات اور دوسرے کئی معاملوں میں کورٹ فیس وغیرہ ہوتی ہے۔ ریونیو کے مقدمات میں بھی کئی لاکھ روپے عدلات کے ڈسپوزل پہ رکھے جاتے ہیں۔ وہ روپے پڑے رہتے ہیں۔ کئی برسوں کے بعد فیصلہ ہوتا ہے تو وہ روپے حقدار کو مل پاتے ہیں۔ دس پندرہ برسوں میں روپے کی قیمت بھی کم ہو جاتی ہے۔ حبیب بنک نے بڑا زور لگایا کہ یہ روپیہ آپ ہمارے پاس رکھوا دیں۔ جب بھی آپ کو ضرورت پڑے گی ہم ادا کریں گے۔ اور اس دوران تمام جج صاحبان کی رہائش بھی بنا دیتے ہیں۔ بیوروکریسی نے اس تجویز کو بھی مسترد کر دیا۔ کوئی خاص وجہ تو سمجھ میں نہیں آتی۔ بس یہ کہ کہیں ججوں کی رہائش افسروں سے بہتر نہ ہو جائے۔ کئی بے چارے جج کرائے کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ بیوروکریسی کی خواہش ہے کہ کوئی جج افسروں کی غلط کاریوں کے خلاف فیصلہ نہ دے۔ وہ ہمارے محتاج ہوں گے تو ہمارے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ آج تک اکا دکا کرپٹ افسروں کے خلاف عدالتی فیصلے موثر ہو سکے ہیں۔

آج کل انسان بڑی مشکل میں ہے۔ سچ کہا کسی سیانے نے کہ کفر کے ماحول میں زندہ رہنا ممکن ہے ظلم کے ساتھ زندہ رہنا مشکل ہے۔ آج کل انسان بڑی مشکل میں ہے۔ ہم بھی بڑی مشکل میں ہیں۔ جب تک یہ نہ ہو کہ ہمارے افسران اپنے دفتر میں اس طرح موجود ہوں جس طرح عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ ہر شخص اپنے دل کی عدالت میں حاضر رہے۔ تب تک ایک خوبصورت زندگی کا خواب منتشر ہی رہے گا۔ یہاں عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر بھی لوگ خوف نہیں کھاتے۔ ایسی صورت میں عذاب سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

25 دسمبر کو چھٹی نہ ہو

25 دسمبر کو حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔ دنیا بھر کے عیسائی اس دن عید مناتے ہیں۔ ہم بھی مناتے ہیں۔ اسی دن قائداعظم محمد علی جناح پیدا ہوئے۔ پاکستان کے رہنے والے خوشی مناتے ہیں۔ اب تو وہ اس لیے خوش ہوتے ہیں کہ اس دن چھٹی ہوتی ہے۔ اب تو ہم عید کا دن بھی چھٹی کے دن کی طرح گزارتے ہیں۔ اصل میں ہمارے لیے چھٹی کا دن ہی عید کا دن ہوتا ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں جس چیز میں ہر سال ترقی ہوتی ہے وہ چھٹیاں ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں کئی برسوں سے صرف تین چار مہینے میں پڑھائی ہوتی ہے۔ اس میں سے بھی جمعے نکال دیے جائیں تو باقی جتنے دن بچتے ہیں انہیں آسانی سے آدھی چھٹی کہا جا سکتا ہے۔

مغرب والے اس سلسلے میں بھی ہم سے بازی لے گئے ہیں۔ وہ ہفتے میں دو چھٹیاں کرتے ہیں۔ وہ چھٹیوں میں بھی کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔ ڈٹ کے سیر و تفریح کرتے ہیں۔ ہم چھٹی والے دن بھی وہی کچھ کرتے ہیں جو پہلے چھ دنوں میں کرتے ہیں یعنی کچھ نہیں کرتے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

چنانچہ ہم بڑے عرصے سے کمال کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ مذاق کی باتیں ہیں۔ قائداعظم نے تو کہا تھا کام کام کام۔ آج کل ہمارے نوجوانوں کے پاس تو سیدھا سادھا بہانہ موجود ہے کہ جی کام ملتا ہی نہیں..... پھر جس آدمی سے جان چھڑانی ہو اسے کہہ دیا جاتا ہے جاؤ اپنا کام کرو۔ ویسے یہ عجیب محاورہ ہے ہم ساری عمر دوسروں کا کام کرتے ہیں اور ایک دن اپنا کام تمام ہو جاتا ہے۔ اب یہ گانا مقبول نہیں رہا۔

آئے موسم رنگیلے سہانے جیا نہیں مانے تو چھٹی لے کے آ جا بالما

اب تو کہتے ہیں کہ کسی طرح چن ماہی روپے کمانے کے لیے دوبئی چلا جائے اور خط و کتابت پر ہی گزارہ کرے۔ اس کا ایک فائدہ ہوگا کہ چھٹی کا مزہ آ جائے گا کیونکہ بیرون ملک کام بھی کرنا پڑتا ہے ورنہ ہمارے اداروں، دفتروں، فیکٹریوں، بازاروں، میدانوں، سیاسی میدانوں اور گھروں میں بھی چھٹی کا سماں ہے۔ ہمارا ہر دن چھٹی کا دن ہے کہ ہم تو صرف گپ شپ کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں عجیب معاملہ ہے کہ جوں جوں کوئی بڑا افسر بنتا ہے اس کی ذمہ داریاں بڑھتی ہیں، اس کی تنخواہ بڑھتی ہے، اس کے کرنے کا کام کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ وہ صرف دستخط کرتا ہے پھر اس کی جگہ دستخط بھی کوئی اور کرتا ہے۔ اگر ہفتے میں چھ دن چھٹی ہوا

KitaabPoint.blogspot.com

کرے اور ایک دن کام ہوا گر واقعی ایک دن کام ہو تو ہم کچھ نہ کچھ ترقی کر لیں۔ ایک تجویز اور بھی ہے کہ 25 دسمبر کو چھٹی نہیں ہونی چاہیے اور ہم اس ایک دن میں کچھ نہ کچھ کام کریں تا کہ قائداعظم کی روح کو کچھ تو سکون ملے۔ ہمارے مسیحی بھائی بھی ہمارا ساتھ دیں۔

میں نے اگرچہ کبھی سالگرہ نہیں منائی' پھر بھی میری گزارش ہے کہ ہم سب 25 دسمبر کو اپنی اپنی سالگرہ منایا کریں۔ اگر قائداعظم پیدا نہ ہوا ہوتا تو ہمارا کیا ہوتا۔ دن تو سب کے سب ایک جیسے ہوتے ہیں مگر جو لوگ 25 دسمبر کو پیدا ہوئے ہیں کسی نہ کسی حوالے سے خوش قسمت ہوں گے۔ نواز شریف کی خوش قسمتی کی بظاہر وجہ تو صرف یہی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی وجوہات ہوں گی اور وہ بڑی بڑی بھی ہوں گی مگر سمجھ میں نہیں آتیں۔

ہمارے مقتدر اخبار روزنامہ ''پاکستان'' کی اشاعت کا پہلا دن بھی 25 دسمبر ہے۔ اب اسلام آباد سے بھی یہ 25 دسمبر کو شروع ہو رہا ہے۔ اس اخبار کی کامیابیوں میں اس دن کی برکتیں بھی یقیناً شامل ہیں۔ روزنامہ ''پاکستان'' کے قارئین کو مبارک ہو کہ آج کے دن میں کئی دن بلکہ کئی سال کئی صدیاں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ میں اپنے اخبار کی طرف سے حضرت عیسیٰ کو ماننے والوں اور قائداعظم کو جاننے والوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم اپنے پڑھنے والوں کو مایوس نہیں ہونے دیں گے۔

جو لوگ بھی 25 دسمبر کو پیدا ہوئے ہیں ان کو اس دن کی لاج رکھنی چاہیے۔ میرا اشارہ کسی خاص آدمی کی طرف نہیں ہے میرا اشارہ تو عام آدمی کی طرف بھی نہیں ہے۔ عام آدمی کو تو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ کس تاریخ کو پیدا ہوا تھا۔ آدمی کامیاب آدمی خوش قسمت آدمی خوبصورت آدمی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے حوالے سے تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات اور دوسرے واقعات کی تاریخوں کا حساب کتاب شروع ہو جاتا ہے۔ جو لوگ تاریخ بناتے ہیں یا تاریخ کو برباد کرتے ہیں' تاریخ سے ہم کلام ہوتے ہیں یا تاریخ کو اپنا ہم راز کرتے ہیں وہ اپنے آغاز اور انجام سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

اس کے باوجود میرا یہ یقین ہے کہ 25 دسمبر کو جو بھی آغاز ہوتا ہے اس کی حفاظت کوئی انوکھا راز کرتا ہے۔ اس راز کا انکشاف دنیا بھر سے اپنا اعتراف کرا لیتا ہے۔ مجھے تو اپنا ایک گمنام کلاس فیلو بھی نہیں بھولتا' جس کی عجیب عجیب حرکتوں سے استاد صاحب تنگ تھے۔ ایک دن اس لڑکے سے استاد نے پوچھا کہ قائداعظم کی تاریخ پیدائش کیا ہے اس نے صاف کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ استاد صاحب نے قدرے غصے میں پوچھ لیا کہ اچھا تم اپنی تاریخ پیدائش بتا دو اس نے بغیر کسی تامل اور تاثر کے بتایا..... 25 دسمبر

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

راقم کو ہر سال خواتین کے چند ایک کالجوں میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ یہاں کا ماحول لڑکوں کے کالجوں سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کالج کی اساتذہ اور طالبات سال بھر ان دنوں کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ طالبات اور ان کی اساتذہ مل جل کر کام کرتی ہیں۔ ایک حسن انتظام ہر کام میں دکھائی دیتا ہے سٹیج کی سجاوٹ اور ہال میں کرسیوں کی ترتیب بھی ایک خاص سلیقے کی نشاندہی کرتی ہے۔

کوئین میری کالج لاہور' اسلامیہ کالج کوپر روڈ' اپوا کالج' شاد باغ کالج' سمن آباد کالج' جناح کالج' کینٹ کالج ہر جگہ ایک ایسی فضا دکھائی دیتی ہے جس کی ایک جھلک بھی لڑکوں کے کالجوں میں دکھائی نہیں دیتی۔ لڑکوں کے کالجوں میں بے ہنگم شور اور بے تحاشا ہوٹنگ کے علاوہ فنکشن کے دوران کچھ نہیں ہوتا۔ سٹیج پر کھڑے نوجوان کو انڈے بھی پڑ سکتے ہیں اور اگر کریکر چلنے لگیں تو ہال میں بیٹھے ہوؤں کی بھی خیر نہیں۔

ایک بار انجینئرنگ یونیورسٹی میں مشاعرہ کے دوران نوجوانوں نے کاغذوں سے جہاز بنا بنا کر اڑانے شروع کر دیئے۔ جن میں سے کئی جہازوں نے سٹیج پر بیٹھے ہوئے شاعروں کی گود میں لینڈ کیا۔

خواتین کے کالجوں میں بھی ہوٹنگ ہوتی ہے مگر وہ بدتمیزی نہیں بنتی۔ لڑکوں کے کالجوں میں جو معزز حضرات مصنفین کے طور پر جاتے ہیں انہیں کوئی پوچھتا نہیں۔ لڑکیوں کے کالجوں میں وہ معزز مہمان ہوتے ہیں۔ میزوں پر پڑے ہوئے خوبصورت پھول اور چائے کے برتنوں تک ہر چیز پورے قرینے سے سجی ہوتی ہے۔ سچ ہے کہ ایک سچی عورت جہاں کھڑی ہو جاتی ہے وہاں گھر بن جاتا ہیل۔ لڑکیوں کے کالج ایک مکمل گھر کی طرح ہوتے ہیں۔

تقریبات کے دوران دو لمحے بہت اہم اور نازک ہوتے ہیں۔ ایک جب تلاوت ہوتی ہے اور پھر جب آخر میں قومی ترانہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں موقعے لڑکوں کے کالجوں میں ایک ہڑبونگ کا شکار ہوتے ہیں۔ گرلز کالجز میں دیکھا گیا ہے کہ تلاوت کے دوران نہ صرف مکمل خاموشی چھا گئی بلکہ ایک پاکیزگی بھی طاری ہو گئی۔ پھر جب ترانہ پڑھا گیا تو تمام طالبات نے اپنی اساتذہ سے مل کر ترانہ گایا۔ تب ایک لڑکی بھی چلتی ہوئی نظر نہ آئی۔ اب صرف گرلز کالجز میں جہاں تعلیم کے ساتھ تربیت بھی ہوتی ہے' تعلیم کے

KitaabPoint.blogspot.com

ساتھ ساتھ ترتیب ضروری بھی ہے کسی زندہ قوم کی ترقی اور بقاء کے لیے دسپلن لازمی ہے۔ ڈسپلن گرلز کالجز میں ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ قومی تعمیر و ترقی کے لیے منظم زندگی صرف ان اداروں میں پرورش پا رہی ہے یہاں یونیفارم کی پابندی نے بھی ایک یکجہتی پیدا کر رکھی ہے ورنہ لڑکوں کے کالجوں میں اس طرح کی پابندی کا تصور بھی نہیں ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

عارف چوھدری اور امریکی یوم پاکستان

اپنے وطن سے دور اپنی تہذیب وثقافت سے اجنبی لوگوں کے درمیان خوشی اور غم کے لمحے کچھ اور ہی کیفیت میں گھلتے رہتے ہیں۔ ہمارے لیے اب یوم پاکستان یوم عید سے کم نہیں ہوتا۔ دیار غیر میں یہ دونوں لمحے کچھ اور اہم ہو جاتے ہیں۔ اس کا اہتمام بھی ضروری ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے گھر سے دور اپنی موجودگی کا احساس ہو سکے۔ اس احساس تک رسائی کے لیے ہم نے نوجوان دانشور عارف چودھری ایڈووکیٹ سے رابطہ کیا۔ وہ کئی برس امریکہ میں رہے ہیں۔ وہاں انہوں نے پاکستانی زندگی امریکیوں پر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ بات صرف کہنے کی نہیں ہم نے جذبات کی گہرائیوں میں محسوس کیا ہے کہ اب یوم پاکستان سے بڑھ کو کوئی دن نہیں ہوتا۔ یوم عید کے لیے ایک عالمی یکجہتی کا مظاہرہ ہونا چاہیے تھا مگر میں نے ایسی کوئی کیفیت امریکہ میں اپنے قیام کے دوران محسوس نہیں کی اگر ہم اپنے ان دنوں کو پوری طرح استعمال کریں تو یہ ایک بڑی قوت کا سرچشمہ ہوں گے مگر اس سلسلے میں ایک ہی ملک میں کئی کئی عیدیں منانے کی خبروں سے ہماری بڑی جگ ہنسائی ہوئی ہے۔ نماز عید ایک عظیم الشان مظاہرہ بن سکتا ہے۔ وہ بھی فرقہ بازی کی نذر ہو جاتا ہے۔ کاش ہم بیرون ملک ہی نماز عید مل کر پڑھ سکتے۔ اس بار یوم پاکستان اور یوم عید ساتھ ساتھ آ رہے ہیں۔ ان لمحوں کو زندہ تر کیا جا سکتا ہے۔

عارف چودھری نے بتایا کہ امریکہ کے جرسی سٹی میں 23 مارچ بہت جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔ جھنڈا لہرانے کی تقریب ہوتی ہے۔ شہر کا لارڈ میئر پاکستانی جھنڈا لہراتا ہے۔ اس کے ساتھ امریکی جھنڈا لہرایا جاتا ہے۔ میں خود اس تقریب میں شریک ہوا ہوں۔ دو تین سو پاکستانی ہوتے ہیں۔ جن میں چالیس کے قریب امریکن بھی ہوتے ہیں۔ تقریریں ہوتی ہیں۔ کھانا ہوتا ہے۔ پاکستانی ترانہ بھی بجایا جاتا ہے۔ اس دن کو پاکستان ڈے کے طور پر پکارا جاتا ہے۔

عارف چودھری نے بتایا کہ 14 اگست کے دن امریکہ کے کئی شہروں میں اہتمام ہوتا ہے۔ پریڈ ہوتی ہے۔ اب 23 مارچ کے حوالے سے بھی اہتمام ہونے لگا ہے۔ میں نے قرارداد پاکستان کا ترجمہ اخباروں میں شائع کرانے کی تجویز پیش کی ہے۔ اس طرح وہاں پاکستان کے قیام کی اہمیت کا اندازہ لوگوں کو ہوگا۔ عارف صاحب سے میں نے کہا کہ ہم نے خود قرارداد پاکستان پر عمل نہیں کیا۔ یہ وقت قرارداد پاکستان کی تشہیر کا نہیں اس کی سچی تفسیر کا ہے اور وہ تصویر بنانے کا ہے جو اس تصویر کا عکس ہے ہم سچے پاکستانی کب

KitaabPoint.blogspot.com

بنیں گے۔امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کی ذمہ داریاں کچھ زیادہ ہیں۔

عارف چودھری نے کہا کہ امریکہ میں مقیم پاکستانی قومی دردمندی کے جذبے کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ پاکستان کو اواکس طیاروں کی فراہمی کے لیے بھارت نے شور مچایا تو صرف چند گھنٹوں کے نوٹس پر واشنگٹن ڈی سی میں جمع ہوئے اور جلوس نکالا اور کامیابی حاصل کی۔ وہاں مسجدیں تعمیر کیں اور ایک پاکستانی ماحول بنانے کے لیے بھی کوششیں کیں۔ مگر اس کے ساتھ بہت ہی افسوس ناک باتیں بھی ہوئیں جو نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔ ائیر پورٹ سے لے کر گھروں تک پاکستانی دوسرے پاکستانیوں کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جیسے وہ پاکستان میں ہوں۔ وہ پاکستانی کم ہوتے ہیں اور مختلف تنظیموں کے عہدیدار زیادہ ہوتے ہیں۔ مختلف قومی تقریبات میں لوگ اپنے اپنے مفادات کا سٹیج لگا لیتے ہیں۔ جبکہ بھارت سے آنے والا کوئی لیڈر اپنی جماعت کا نمائندہ نہیں ہوتا۔ وہ صرف بھارت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس معاملے میں کچھ پاکستانیوں کے اس رویئے نے مجھے بڑا دکھی کیا۔ اس وقت بھی دکھ عارف کے چہرے پر بکھرا ہوا تھا۔ اب یوم پاکستان مناتے ہوئے دکھ کا تاثر گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ عارف چوہدری اب پاکستان میں یوم پاکستان اس طرح منانا چاہتا ہے کہ امریکہ کی آنکھیں کھل جائیں۔ آنکھیں تو ہماری بھی کھلنی چاہئیں ہم تو اپنی سالگرہ میں جو اہتمام کرتے ہیں کاش اتنی اہمیت اپنے ملک کے یوم پیدائش کو دیتے اور اس کی زندگی کی فکر کرتے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

انتخاب ضیاء کی قبر کہاں ہے؟

آدمی کبھی کبھی قبرستان کا چکر لگالے تو یہ جہان اسے زیادہ بامعنی لگے۔ دراصل زندگی جتنی بامعنی ہے اتنی ہی بے معنی ہے۔ قبر تو جانے والوں کی ایک نشانی ہے' ہمیشہ کے لیے بچھڑنے والوں کو یاد کرنے کا ایک قرینہ ہے۔

بھارتیوں نے انتخاب ضیاء کی جان لینا تھی' لے لی اب اس کی میت پر قبضہ کرنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ اگر انہیں یہ اندیشہ ہے کہ اس طرح انتخاب ضیاء پر کئے گئے تشدد کا پتہ چل جائے گا یہ تو پتہ چل گیا ہے۔ بھارتیوں نے انتخاب ضیاء کو لوریاں دے دے کر تو ابدی نیند نہیں سلایا ہوگا۔ بھارتی قبر کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے ہوں گے کہ اب انتخاب ضیاء کی بوڑھی ماں کا دل اس کی قبر بن چکا ہے۔ اس کی نوجوان بیوی کی آنکھیں اس کی قبر بن چکی ہیں۔ جو مر جاتا ہے' واپس نہیں آتا مگر پیچھے رہ جانے والوں کو یہ افسوس چین نہیں لینے دیتا کہ میں مرحوم دوست کا آخری دیدار نہیں کر سکا' اس کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکا۔ یہ تو ہوتا ہے کہ وہ دوست کی قبر پر چلا جاتا ہے' قبر پہ جا کے لگتا ہے جیسے مرحوم دوست سے ملاقات ہو گئی ہے۔ قبرستان سے واپس آنے والے کہتے ہیں کہ فلاں دوست سے مل کر آ رہا ہوں۔ ملاقات کی کئی شکلیں ہیں۔ خط آدمی ملاقات ہے' یاد بھی آدھی ملاقات ہے' قبر پر حاضری آدھی ملاقات سے کچھ زیادہ ملاقات ہے۔

بھارتی انتخاب ضیاء کے عزیزوں اور دوستوں سے یہ حق بھی چھین کر اور کتنے ظالم ہو جائیں گے۔ ظلم تو جو انہوں نے کرنا تھا کر لیا' شاید ظالم کبھی ظلم کرنے سے تھکتا نہیں۔ جس کی آنکھوں میں بھوک ہو اس کا پیٹ کبھی نہیں بھر سکتا۔

اتنا ظلم مناسب نہیں۔ آخر مردہ انتخاب ضیاء بھارتیوں کے کس کام آئے گا کیا وہ اتنا ہی خطرناک آدمی تھا کہ بھارتی اس کی لاش سے بھی ڈر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بھارتی انتخاب ضیاء کو ذرا سا بھی نہ جانتے تھے' وہ اپنی ایجنسیوں کی کمزوریوں کا جائزہ لیں۔

ایک دفعہ کئی خطرناک مجرموں کو پکڑنے کے لیے بہت کوشش کی گئی مگر حسب معمول ناکامی ہوئی۔ سپاہیوں نے بستی والوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ اعتراض کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہم کیا کریں۔ ہم نے بھی نکما نہیں بیٹھنا۔ جو لوگ پکڑے گئے ہیں آپ انہیں مجرم سمجھ لیں۔ مجھے بھی بھارت جانے کا اتفاق ہوا ہے' ایک دن جب ہوٹل واپسی ہوئی تو ہمارا سامان کمرے میں بکھرا پڑا تھا۔ ہوٹل والوں نے بتایا کہ خفیہ والے آئے تھے' اب اگر وہ چاہتے تو کوئی چیز ہمارے سامان میں شامل کر کے تفتیش شروع

KitaabPoint.blogspot.com

کر دیتے۔ پاکستانی جتنی دیر بھارت میں رہتے ہیں' مجرموں کی طرح رہتے ہیں۔ انہیں ہر روز تھانے رپورٹ کرنا پڑتی ہے۔ ان کا حال بستہ الف کے بدمعاشوں سے بھی بدتر ہوتا ہے' اس کے باوجود ہم بھارت جانے سے باز نہیں آتے۔ بھارت کے لیے ہمدردی رکھنے والے سیاسی لیڈر اور ہمارے دانشور اب بھی کچھ شرم کریں اور اپنا طرز عمل تبدیل کریں' کتنے افسوس کی بات ہے کہ حکومت پاکستان کو یہ ہدایت جاری کرنا پڑی ہے کہ بھارت کے سفر سے گریز کیا جائے۔ یہی اپیل انتخاب ضیاء کی ماں نے کی ہے' ماں تو ایک سا مجھی نعمت ہے۔

انتخاب ضیاء کے لیے ہمارے ایک نامور سماجی لیڈر انصار برنی نے بھوک ہڑتال کر کے انتخاب ضیاء کی بے گناہی کو ثابت کر دیا ہے یہ بھی بتا دیا ہے کہ انتخاب ضیاء واقعی ایسا جوان تھا جس کے لیے درد محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انتخاب ضیاء بھی ایک سماجی کارکن تھا۔ وہ درد بھرا دل رکھنے والا' محبت کرنے والا آدمی تھا۔ اس کی موت کا افسوس ان کو بھی ہوا جو زندگی میں کبھی اس سے نہ ملے تھے' جو رکشے والے کسی کو لے کر انتخاب کے گھر پہنچے۔ انہوں نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا' وہ تو فرشتہ تھا۔ مجھے اس کی خالہ زاد بہن فرخندہ سے ملنے کا اتفاق ہوا' اس کی آنکھوں میں آنسو شعلوں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ اس کی باتیں کرتی تھی اور بکھرتی جاتی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ضرورت مند مریضوں کو ہر مہینے دو دفعہ خون دیتا تھا' نجانے بھارتی اس کے خون کے کیوں پیاسے ہو گئے۔ اس ایک شخص کے ساتھ زیادتی کے بعد وہ ساری دنیا میں بدنام ہوئے ہیں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

سقوط ڈھاکہ کے وعدہ معاف گواہ

''وٹنس ٹو سرنڈر'' اصل میں ایسی کتابیں لکھوائی جاتی ہیں۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد مجھے صرف یہ پتہ نہیں چلا کہ سرنڈر کیوں ہوا۔ یہ ہمیں کبھی پتہ نہیں چلے گا۔ ایسے واقعات کے اسباب کا کبھی پتہ نہیں چلا۔ پتہ چلنے ہی نہیں دیا جاتا۔ ہمیں کچھ کچھ معلوم ہوتا ہے کہ کون کون ذمہ دار ہے مگر ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ ہم سب کم از کم ان سب سانحوں کے گواہ ہیں۔ ہماری حیثیت بھی وعدہ معاف گواہ کی ہے کہ ہم زندہ ہیں۔ زندگی بھی ایک جھوٹی گواہی بنتی جا رہی ہے۔ قائداعظم نے کہا کہ کشمیری میری جیب میں ہے۔ جو کھرے تھے ہمارے سامنے ذلیل کئے جاتے رہے اور ہم دیکھتے رہے۔ دولتانہ سے کیوں کسی نے نہ پوچھا کہ آپ نے کشمیر کے لیڈر شیخ عبداللہ کے نمائندے کو قائداعظم سے کیوں نہ ملنے دیا۔ دوسری طرف صحیح معنوں میں قائداعظم کے جانشین سردار عبدالرب نشتر کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔

65ء کی جنگ میں فتح کو شکست میں بدلنے والا کون تھا۔ تاشقند کے معاہدے کو انتخاب جیتنے کا بہانہ بنا لیا گیا مگر اصل بات اب تک کیوں نہیں بتائی گئی۔ سانحہ بہاولپور میں ہماری فوج کا قیمتی اثاثہ تباہ ہو گیا اور اب تک لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا رہی ہے۔ دن بدن گواہوں بلکہ وعدہ معاف گواہوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ نجانے کیوں چشم دید گواہ ریٹائرڈ جنرل اسلم بیگ کو ابھی تک وعدہ معاف گواہ نہیں بنایا گیا۔ بالکل اسی طرح ریٹائرڈ جنرل اے اے کے نیازی کو وعدہ معاف گواہ نہیں بنایا گیا۔ اس ضمن میں مدعی تو موجود ہیں مگر ابھی تک معاملہ مدعی ست گواہ چست والا ہے ہمایوں اختر خان ممبر قومی اسمبلی بن گئے ہیں۔ اس نے ہارون الرشید سے ''فاتح'' لکھوا کر ایک کارنامہ کیا ہے۔ اب بہاولپور کا سانحہ ہمایوں اختر خان کے لیے اتنا اہم نہیں رہا۔ جہاں تک اعجاز الحق کا تعلق ہے تو وہ اپنا مقدمہ ہار چکا ہے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی تھا

سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے یہ ذکر اس لیے آیا کہ بہاولپور کے سانحے میں صدیق سالک بھی جان ہار گیا۔ وہ اگر زندہ رہتا تو ایک اور کتاب ضرور لکھتا۔ ''وٹنس ٹو بلنڈر'' میں یہ بات سالک کی زندگی میں اپنی کتاب ''مندر میں محراب'' میں لکھ چکا ہوں۔ مجھے سالک کی موت کا افسوس بہت ہے۔ میں تو اپنے فوجی اور غیر فوجی دانشوروں اور سیاست دانوں کے عمومی مزاج کے حوالے سے اپنے

KitaabPoint.blogspot.com

دکھ کا اظہار کر رہا ہوں۔ جنرل ضیاء کی موت اس کے لیے اچھائیوں اور رحمتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے اس کی موت کے بعد اس کے ساتھ محبت محسوس کی۔ سالک کی موت بھی اس سلسلے کی ایک کڑی بن گئی۔ تب ایک دوست نے کہا تھا کہ سالک کا جنرل ضیاء کے ساتھ مرنا مشیت ایزدی کا ایک بامعنی اظہار ہے ورنہ اس سے ضیاء کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھوایا جاتا۔ میں نے سالک کی زندگی میں لکھا تھا۔ ''ایک فوجی افسر کا اپنے ہی انچارج فوجی افسر کے خلاف لکھنا کچھ اچھا نہیں۔ جنرل نیازی کے بارے میں مرا تاثر قطعاً اچھا نہیں۔ میں اس کے خلاف بھی لکھ چکا ہوں۔ ''مگر'' شاید سالک پیشہ وارانہ دیانت اور مروت سے واقف ہی نہیں۔ اس کی کتاب سے قوم کا مورال بڑھا ہے نہ اصل بات سے پردہ اٹھا ہے۔ آخر خود سالک سرنڈر سے کتنا دور جبکہ وہ جنرل نیازی کے قریب ترین افسروں میں سے۔ جس طرح آج کل جنرل ضیاء کے ہر وقت ساتھ ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب سالک صاحب سے لکھوئی گئی ہے ورنہ وہ ابتدائی طور پر ادیب ہے اندیشہ ہے کہ کچھ مدت بعد وہ ''وٹنس ٹو بلنڈر'' نہ لکھ مارے۔ پھر بھی کیا پتہ چلے گا کہ بلنڈر کیسے ہوا۔ سالک جو کچھ دیکھتا ہے اس کے بارے میں بھی سن کر لکھتا ہے۔ ایسے میں اس کی حیثیت وعدہ معاف گواہ کی ہے۔''

جب ہمارے جنگی قیدی بھارت میں تھے تو وہاں سینکڑوں کتابیں اس واقعے کے بارے میں لکھی گئیں۔ وہ کتابیں قومی فکر کے دائرے میں رہ کر لکھی گئی تھیں۔ یہ الگ بات کہ ان کا فکری دائرہ مسلمان دشمنی کے غبار میں پھنسا ہوا ہے۔ یہ غبار ہمارے اردگرد پھیلتا جا رہا ہے اور اسے پھیلانے والے وہ لوگ ہیں جو اپنے قدموں سے اڑائی ہوئی خاک دوسروں کے سر پر ڈالنے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ قومی معاملات اور مسائل کے حوالے سے ہمارے ہاں سنجیدگی اور دیانتداری سے لکھا ہی نہیں گیا۔ ہمارے پاس ڈاکٹر صفدر محمود کے سچے سیاسی تجزیئے پر مبنی کتاب اور طارق محمود کے تخلیقی تاثر والے ناول کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ کسی قومی المیے کے وقت جب قومی جھنڈا سرنگوں ہوتا ہے ہم اپنے مفادات کا جھنڈا سب سے اونچا لہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے بابری مسجد کے سقوط کے موقع پر احتجاجی جلوسوں اور سیاسی پارٹیوں کے جھنڈے دیکھے ہیں۔ قومی جھنڈا نہیں دیکھا۔ ہمیں جب نیا زخم لگتا ہے تو پرانے زخموں کی ٹیس جاگ پڑتی ہے۔ مدت ہوئی ہم مشرقی پاکستان کو بھول چکے ہیں۔ لگتا ہے جیسے وہ ہمارا حصہ ہی نہ تھا۔ اگر یہ علیحدگی مقدر ہی تھی تو کیا ایسا نہ ہو سکتا تھا کہ ہم اسے حالات بناتے کہ اس نئے ملک کا نام مشرقی پاکستان ہی رہتا۔ آدھے پاکستان کو گردن ٹیڑھی کر کے نیا پاکستان نہ کہا جاتا۔ پھر برصغیر میں بہت سے پاکستان بنتے چلے جاتے۔ بابری مسجد کے ملبے تلے پاکستان بن گیا ہے۔ جب تک ہندو پاکستان دشمنی نہ چھوڑیں گے تو وہ اپنے ملک کو بھی بچا نہیں سکتے۔ پاکستان کے خواب کی حفاظت کے لیے شہید ہونے والوں کی کمی نہیں۔ شہید کے معانی بھی گواہ کے ہیں۔ ایسے میں وعدہ معاف گواہوں کی حیثیت کیا ہے؟

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

افطاری تو کرتا ہوں

اس بات سے قطع نظر کہ یہ ایک مذہبی فریضہ ہے' روزہ ہمارے ہاں ایک تہذیبی سرگرمی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ مذہب کبھی بھی تہذیب وثقافت سے تصادم نہیں کرتا۔ یوں لگتا کہ آدھی رات کو پوری بستی جاگ پڑی ہو ایک عجیب گہما گہمی گھروں کے اندر بکھرتی تھی۔ افطار کا وقت تو جیسے بڑے انتظار کے بعد آتا کوئی اور تقریب اس سرگرمی کا مقابلہ نہ کر سکتی۔ ایک یکجہتی پورے ماحول پر طاری ہوتی۔ تب لوگ نماز بھی پڑھتے تھے۔ مگر روزہ وہ بھی رکھتے تھے جو نماز نہ پڑھتے' حالانکہ روزے میں تو عذر ہے' نماز میں نہیں۔ اس گھر والوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا جہاں دن کو چولہا جلتا تھا۔

جیسے اب وہ زمانہ ہی چلا گیا پہلے مذہب پر کسی کی اجارہ داری نہ تھی۔ نہ اسے ٹھیکیداری بنایا گیا تھا۔ اب تو لوگوں نے مفادات کو مذہب کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ پہلے خود بخود ایک احساس تھا جو لہو میں گھلتا تھا۔ رشوت لینے والا بھی شرمندہ شرمندہ رہتا تھا۔ چھپ کے یہ کام ہوتا تھا اب کھلے عام ہوتا ہے۔ ساری دنیا کو معلوم ہے کہ کونسے محکمے کے تقریباً سب کے سب لوگ رشوت لیتے ہیں پہلے لوگ چھپاتے تھے کہ روزہ نہیں رکھا۔ اب روزہ رکھ کر بھی مکر جاتے ہیں۔ اب لوگوں نے یہ اعلان شروع کر دیا ہے کہ میں روزے سے ہوں تو پھر یہ اعلان بھی کیا جانے لگا ہے کہ میں روزہ سے نہیں ہوں۔ روزہ خدا کے لیے رکھتے ہیں۔ احسان بندوں پر چڑھاتے ہیں۔ وہ لوگ جو روزہ رکھ کر جھوٹ بولتے ہیں رشوت لیتے ہیں' ظلم کرتے ہیں' ضرورت کی چیزیں پہلے سے مہنگی کر کے بیچتے ہیں۔ کیا وہ روزے سے ہوتے ہیں۔ دکھ یہ ہے کہ ہماری تہذیب ہم سے روٹھ گئی ہے۔ ہم غیر مہذب لوگ ہو گئے ہیں۔ مولوی دکھ سے نہیں کہتے کہ لوگ روزہ نہیں رکھتے۔ وہ نفرت سے کہتے ہیں کہ لوگ روزہ نہیں رکھتے۔ پابندی وہی موثر ہوتی ہے جس کے لیے خود بخود بھی آمادگی پیدا ہو۔ رسول کریم نے پہلے اپنی محبت' رحمت اور دوستی سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا تھا۔ محبوب کے لیے تو آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ آج کل کے اہل دین علماء نے عشق رسول کو بھی کاروبار بنا لیا ہے۔ جس مسلم معاشرے میں اپنے رسول کی محبت کے لیے قانون کا سہارا لینا پڑے وہاں کوئی پابندی نہیں کرائی جا سکتی۔ محمد کے لیے جان دینے والوں نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی بھی پرواہ نہ کی تھی۔ ایک تصنع اور تضاد کی فضا میں ہم اپنا کچھ بھی نہ بچا سکیں گے۔ جن دونوں ماہ رمضان میں جیسے کرفیو لگ جاتا تھا۔ روزہ خوروں کو پکڑ کے تھانے لایا جاتا اور انہیں اسی تھانے دار کے سامنے مارا پیٹا جاتا جو خود کھانا کھا رہا ہوتا۔ اس صورت حال کا ذمہ دار کون ہے۔ اب تو طاقت اور امارت کی نشانی ہی یہ ہے کہ اپنے آپ کو مختلف بنایا جائے۔ نماز روزہ تو غریبوں کی عادت ہے۔ بڑے بڑے گھروں

KitaabPoint.blogspot.com

اور افسروں کے دفتروں میں بیٹھنے والے کہتے ہیں ادھر ''محمد رمضان'' نہیں آ سکتا' اہل قلم بے چارے تو اس معاملے کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ ورنہ روزے تو اب دوسرے لوگ بھی کم کم رکھتے ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ اہل قلم اس طرح خدا کے ساتھ بے تکلفی کرتے ہیں۔ امیر لوگ خدا کے بندوں کو چڑانے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ اگر مغربی ممالک میں یہ قانون بن جائے کہ روزہ رکھنا لازمی ہے تو تقریباً سب لوگ روزہ رکھیں گے۔ وہ قانون کی پابندی کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے معاملات دوسرے ملکوں سے جیسے بھی ہیں وہ اپنے معاشرے میں کبھی قانون کے خلاف نہیں جاتے۔

میں یہ مانتا ہوں کہ ٹی ہاؤس میں افطاری سے کچھ پہلے ہی سگریٹوں کا دھواں رقص کرنے لگتا ہے۔ مگر میں نے کئی افطار پارٹیوں میں دیکھا ہے کہ افطار کرنے والوں کے لیے کچھ نہیں بچا۔ ان لوگوں میں تو شاید ایک بھی اہل قلم نہ تھا۔

اہل قلم کے لیے بغاوت کے علاوہ دوسرا راستہ ہی نہیں رکھا گیا۔ جب وہ بغاوت نہیں کر سکتا تو رواجوں کو توڑ کر یک گونہ اطمینان حاصل کرتا ہے۔ کچھ ادیب اس بات پر ناز کرتے ہیں اور حد سے گزر جاتے ہیں۔ ان کا عمومی رویہ ہے کہ وہ ان باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیتے' اس ضمن میں فرحت شاہ نے ایک شاعر باقی احمد پوری سے بات کی تو اس نے کہا کہ افطاری تو ضرور کرتا ہوں' انیس ناگی سے ایک سینئر ادیب نے کہا کہ مجھے روزے کی سب سے اچھی بات یہ لگتی ہے کہ سگریٹ پینے سے ٹوٹتا نہیں۔ انیس ناگی مسکرا کر بولے پھر تو چائے پینے سے بھی نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ ساتھ بیٹھے ہوئے ایک مدہوش ادیب بولا کہ پینے کی اور بھی اچھی چیزیں ہیں' کچھ اہل قلم پہلے روزہ رکھتے تھے۔ اب صرف روزے کا دل رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب افطار پارٹیاں بھی پی آر کا ایک ذریعہ ہیں' مگر ہمارے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں کہ اس عہد میں بھی کچھ لوگ ہیں جو پانی کے ایک گھونٹ سے روزہ افطار کرتے ہیں۔ فرحت شاہ نے بتایا کہ خالد شریف اپنے خوبصورت شوروم میں اپنی کتاب ''بچھڑنے سے پہلے'' سامنے رکھ کر افطاری پر کسی ساتھ دینے والے کے انتظار میں بیٹھے ہوتے ہیں تاکہ دہرا ثواب کمائیں' لیکن ساتھ ساتھ یہ دعا بھی مانگتے ہیں کہ اللہ کسی شاعر کو نہ بھیجنا۔

اہل قل کا کیا کہنا کہ جو لوگ روزہ رکھتے ہیں وہ اپنے آپ کو عظیم سمجھتے ہیں اور جو روزہ نہیں رکھتے وہ بھی اپنے آپ کو عظیم سمجھتے ہیں۔ روزہ ایک مجاہدہ ہے۔ روزہ دار اپنے آپ کو مجاہد سمجھ کر دوسرے لوگوں کو کافر اور واجب القتل سمجھ لیتے ہیں۔ دوسرے کچھ اہل قلم لفظ مجاہدہ پر چونکتے ہیں اور شہید ہونے کے لیے تیار ہو بیٹھتے ہیں۔ پہلے آدمی انٹرویو اس طرح دیتا تھا۔ سب سے بڑا کالم نگار میں ہوں۔ مزاح نگار بھی میں خود ہوں۔ سب سے بڑا شاعر بھی میں خود بخود ہوں اور اب کہتے ہیں کہ سب سے بڑا روزے دار بھی میں ہی ہوں۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں سب سے بڑا روزہ خور ہوں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

یہ اس کا پاکستان ہے جو صدر پاکستان ہے

راتوں رات امیر ہونے کے ساتھ ساتھ راتوں رات مشہور ہونے والی بات ہمارے ہاں عام ہو رہی ہے۔ میں پچیس سال سے اردو شعر و ادب کا طالب علم ہوں مگر میں نے شاعر کے طور پر محمد یوسف صاحب کا نام نہیں سنا تھا۔ میں نے ان کی مشہور زمانہ ''نظم'' بھی کل ہی پڑھی ہے۔ اگر حکومت یہ موقع فراہم نہ کرتی تو شاید میں ہی ''نظم'' کبھی نہ پڑھ سکتا۔ اردو نظم کا انگریزی اخبار میں شائع ہونا بھی ایک واقعہ ہے۔ جس انگریزی اخبار میں یہ ''نظم'' شائع ہوئی اس ادارے کا ایک اردو اخبار بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی اردو اخبار یا اس کا ادبی ایڈیشن یہ ''نظم'' شائع نہ کرتا۔ کسی ادبی رسالے میں اس کی اشاعت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس سے بہت بہتر اس سے بہت چیز انگریزی میں لکھوائی جا سکتی تھی۔ اخبار والوں نے تو کوشش کی تھی کہ یہ نظم کوئی نہ پڑھے مگر کچھ لوگ چاہتے تھے کہ اسے پڑھا جائے۔ یہ بات وزیر اعظم کو معلوم ہونی چاہیے۔

پہلی بات یہ ہے کہ اس تحریر کو نظم نہیں کہا جا سکتا یہ نثری نظم بھی نہیں۔ یوں بھی یہ پیروڈی ہے۔ جمیل الدین عالی کا ایک معروف گیت ہے۔ میرا پاکستان ہے یہ تیرا پاکستان ہے۔ جو مشہوری مذکورہ نظم کو ملی اس کے مقابلے میں کسی بھی شاعری کو معروف ہی کہا جا سکتا ہے۔ میں نے ان لوگوں کو بھی یہ نظم تلاش کرتے دیکھا جنہوں نے ساری عمر کوئی نظم نہیں پڑھی ہوگی۔ وہ لوگ بھی پریشان تھے جنہوں نے کبھی انگریزی اخبار کی شکل تک نہیں دیکھی۔ اردو زبان کو قومی زبان نہ سمجھنے والے صاحب بہادروں کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے۔ انگریزی اخباروں کی اشاعت بہت معمولی ہے۔ کچھ لوگ تو فیشن کے طور پر منگوا کے رکھتے ہیں' کہ دوسروں پر رعب پڑے۔

اگر حکومت کی طرف سے جلد بازی میں ردعمل ظاہر نہ ہوتا تو کسی کو پتہ نہیں لگنا تھا۔ ایک نظم نما چیز کو عالمی سطح کی چیز بنا دیا گیا ہے۔ اب یہ ''نظم'' عالمی پریس میں ''دسکس'' ہو رہی ہے' بی بی سی تو اسے شاہکار بنا کے پیش کر رہا ہے۔ بڑے بڑے شاعر یہ حسرت دل میں لیے مر جاتے ہیں کہ بین الاقوامی طور پر ان کی کسی تخلیق کا ذکر ہو۔ یہ واقعہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کے لیے شہرت کا انعامی بانڈ نکل آئے۔ لاٹری نکل آنے والی بات بھی اس واقعے کے مقابلے میں ہیچ ہے۔

نازیہ حسن نے ایک گانا گایا تھا۔ ''ہم سا ہو تو سامنے آئے''

کوئی اور کیا سامنے آتا۔ نازیہ موسیقی کے منظر نامے پر سامنے کا ایک دلفریب عکس بن گئی' مگر اس نے اپنی گائیکی میں کوئی بات تو

KitaabPoint.blogspot.com

پیدا کی تھی۔ یوسف صاحب نے تو نظم بھی نہیں لکھی اور شاعر کے طور پر نامور ہو گئے۔ یہ مقام تو حبیب جالب کو جیل جا کے بھی حاصل نہیں ہو سکا۔ اس ضمن میں جالب صاحب کہتے ہیں کہ کاش یہ نظم میں نے لکھی ہوتی۔ وہ ایسی نظم لکھ ہی نہیں سکتے' ان کی کوئی نظم بے وزن تو نہیں۔ جالب صاحب کو ضرور افسوس ہوگا کہ وہ بے وزن شاعری کرتا تو شاید زیادہ مشہور ہو جاتا۔ یہ بات تو درست ہے کہ جو باتیں اس نظم میں کہی گئی ہیں' جرات مندانہ ہیں۔ اس مقصد کے لیے مولانا مظفر علی خان اخبار کے اداریے لکھا کرتے تھے۔ وہ جب نظم کے طور پر کوئی چیز لکھتے تھے تو وہ شاعری کے تمام قواعد وضوابط کے مطابق ہوتی تھی۔

اس سے پہلے تاج کمپنی کے زخم خوردہ لوگوں نے بڑے دردناک بیانات دیئے۔ احتجاجی مظاہرے بھی کئے' مگر جو کچھ اس ٹوٹی پھوٹی نظم نے کر دکھایا ہے کسی سے نہ ہو سکا۔ اس سے شاعری کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے مگر کیا کریں کہ یہ شاعری بھی نہیں ہے۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ یہ شاعری ہے یا نہیں اس کے ذریعے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر جو نتائج حاصل ہوئے ہیں وہ کسی معرکے سے کم نہیں ہیں جبکہ یہاں ملک وقوم کے خلاف بیانات دیئے جاتے ہیں اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

ایک بات ثابت ہو گئی ہے کہ جرات انسان کی سب سے نرالی ادا ہے۔ جرات بہادر آدمی کرتا ہے یا مجبور آدمی۔ مجبوری جس مقام پر بہادری بنتی ہے وہاں کھڑا ہوا آدمی بڑے سے بڑے ظالم اور جابر کو للکار سکتا ہے۔ سرکاری مشینری جس قوت اور وہ پھرتی سے اب حرکت میں آئی ہے' اس سے بہت کم توجہ لٹنے والے لاکھوں انسانوں کی طرف دی جاتی تو معاملہ مکمل طور پر حکومت کے حق میں ہوتا۔ مظلوم کا مقدر ہے کہ وہ گھٹ گھٹ کے مر جائے' عام طور پر ہوتا بھی یہی ہے مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مظلوموں کی پکار ایوانوں کو ہلا دیتی ہے۔

جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس عہد کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

مگر یہاں یہ بھول صرف اتنی ہے کہ خوشامدی افسران اور مشیران سلطانوں سے ایسا کام کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو نہ ہو جائے تو زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات کچھ نہ کرنا بہت کچھ کرنے سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ موقع پرست وزیر اعظم سے ایسا بیان دلوانے میں کامیاب ہو گئے کہ دوسرے دن اس کی عملی تردید کرنا پڑی۔ اس سلسلے میں وزیر اعظم کی خاموشی ہزار جوش وخروش سے افضل ہوتی۔ اخبار والوں سے اقتدار والوں کی لڑائی سے فائدہ انتظار والوں کو ہوتا ہے۔ ہمارے سیاست دان اقتدار میں رہتے ہیں یا اقتدار کے انتظار میں۔ یہ کیسے ہوتا ہے کہ کسی کو نقصان پہنچانے کے ارادے سے جو کچھ کیا جاتا ہے وہ ناقابل یقین فائدہ بن

KitaabPoint.blogspot.com

جائے۔

سب کو معلوم ہے کہ جناب نواز شریف کو لیڈر بنانے میں بینظیر بھٹو اور ان کے دوستوں کا ہاتھ بھی ہے۔ اب نواز شریف اور ان کے دوست آصف زرداری کو لیڈر بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ البتہ یہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ وہ کسی کو شاعر بھی بنا سکتے ہیں۔ ہمارے لیے تو یہ بھی حیران کن ہے کہ کمتر شاعر کو تمغہ حسن کارکردگی دے دیا جائے۔ یوسف صاحب کو اب تمغہ حسن کارکردگی اگلی حکومت میں ملے گا۔ انہوں نے اپنی نظم نما تخلیق میں عالی صاحب کے مصرعے کا ایک لفظ تبدیل کر کے جو بات پیدا کی ہے وہ بڑی بڑی سیاسی شاعری پر بھاری ہے۔ یہ سوچ ایسا سچ ہے جو بہت دردناک ہے۔

یہ میرا پاکستان ہے یا تیرا پاکستان ہے

شاید یوسف صاحب نے اس مصرعے کی پیروڈی نہیں سن رکھی۔

یہ میرا پاکستان ہے نہ تیرا پاکستان ہے
یہ اس کا پاکستان ہے جو صدر پاکستان ہے

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

جے سالک کی جے

جے سالک سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی مگر ان سے اکثر ملاقات ہوتی ہے۔ اخبار والے انہیں پسند کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے خبریں نصیب ہوتی ہیں۔ دلچسپ اطلاعات ورنہ بری خبریں پڑھ پڑھ کر اتنا جی خراب ہوتا ہے کہ ان پڑھ لوگ خوش قسمت لگنے لگتے ہیں۔ سالک صاحب نے مختلف اوقات میں سرعام جو حرکتیں کیں' تصویریں بھی مزیدار اترتی ہیں۔ کارٹون بنانے والوں کو بھی آسانی ہوتی ہے۔

اکبر الہ آبادی نے بہت پہلے ایک شعر کہا تھا۔

اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجئے
اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجئے

جے سالک نے اپنے آپ کو تختہ دار پر لٹکا لیا۔ وہ تخت یا تختے کے بری طرح قائل ہیں۔ فی الحال وہ تختے کو ہی تخت بنانے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ یہ تہیہ اس سے مختلف نہیں جو سارے سیاست دان کئے رکھتے ہیں اور ہوتا کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ آپ نے دیکھ لیا کہ کتنی دیر تک پھانسی پائے رکھنے کے باوجود سالک صاحب زندہ ہیں بلکہ زندہ تر ہو گئے۔ اگلے دن اخبار ان کے تھے۔ سالک صاحب کے پیغمبر حضرت مسیح علیہ السلام کو ہم بھی مانتے ہیں' مگر ہم ذرا اور طرح سے مانتے ہیں۔

حضرت یسوع مسیح کے ماننے والوں نے ان کی صلیب کو متنازعہ بنا رکھا ہے۔ سالک صاحب بے چارے تو ایک امتی ہیں۔ چنانچہ ایک مسیحی ایم این اے طارق سی قیصر' مسیحی کونسلر صاحبان کھوکھر اور طارق گل نے ان کے خلاف بیانات دیئے ہیں۔ انہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ سالک صاحب کو جیل بھیجنے کی بجائے پاگل خانے بھیجا جائے۔ یہ زیادتی ہے ویسے ہمارے ہاں جیل خانے اور پاگل خانے میں کوئی خاص فرق نہیں۔ انہیں نااہل قرار دینے کی بھی بات کی گئی ہے' نوجوان شاعر جاوید صدیق بھٹی نے مسیحیوں سے اتحاد کی اپیل کی ہے مسیحی پاکستانی بھی ہیں وہ اس بات پر کان نہیں دھریں گے۔

سالک صاحب مسیحی ممبر قومی اسمبلی کے طور پر مسیحیوں کے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کر چکے ہیں۔ وہ نمبر ون مسیحی ممبر قومی اسمبلی ہیں۔ سالک صاحب کو یہ بھی دکھ ہے کہ ویز را قلیتی امور پیٹر جان ملہوترا کو بنایا گیا ہے جس نے تیسرے نمبر پر ووٹ حاصل کئے۔

KitaabPoint.blogspot.com

ہمارے ہاں سیاسی عہدوں کے لیے کبھی اہلیت اور استحقاق کا خیال نہیں رکھا گیا۔ صرف یہی منصب ہیں جن کے لیے کوئی میرٹ نہیں ہے۔ سالک صاحب کا اصل مطالبہ یہ تھا جس کا ذکر وہ اخبار نویسوں کے سامنے نہیں کرتے کہ مجھے کیوں وزیر نہیں بنایا گیا۔ سارے پاکستانی سیاست دان ایسے ہی کرتے ہیں' سیاسی حوالے سے مسلمان اور مسیحی میں کوئی فرق نہیں۔

اس کے بعد سالک صاحب نے عوامی لیڈر کی اداکاری شروع کی اور پھانسی پانے کا ڈامہ کیا۔ اس طرح کا کام ہمارے کئی اداکار پہلے ہی کر چکے ہیں' ویسے سالک صاحب رسی سے لٹکتے ہوئے اچھے لگ رہے تھے۔ گھر میں خودکشی کرنے والے کو دیکھ کر لوگوں کی چیخیں نکل جاتی ہیں جبکہ یہاں ہنسی نکل گئی۔ فرق صاف ظاہر ہے' شاید یار فرید نے ایسے ہی موقعے کے لیے کہا تھا۔

ہتھوں الٹا عالم کھلدا
کوئی محرم راز نہ ملدا

پھر چار و ناچار سالک صاحب کو پنجاب پولیس نے سمجھایا اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہماری پولیس سمجھنے سمجھانے میں بڑی ماہر ہے' سنا ہے سالک صاحب کی پٹائی ہوئی تھی' مگر کچھ دنوں کے بعد انہوں نے پھر اپنا کام شروع کر دیا۔

یہ بھی دیکھنا ہے کہ سالک صاحب کہتے ہیں کہ ہر ایم این اے کو اپنے علاقے کی فلاح و بہبود کے لیے فنڈ ملتا ہے انہیں نہیں دیا گیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر سوچنا پڑے گا کہ غلط کیا ہے۔ اگرچہ یہ فنڈ ایم این اے صرف اپنی فلاح و بہبود پر خرچ کرتے ہیں۔ ہمارے نمائندوں نے اپنے حقوق اور فرائض کو گڈمڈ کر دیا ہے تو پھر صرف سالک صاحب ہی کیوں محروم رہیں۔ وہ گھر کا سامان ہی خرید لیں گے۔

سالک صاحب کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ اتوار کے دن صبح کے وقت ریڈیو ٹی وی پر مسیحیوں کی عبادت کے لیے چھوٹا سا پروگرام دیا جائے' یہ بھی غلط بات نہیں۔ ایک اسلامی جمہوریہ کی حیثیت سے اقلیتوں کے مذہبی جذبات کا خیال رکھنا چاہیے۔ رسول کریم نے ایک دفعہ عیسائیوں کے ایک وفد کو اتوار کے دن عبادت کے لیے اپنی مسجد دے دی تھی۔ عیسائی مسجد نبوی میں گاتے بھی رہے۔ آخر کرسمس کے موقع پر بھی مسیحیوں کے پروگرام ٹی وی پر ہوتے ہیں۔ ہر اتوار کو دس پندرہ منٹ کا پروگرام مناسب ہے۔ یوں ہمارے ٹی وی پر دن رات میں کئی دفعہ گانے بجانے کے پروگرام ہوتے ہیں۔

ان کا تیسرا مطالبہ بہت دلچسپ ہے کہ شراب مسیحیوں کے لیے بھی حرام ہے۔ یہ ہماری توہین ہے کہ مسیحیوں کے پرمٹ پر مسلمان شراب نوشی کریں۔ ان کے خیال میں یہ اقدام حکومت کی طرف سے امریکہ وغیرہ کو خوش کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ میرا

KitaabPoint.blogspot.com

خیال ہے کہ ہمارے کچھ افسروں اور کچھ سیاسی لیڈروں نے اس مطالبے کا برا منایا ہوگا۔ یہ راستہ بھی بند ہو گیا تو کیا ہوگا۔ اگرچہ افسروں اور سیاست دانوں کے لیے اس طرح کے راستے کبھی بند نہیں ہوتے مگر پھر بھی احتیاط اچھی چیز ہوتی ہے۔ سالک صاحب یہ مطالبہ واپس لے لیں تو شاید ان کے دوسرے مطالبوں پر غور کیا جائے۔ اس طرح مسیحی وڈیرے بھی ان سے ناراض ہو جائیں گے۔ مغربی ملکوں میں شراب پر پابندی نہیں ہے۔ یہاں بھی ایسا ہو جائے تو شاید سالک صاحب کو اعتراض نہ رہے۔ وہ مسیحیوں کو الگ تھلگ کرنے کے خلاف ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسیحیوں کے شناختی کارڈ کا رنگ بھی مختلف نہیں ہونا چاہیے۔ یہ باتیں ان کی پاکستانی سوچ کی ترجمانی کرتی ہیں' مگر پھر وہ مسیحیوں کی ملازمتوں کے لیے کوٹہ سسٹم کی بات کیوں کرتے ہیں۔ جب میرٹ کی بات آئے گی تو پھر سب برابر ہیں۔ کسی قسم کی ترجیحات مناسب نہیں۔ کوٹہ سسٹم نے پہلے ہی ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ حتیٰ کہ مشاعروں میں شرکت کرنے والے کوئٹے کے عطا شاد کو کوٹے کا شاعر کہا جانے لگا ہے۔

دو چار روز پہلے پولیس سالک صاحب کو گرفتار کر کے لیے گئی تھی۔ پھر انہیں چھوڑ دیا گیا' سالک صاحب کو اپنی گرفتار پر اعتراض نہیں تھا۔ اس پر اعتراض ہے کہ مجھے چھوڑ کیوں دیا گیا۔ کچھ تو آرام سے رہ لینے دیتے۔ اقبال نے نجانے کس کے لیے کہا مگر ان کے شعر کا ایک مصرعہ ہے۔

یہ سالک روایات میں کھو گیا

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

ایرانی صدر کے سامنے

ایک آدمی خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ ایران کے صدر عزت مآب علی اکبر ہاشمی رفسنجانی کی داڑھی نہیں ہے ورنہ آج کل پاکستان میں داڑھی والوں کی شامت آئی ہوئی ہے۔ لوگ حکومت وقت کے کئی وزیر مولویوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ایرانی صدر نے پاکستان میں جو باتیں کی ہیں اس سے تصدیق ہوگئی ہے کہ وہ مولوی ہرگز نہیں ہیں۔ کچھ کچھ لگتا ہے کہ وہ شیعہ بھی کم کم ہیں' سیدھے سادھے پکے مسلمان ہیں۔ انہوں نے واضح طور پر کہا ہے کہ کوئی شیعہ یا سنی نہیں' سب مسلمان ہیں۔ کاش یہ بات سب کی سمجھ میں آ جاتی۔ ہم ایک دوسرے کو بس شیعہ اور سنی سمجھتے ہیں۔ ہمیں مسلمان سمجھنے کے لیے غیر مسلم کافی ہیں۔ وہ ہمیں بہرحال مسلمان سمجھتے ہیں۔ اس وقت تو صرف مسلمان سمجھتے ہیں جب ہم پر ظلم ڈھا رہے ہوتے ہیں۔

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

امریکہ اور مغربی قومیں مسلمانوں کی حکومتوں کو شیعہ یا سنی حکومتیں نہیں گردانتیں۔ وہ ایران کے خلاف ہیں اور عراق کو بھی سبق سکھانے میں مصروف ہیں۔ اس کام کے لیے وہ مسلمان ملکوں میں اپنے ایجنٹوں کا استعمال کرتے ہیں کہ وہ فرقہ واریت کو ہوا دے کر ان کا راستہ ہموار کریں۔

عزت مآب جناب علی اکبر ہاشمی رفسنجانی نے یہ بھی کہا ہے کہ فتوے تو شیعہ مولوی بھی ایک دوسرے کے خلاف دیتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں یہ کام شیعہ برادری میں نہیں ہوتا۔ سنی مولوی یہ فرض ایک دوسرے کے خلاف بلاخوف وخطر استعمال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو جہاں اکثریت میں ہیں وہی یہ کام کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں کچھ سنی مولوی شیعوں کو کھلے عام کافر کہتے ہیں۔ ایران میں کچھ شیعہ مولوی سنیوں کو مومن نہیں سمجھتے۔ خاص طور پر ہمارے حکمران اس حوالے سے مکمل طور پر فراخدل ہوتے ہیں۔ کافی حد تک ایرانی حکمران بھی ہیں۔ حضرت امام خمینی اور ان کے جانشینوں نے ہمیشہ ایسی باتیں کیں جس سے رواداری کی خوشبو آئی۔ اللہ کرے یہ خوشبو پورے عالم اسلام میں پھیل جائے۔

ایرانی صدر کی آمد پر پاکستان کے تمام طبقوں کے لوگ ایک خوشگوار خیر مقدمی کیفیت میں ہیں اور تو اور انجمن سپاہ صحابہ کے لیڈر

KitaabPoint.blogspot.com

مولانا ضیاء الحسن فاروقی نے کہا ہے کہ ہم ایرانی صدر کو ثالث ماننے کے لیے تیار ہیں۔ یہ باتیں سن کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے تو پھر مصیبت کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ محبتوں بھرا جھنگ شہر میدان جنگ کیوں بن جاتا ہے۔

ایرانی صدر کے پاکستان آنے پر رواداری اور کشادگی کی فضا بن رہی ہے' اسے برقرار رکھنا چاہیے۔ مگر انہی دنوں میں ایسے اقدامات ہو رہے ہیں کہ ایک بے رنگ بدمزگی پھیلتی جا رہی ہے۔ انجمن سپاہ صحابہ کے ایم این اے مولانا اعظم طارق کو پالیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں جانے سے پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا جہاں ایرانی صدر خطاب کرنے والے تھے۔ چنانچہ یہ تاثر پختہ کر دیا گیا ہے کہ انجمن سپاہ صحابہ والے ایرانی صدر کی آمد پر گڑبڑ کرنا چاہتے ہیں' حالانکہ یہ ممکن ہی نہیں ان کا ایسا پروگرام ہو۔ حکمرانوں کے نادان دوست اور حفظ ماتقدم کو مقدم رکھنے والی افسر شاہی موجود ہے تو وہ برسر اقتدار لوگوں سے ایسے اقدامات کرواتی رہے گی جو آخر کار ان کے حق میں نہیں ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اعظم طارق صاحب پارلیمنٹ میں ایرانی صدر کی موجودگی میں کوئی ایسی بات نہ کرتے جو ہمارے لیے اجتماعی رسوائی کا باعث ہوتی۔

محترمہ بینظیر بھٹو کا رویہ بھی ایسا قابل اعتراض نہیں تھا جتنا ان کے خلاف بیان دیئے جا رہے ہیں۔ وہ اسی ایوان میں قائد ایوان بھی رہ چکی ہیں۔ اب قائد حزب اختلاف ہیں۔ یہ پارلیمانی روایات کا حصہ ہے کہ قائد حزب اختلاف کو بھی معزز مہمانوں سے ملاقات کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ اگر اسمبلی میں محترمہ بینظیر بھٹو کی ایرانی صدر کے لیے شکریئے کے کلمات کہہ دیتیں تو کیا قیامت آ جاتی۔ کیا وہ ایرانی صدر کی تقریر کے دوران کوئی احتجاج کرتیں۔ تو یہ خیال کرنا بھی مناسب نہیں۔ یہ سوچنا بھی زیادتی ہے۔ ان کا وہ رویہ اتنا مناسب نہیں تھا جو انہوں نے صدر اسحاق کان کی تقریر کے دوران اپنایا تھا۔ اگر حالات سازگار رکھے جائیں تو ایسے موقع ہماری سیاسی تاریخ میں بار بار نہ آ جائیں۔ ہماری ہر حکومت حزب اختلاف سے وہی رویہ رکھتی ہے جو پہلی حکومت نے اپنایا تھا کوئی ایک حکومت تو جمہوری رواداری سے کام لے۔ کوئی ایک مثال تو قائم ہو۔ پھر رفتہ رفتہ ہمارا سیاسی ماحول بھی بے مثال ہو جائے گا۔

محترمہ بینظیر بھٹو کے اس اقدام کے بارے میں ایک غیر متوقع بات جناب غلام حیدر وائیں نے کی ہے کہ یہ کمتر برائی ہے۔ ورنہ حکومتی حلقے کسی سے برتر برائی کی توقع کر رہے تھے۔ چلئے ایک کام تو ان کی توقع کے برعکس نسبتاً اچھا ہوا۔

بہر حال جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری حزب اختلاف اور حزب اقتدار دونوں پر برابر برابر ڈالی جا سکتی ہے۔ ایرانی صدر رواداری اور اخوت کی بات کر رہے ہیں۔ ہم جو اپنے ملک میں ایک دوسرے سے کر رہے ہیں۔ اسے مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔ کاش ہمارے سب لیڈر کچھ موقعوں پر تو مکمل قومی اتحاد اور یکجہتی کا مظاہرہ کیا کریں۔ ہمارے ہاں مظاہرے کا مطلب صرف احتجاجی مظاہرہ سمجھ لیا گیا

KitaabPoint.blogspot.com

ہے۔

جب ایران میں انقلاب آیا تھا تو اسے دنیا بھر کے مسلمانوں نے اسلامی انقلاب ہی سمجھا تھا۔ مسلم دشمن طاقتوں نے بھی یہی سمجھا تھا۔ وہ تو اب تک یہی سمجھتے ہیں' انہیں تو اب تک پریشانی ہے اگرچہ عالم اسلام میں اور خود ایران میں کوششیں کی جارہی ہیں کہ اس انقلاب کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکل سکے۔ ایرانی صدر جناب اکبر ہاشمی رفسنجانی کے ارشادات اور اقدامات سے پھر حوصلہ ہوا ہے اور اسلام دشمن عناصر کو تکلیف پہنچی ہے۔

ایران ہمیشہ پاکستانیوں کے لیے محبت کا دائرہ رہا ہے۔ ہماری کسی بھی حکومت نے مسلمان ملکوں سے کسی معاہدے کا سوچا ہے تو اس میں ایران شامل رہا ہے۔ آر سی ڈی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ شیعہ برادری صدر ضیاء الحق کے ساتھ کبھی نہیں رہی' مگر ایران کے لیے ان کے دل میں بھی کئی اچھے جذبے موجزن رہتے تھے۔ میں نے جب وہ تصویر دیکھی جس میں صدر ضیاء کے قریب ترین دوست جنرل اختر عبدالرحمٰن' حضرت امام خمینی کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں تو یہ تصور میرے دل میں پیدا ہوا کہ وہ سلطنت ایران کو سرخرو اور طاقتور دیکھنا چاہتے تھے۔ جہاد افغانستان کی کامیابی کے بعد صدر ضیاء پاکستان' افغانستان ایران کی عسکری تکون سے عالم اسلام کو نئی عزت مندیوں سے سرفراز کرنے کی آرزو رکھتے تھے۔

اسلامی انقلاب کے بعد ایران کا کردار جرات مندانہ اور منصفانہ ہے۔ عالمی مسائل کے حوالے سے مجھے صرف دوست ملک چین کے علاوہ کوئی دوسرا ملک یاد نہیں آ رہا۔ جس نے اتنا صاف شفاف رویہ اپنایا ہو۔ کشمیر کے مسئلے پر دوست ملک چین اور برادر ملک ایران کی حمایت ایک مجاہدانہ کردار کی طرح ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خلیجی جنگ کے دوران جب کئی اسلامی ملک مصلحتاً خاموش رہے' ایران نے کھل کر امریکی اقدامات کی مذمت کی۔ اس کا فائدہ عراق کو ہوا' جس کے ساتھ آٹھ سال تک ایران کو حالت جنگ میں رہنا پڑا۔ پوری دنیا میں عالم اسلام کے لیے غیرت مندی کا احساس جتنا ایران کو ہے' کم کم کسی دوسرے ممالک کو نصیب ہوا ہے۔ اس حوالے سے بھی ہم پر ایرانی صدر اور ایرانی عوام کا شکریہ واجب ہے۔

عالم اسلام کے حوالے سے جن تین ملکوں پر سب سے بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے ان میں پاکستان' ایران اور سعودی عرب شامل ہیں۔ ایک نئی مشترکہ حکمت عملی کے لیے ایران پہل کرے۔ ایرانی حکومت سے بجا طور پر توقع ہے کہ وہ اس مصنوعی تاثر کو ختم کرنے کے لیے بھی اقدامات کرے جو ان کے عظیم تر اسلامی انقلاب کو شیعہ انقلاب قرار دینے کا پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ وہ دنیا بھر کی

KitaabPoint.blogspot.com

شیعہ برادری کو ہدایت کریں کہ وہ فرقہ واریت کو ختم کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کریں۔ امریکہ اور مغربی طاقتیں جو کچھ مسلمانان عالم کے لیے عذابوں کا بیج بو رہے ہیں' اس کی فصل کاٹنے والا کوئی اور ہوگا۔

اے گرفتار ابوبکر و علی ہشیار باش

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

تبلیغی جماعت کا اصل کام

کیسی کیسی کوششوں سے جب تین آدمیوں پر مشتمل پہلی جماعت تبلیغ کے لیے نکلی تو تبلیغی جماعت کے بانی مولانا الیاس نے کہا:

''آج سے ایک انقلاب آ گیا ہے''

سچے آدمی کی بات کو فطرت اور تاریخ پورا کرنے کی پابند ہے۔ تبلیغی جماعت کو جماعت کہنا گراں گزرتا ہے۔ جماعت کا لفظ جماعت اسلامی والوں نے اغواء کر لیا ہے اخبار نہ پروپیگنڈا نہ دفتر نہ کسی سیاسی گروہ سے تعلق نہ کسی دینی فرقے سے نہ حکومت سے غرض نہ حزب اختلاف سے نہ ممبر شپ نہ ریکارڈ نہ دائیں بازو والوں سے رابطہ نہ بائیں بازو والوں سے۔ ان لوگوں کے پاس کچھ بھی نہیں سوائے ارادے کے۔ ارادہ ہی ان کا سب کچھ ہے۔ ان کا طریقہ تبلیغ بھی یہی ہے کہ جناب کچھ نہ کیجئے ارادہ تو کیجئے۔ یہ ارادہ ہے کہ اب دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جہاں تبلیغی جماعت والے نہ پہنچے ہوں۔ مولانا الیاس نے کہا تھا:

مسلمانو! سنو اس دن یہ کام ختم ہو جائے گا جب تم میں سے کوئی یہ سمجھنا شروع کر دے گا کہ دین کا کام صرف وہی کر رہا ہے۔

مولانا کا خیال تھا کہ جو بھی جس طرح کام کر رہا ہے۔ اسے کرنے دیا جائے۔

مولانا نے انکساری کی انتہا کر دی' ابتدا ہی میں ایک انتہا تلاش کر لی۔

تبلیغیوں پر ایک اعتراض بھی ہے کہ گھر سے نکلتے ہیں تو ان کے گھر والے بے گھر ہو جاتے ہیں بلکہ بے راہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے گھروں پر شیطان کامیاب حملے کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ان کے پیچھے وہی حال ہوتا ہے جو پیسہ کمانے کے لیے غیر ملکوں میں جانے والے کا ہوتا ہے۔ پیسے کمانا اور نیکیاں کمانا مختلف عمل ہے مگر کبھی کبھی مختلف لگتا نہیں۔

اچانک جب ایک تبلیغی بھائی نے راہ چلتے آدمی سے کہا کہ کلمہ سناؤ تو اس نے گھبرا کر پوچھ لیا۔

کیوں جی کلمہ بدل گیا ہے؟

ہم نے کلمہ بھلایا نہیں۔ رٹے رٹائے سبق کی طرح ہم پڑھتے رہتے ہیں۔ اور ہمیں پتہ نہیں ہوتا کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں۔ کلمہ اور کلمات بدلنے کی کوششیں بھی بہت ہو رہی ہیں۔ اصل میں مسلمان کو مسلمان کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ انسان کو انسان بنانا ہے مگر وہ معاشرہ کہاں ہے جس میں انسان نے رہنا ہے۔ تبلیغی بھائی ان تکلفات مین نہیں پڑتے۔ ان کا جو تبلیغی نصاب ہے اس میں زکوۃ کا

KitaabPoint.blogspot.com

ذکر نہیں' جہاد کا ذکر نہیں' نئے زمانے میں بدلتے ہوئے حالات کی سنگینی کا ذکر نہیں' شاید کسی معاشی نظام کو ان کی ضرورت نہیں۔ تبلیغی جماعت والوں کی دردمندی اور خلوص پر کسی کو شک نہیں مگر اس کا کیا کریں کہ ہماری رقتیں اور دقتیں ایک ساتھ بڑھتی جا رہی ہیں۔ تبلیغی بھائی نماز کی تلقین اور ایسی ہی چند چیزوں کے علاوہ کسی آدمی سے کوئی اور کام لینا نہیں چاہتے۔ تبلیغی امور کے علاوہ معاملات دنیا میں ان کا کردار و عمل مثالی نہیں بلکہ کہیں کہیں مستحسن بھی نہیں ہوتا۔ اقبال نے نجانے کسے مخاطب کیا تھا۔

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

جدید زمانے کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تبلیغی جماعت والے کب سوچیں گے۔ ہمارے خوف اور ہمارے خواب ایک ہی لباس پہنتے جا رہے ہیں۔ تبلیغوں کے پاس آج بھی کسی سوال کا جواب نہیں ان کے پاس صرف ارادہ ہے لیکن وہ دنیا والوں کے ارادوں سے بے خبر ہیں۔

جن نومسلموں کی موجودگی ان کی ہمت بڑھاتی ہے' کہیں وہ بڑے بڑے غیر ملکی اداروں کے ایجنٹ تو نہیں جو ہر وقت اس ٹوہ میں ہوتے ہیں کہ مسلم طاقت کہاں کہاں ہے اور کہاں تک ہے؟ دیکھیں تو نومسلم بہرحال مسلمانوں کے گھر پیدا ہونے والوں سے لاکھ درجے افضل ہیں مگر ہم مسلمان اتنی بار ڈسے گئے ہیں کہ مغربیوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ جب بھی کہیں مسلمانوں کی بہتری اور برتری کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں تو مسلم دشمن قوتوں کے ادارے بری طرح سرگرم ہوتے ہیں۔ اب تو شاید مسلمانوں کا کوئی اجتماع انہیں پریشان نہیں کرتا۔ نہ حج کا نہ تبلیغی جماعت کا اور جس اجتماع یا جماعت سے مخالف کو کوئی خطرہ نہ ہو اسے کیا کہا جائے کیا کیا جائے؟

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کو تحریک کا روپ دے دیا تھا اور پھر اپنی جدوجہد کو انقلاب سے ہمکنار کر دیا' آخر تبلیغی جماعت والے اصل کام کب کریں گے۔ جب مرحوم ضیاء الحق تبلیغی جماعت کے سالانہ اجتماع میں جا پہنچے تو یار لوگوں نے کئی باتیں بنائیں۔ کیا ضیاء الحق ایک غیر سیاسی مذہبی گروہ تبلیغی جماعت کو اپنی جماعت بنانے والا تھا' یہ سوال بھی تاریخ کے دل میں گم ہو گیا ہے۔ امت مسلمہ کے کھوئے ہوئے وقار کی جستجو میں تبلیغی جماعت والے کب نکلیں گے؟ مسلمانوں کا نیا زمانہ کب شروع ہوگا؟

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

نیلی کے لیے بے ارادہ تاثر

ہدایت کار یونس ملک کا جھگڑا فلم سٹار انجمن سے ہو رہا تھا۔ ہاتھ پائی ہوئی۔ یونس ملک نے انجمن سے کہا کہ میں اب ایسی ہیروئن لے کر آؤں گا کہ تم دیکھتی رہ جاؤ گی اور وہ نیلی کو فلم انڈسٹری میں لے آیا۔ نیلی وہیں سے آئی جہاں سے اکثر فلمی ہیروئنیں آتی ہیں مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس مقام پر پہنچ گئی جہاں وہ ننگی خواہش کی ایک تصویر لگتی ہے۔ اس نے مقبولیت اور مطلوبیت کو رلا ملا دیا۔ پھر انجمن نے شادی کر لی اور بابرہ دور سے نظر آنے والا شرارہ بنتی چلی گئی۔ نیلی نے فلمی منزلوں کی طرف سفر تیزی سے کیا پھر جاوید شیخ اس کے ساتھ نتھی ہو گیا۔ شاید اس سے کوئی فائدہ بھی نیلی کو ہوا۔ اب نیلی بھی اس سے تنگ ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اس نے جاوید کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ یہ ایک عجیب معاہدہ ہے جس کا اعلان انہوں نے کھل کر نہیں کیا بلکہ اس رشتے کے بارے میں زبان بند رکھنے کا فیصلہ کیا ہے مگر دوسروں کو سرگوشیاں کرنے سے کون روک سکتا ہے۔ کبھی کبھی سرگوشیاں شرگوشیاں بن جاتی ہیں۔ نیلی کی فلمیں دیکھنے والے جاوید شیخ کو بھی برداشت کرتے ہیں۔ ابھی یہ معاملہ ناقابل برداشت حد تک نہیں پہنچا۔ جاوید فلٹریشن کا ماہر ہے۔ عوامی شاعر حبیب جالب کی پکچر ''کالے چور'' میں نیلی کی اداکاری اپنے کمال پر تھی۔ حسینہ 420 میں تو وہ پردہ سکرین پر ایک فریبی انوکھے منظر کی طرح نمودار ہوئی تھی۔ پھر لوگوں نے بار بار یہ منظر دیکھنا چاہا تھا۔ ایک فلم میں دیبا نیلی کی ماں کا کردار ادا کر رہی تھی۔ نیلی اسے اچھی لگی کہ وہ اس سے لپٹ گئی۔ اس پر ایک دیباچہ لکھا جا سکتا ہے۔ اس کی تعریف ایک رنگ رکھتی ہے۔ غالباً منظر یہ تھا کہ نیلی کو پیچھے سے کسی کا ہاتھ لگتا ہے اور وہ ٹھٹھک کے رہ جاتی ہے اس کے ٹھٹھکنے میں ایک ایسی ادا تھی جس میں ذرا سا خوف تھوڑی سی خوشی ہلکی سی سراسیمگی گھل مل گئی۔ وہ یوں چونکی کہ ہدایت کار بھی سکتے میں آ گیا۔ بابرہ کے بعد ایک آرٹسٹ کے طور پر وہ آمنے سامنے آئی ہے لڑکیاں بالعموم رقص کرتی ہوئی فلم انڈسٹری میں داخل ہوتی ہیں۔ چہرے کے تاثرات سے زیادہ بدن کی حرکات سے اپنی موجودگی کا پتہ دیتی ہیں۔ نیلی رقص بھی بہت اچھا کر لیتی ہے اور اداکاری کے جواہرات بھی خوب دکھاتی ہے۔ سنا ہے وہ کود پسند بھی ہے جسے اتنے لوگ پسند کریں پھر وہ خود کیوں نہ اپنے آپ کو پسند کرے حیدر آباد سندھ سے آنے والی یہ لڑکی اب لاہور کی لاڈلی ہے۔ ایک خوبصورت چہرے نیند سے بھری آنکھیں اور خاصا متناسب جسم رکھنے والی نیلی جب گفتگو کرتی ہے تو وہ کسی سہانی علاقے کی شہزادی لگتی ہے۔ اسے لباس پہننے کا سلیقہ ہے۔ وہ میک اپ کرنے کا قرینہ بھی رکھتی ہے۔ اسے نخرے سے بات کرنے کا طریقہ بھی آتا ہے۔ وہ اپنے ملنے والوں کو مسحور

KitaabPoint.blogspot.com

کرتی ہے مجبور کرتی ہے اور مغرور بھی کرتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بدلتی رہتی ہے۔ سنور نے اور نکھرنے کا معاملہ ایک تنوع کا مطالبہ کرتا ہے۔ نیلی نے یہ مطالبہ مان لیا ہے۔ افواہیں بہت زیادہ مقبول اور محبوب شخصیت کے بارے میں اڑائی جاتی ہیں جس طرح بسنت کے دنوں میں رنگ برنگی پتنگیں اڑائی جاتی ہیں۔ لطیفے بھی چلائے جاتے ہیں۔ جیسے شب برات پر پٹاخے چلائے جاتے ہیں۔ پتنگیں تو بہت رنگوں کی ہیں نجانے کون کسے اڑا رہا ہے البتہ ایک لطیفہ سن لیں۔

ایک آدمی کے بٹوے سے نیلی کی تصویر گر گئی۔ بیٹے نے پوچھا یہ کس کی تصویر ہے۔ ابو نے گھبرا کے کہا کہ بیٹے تمہاری امی کی ہے اور کس کی ہے۔ بیٹا جھٹ بولا۔ ''مگر ابو یہ تو نیلی کی تصویر ہے۔'' اس آدمی نے لجاجت سے جواب دیا کہ جب میں نے تصویر بٹوے میں رکھی تھی تو تمہاری امی کی تھی، پڑے پڑے نیلی ہو گئی ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

''فحش نگار'' منٹو شرمیلا تھا

یہ حقیقت ہے کہ سعادت حسن منٹو اردو کا مقبول ترین افسانہ نگار ہے۔ ادب کے کئی دور آئے اور گزر گئے۔ پڑھنے والوں کے رجحانات بدل گئے۔ نقادوں کی ترجیحات بدل گئیں مگر منٹو کے سلسلے میں ایک ہی رائے رہی اس کو پسند کرنے والوں میں کمی آئی نہ تبدیلی آئی۔ یہ بات ایشین کلچرل سنٹر آف یونیسکو کے رسالے ایشین بک ڈویلپمنٹ کے تازہ شمارہ میں ''منٹو نامہ'' اور ''منٹو راما'' پر تبصرہ کے حوالے سے بھی لکھی گئی ہے۔ تبصرے میں کہا گیا ہے کہ اپنی سوسائٹی کے نچلے درجے کے لوگوں کے مسائل کو منٹو نے اپنا موضوع بنایا اور اپنا ایک اسلوب تخلیق کیا اس کی کئی کہانیاں نئے کلاسیکی مرتبے کی حامل بن گئی ہیں۔ سنگ میل والوں نے منٹو کی تمام کہانیاں جمع کر کے دو ضخیم جلدوں میں شائع کی ہیں۔

''منٹو نامہ'' میں سات کتابیں شامل ہیں۔

پھندنے' یزید' چغد' ٹھنڈا گوشت' سرکنڈوں کے پیچھے' لذت سنگ' بغیر اجازت۔

''منٹو راما'' میں بھی سات کتابیں شامل ہیں۔

خالی بوتلیں خالی ڈبے' سڑک کے کنارے' اوپر نیچے اور درمیان' برقعے' رتی ماشہ تولہ' آتش پارے' منٹو کے افسانے' ان کتابوں میں تقریباً 177 افسانے شامل ہیں۔

منٹوڈے کے حوالے سے حلقہ ارباب ذوق لاہور کا خصوصی اجلاس ٹی ہاؤس کے بجائے پاکستان فورم میں ہوا۔ حلقہ ادیبوں کی ایک نمائندہ تنظیم ہے۔ برس ہا برس سے اس کے ہفتہ وار اجلاس باقاعدگی سے ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ حلقے کے فروغ کے لیے منٹو صاحب کی دلچسپیاں اور خدمات قابل تحسین ہیں۔ چنانچہ ہر برس منٹوڈے کے نام سے ایک خصوصی اجلاس ہوتا ہے۔ اب کے یہ اجلاس ایک یادگار شکل اختیار کر گیا۔ 1955ء میں منٹو کی وفات کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح کا اجلاس ایک اخبار کے دفتر میں منعقد ہوا اور منٹو کے تمام اہل خانہ اس میں شریک ہوئے۔ منٹو کی تینوں بیٹیاں نگہت پٹیل' نزہت ارشد اور نصرت جلال منٹو کے داماد منٹو کی ہمشیرہ منٹو کے نواسے اور نواسیاں منٹو کے دوست اور مداح اور کئی ادیبوں شاعروں نے شرکت کی۔ پاکستان فورم اس یادگار تقریب کے لیے حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری قائم نقوی کا شکر گزار ہے۔ صدارت انتظار حسین نے کی۔ سب سے پہلے انیس ناگی کی بنائی

KitaabPoint.blogspot.com

ہوئی فلم دکھائی گئی جس میں منٹو کے حالات ان کے ہم عصر دوست احمد ندیم قاسمی کا انٹرویو اور منٹو کے ایک افسانے گوپی ناتھ کی ڈرامائی تشکیل دکھائی گئی۔ گوپی ناتھ کا کردار انور سجاد نے کیا۔ حاضرین نے فلم میں بڑی دلچسپی لی۔ انیس ناگی نے اس سلسلے میں اپنی مشکلات کا ذکر کیا۔ اگر وسائل ہوں تو اس عظیم افسانہ نگار کی زندگی پر ایک مکمل اور بھرپور فلم بنائی جا سکتی ہے۔ یہ ایک کامیاب فلم ہوگی کیونکہ سادہ اور دلچسپ کہانیاں لکھنے والا منٹو ایک ایسی زندگی گزار کر گیا ہے جس میں لوگوں کے لیے بڑی دلچسپی اور تجسس ہے۔ اپنی کہانی بھی منٹو خود لکھتا تو یہ ایک شاہکار کہانی ہوتی۔ وہ تقریباً ہر روز ایک کہانی لکھتا۔ فرمائش پر لکھی گئی اس کی بیشتر کہانیاں ضائع ہوگئی ہیں اور کئی ادھر ادھر رسالوں میں بکھری پڑی ہیں۔ وہ رسالوں کے ایڈیٹروں سے چند روپے لے کر انہی کے کمرے میں بیٹھ کر کہانی لکھ دیتا تھا۔ وہ انتہائی خوددار بلکہ انا پرست آدمی تھا اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے بھی لوگ ڈرتے تھے۔ وہ ایک دردمند انسان تھا مگر معاشی مجبوریوں نے اسے ساری عمر خواری کے سوا کچھ نہ دیا۔ کہانی لکھنے کی ایسی حیرت انگیز صلاحیت کسی آدمی میں کم کم ہی دیکھی گئی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اپنے پاس موجود شخص سے کہا کہ تم ایک فقرہ بولو اس نے کوئی فقرہ کہہ دیا اور منٹو صاحب نے کہانی لکھ دی۔ وہ اکثر لوگوں سے اپنے بارے میں بھی رائے لیتا تھا۔ کہتا کہ تم مجھے جانتے ہو تو پھر میرے بارے میں دو سطریں لکھ دو۔ اپنے زمانے کے مقبول شاعر جگر مرادآبادی نے ہچکچاہٹ ظاہر کی تو ان سے کہا۔

تم مرادآباد کے جگر ہو تو میں امرتسر کا گردہ ہوں؟ ہمارے خیال میں وہ اردو ادب کا دل بھی اور دماغ بھی تھا۔

اس نے انگریزی اور فرانسیسی ادب کا مطالعہ بھی کیا مگر اس کے پاس کتابیں کسی نے نہ دیکھیں۔ گھر میں بھی کتابیں نہ تھیں۔ ایک اور روایت کے مطابق اس کے پاس صرف دو کتابیں ڈکشنری اور دیوان غالب تھا۔ وہ دیوان غالب پڑھتا شعروں کا مطلب اپنے انداز میں سمجھتا اور پھر لوگوں سے امتحانی سوال کی طرح مطلب پوچھتا۔ اس نے اڑتے ہوئے پرندے کی طرح زندگی بسر کی۔ منٹو کی بیوی صفیہ منٹو کو ان کی بڑی فکر رہتی تھی۔ منٹو گھر سے نکلتا تو وہ ان کے ساتھ ساتھ رہتیں۔ ٹی ہاؤس میں بھی انہیں منٹو کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا گیا۔ ان دنوں منٹو نے شراب چھوڑ رکھی تھی۔ ایک دن تنہا گھر سے نکل آئے اور شاد امرتسری نے انہیں پلا دی۔ ایک مشہور شاعر کی روایت کے مطابق منٹو کو مجید امجد کے ساتھ مل کر بھی شراب پیتے دیکھا گیا۔ مجید امجد کو رات کے وقت کم نظر آتا تھا۔ شراب پی کر تو وہ سہارے کے بغیر چل بھی نہ سکتے تھے۔ بعد میں مجید امجد لاہور سے ساہیوال (منٹگمری) چلے گئے۔ کہتے ہیں آغا خلش کاشمیری کے کہنے پر منٹو نے شراب چھوڑی تھی۔ خلش صاحب منٹو سے محبت کرتے تھے۔ عجیب و غریب آدمی تھے۔ وہ چھلکوں سمیت کیلے اور خربوزے کھاتے تھے۔ انہیں کسی نے کہا کہ منٹو صاحب کو پاگل خانے لے جایا جائے تو ان کی شراب چھوٹ سکتی ہے۔ چنانچہ وہ منٹو کو

KitaabPoint.blogspot.com

پاگل خانے لے گیا اور واقعی ایک مدت تک منٹو نے شراب نہ پی۔ نہ جانے پاگل خانے اور شراب خانے کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

منٹو کی ہمشیرہ بیگم اقبال کے بقول منٹو کا ایک ڈاکٹر دوست پاگل خانے میں ملازم تھا۔ اس کے کہنے پر وہ وہاں گئے تھے تاکہ کچھ دنوں کے لیے کوئی ان سے ملنے نہ پائے اور وہ شراب نہ پی سکیں..... منٹو وہاں کچھ دن رہے۔ پاگل خانے میں انہوں نے اصلاح احوال کے لیے کام شروع کر دیا بعد میں پاگل خانے کے ماحول میں کچھ کہانیاں لکھ بھی لیں۔

شراب ہی کے لیے منٹو کو پیسوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ وہ ایڈیٹروں اور پبلشروں کی جیبوں سے پیسے نکلوا لیتا تھا وہ تو اپنے گھر میں بھی پیسے تلاش کر لیتا۔ محترمہ صفیہ منٹو اس کے ڈر سے کپڑوں کی تہ میں نجانے کہاں کہاں چھپا کر پیسے رکھتی تھی مگر منٹو کو خبر ہو جاتی تھی۔ کتابوں کے پبلشروں نے منٹو اور ان کے اہل خانہ سے بڑی زیادتیاں کی ہیں۔

پاکستان فورم کے اجلاس میں جب منٹو کی صاحب زادیوں سے اس ضمن میں سوال کیا گیا تو سب سے چھوٹی بیٹی نصرت جلال نے کہا کہ آج تک کسی پبلشر نے انہیں ایک پیسہ نہیں دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے مکتبہ شعر و ادب کے نواز چودھری کا خاص طور پر ذکر کیا۔ چودھری صاحب نے 1970ء میں محترمہ صفیہ منٹو کے ساتھ باقاعدہ تحریری معاہدہ کیا جس میں کہا گیا کہ ہر ماہ منٹو کی ایک کتاب شائع کی جائے گی اور بیس فیصد رائلٹی دی جائے گی۔ اس معاہدے پر معروف شاعر ناصر زیدی کے دستخط بھی موجود ہیں۔ لاکھوں روپے کی کتابیں بیچنے کے باوجود چودھری صاحب نے ایک پیسہ بھی بیگم منٹو کو نہیں دیا ایک دفعہ ہزار بارہ سو کا چیک دیا گیا جو ڈس آنر ہو گیا۔ نصرت جلال نے صرف ایک اشاعتی ادارے سنگ میل کی تعریف کی۔ نیاز احمد نے کتاب کی اشاعت ہوتے ہی رائلٹی کی ادائیگی کر دی یہ ایک حوصلہ افزاء اور قابل تحسین اقدام ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری کے بعد نثری ادب کے حوالے سے منٹو کی کہانیاں سب سے زیادہ بزنس دینے والی تحریریں ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ پبلشروں کے ظلم و ستم سے ادیبوں کو بچانے کے لیے موثر بندوبست کرے۔

منٹو صاحب کی بیٹی نصرت جلال نے ایک ملاقات میں بتایا کہ منٹو صاحب بڑے نفاست پسند اور صفائی پسند تھے اس بات کا ذکر احمد ندیم قاسمی نے بھی کیا ہے۔ منٹو صاحب ایسے کمرے میں نہ بیٹھ سکتے تھے جس میں سفیدی اکھڑی ہوئی ہو۔ انہیں کہیں کوئی داغ دھبہ اچھا نہ لگتا تھا۔ اس بات کو ڈاکٹر سہیل احمد خان نے یہ معنی پہنائے کہ معاشرے میں داغ دھبوں کی نشاندہی کے لیے منٹو نے افسانے لکھے۔ وہ اپنے اردگرد گندگی اور آلودگی پسند نہ کرتے۔ منٹو صاحب نے بڑی بے باکی سے معاشرے کے ناسوروں کی طرف اشارہ کیا۔ کم فہم لوگوں نے اسے فحش نگاری کا نام دیا۔ منٹو صاحب اپنی ذاتی زندگی میں بڑے شریف اور شرمیلے انسان تھے۔ ان کی

KitaabPoint.blogspot.com

زندگی میں کوئی سکینڈل نہیں تھا۔ وہ محفل میں عورتوں کے حوالے سے بہت احتیاط سے گفتگو کرتے تھے کبھی گندی بات ان کے منہ سے نہ نکلی گھر میں کوئی میلا کپڑا نظر آ جاتا تو ان کی طبیعت خراب ہو جاتی۔ منٹو کی پہلی اولاد ایک بیٹا تھا جس کا نام عارف تھا۔ وہ ایک سال کی عمر میں مر گیا۔ منٹو صاحب کا خیال تھا کہ وہ کوئی گندی چیز منہ میں ڈالنے سے مر گیا ہے ان کا افسانہ ''خالد میاں'' عارف کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔

ہمارا معاشرہ ایک لپیٹ میں ہے۔ ہم منٹو کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

''یہاں منٹو سو رہا ہے جو کبھی کبھی سوچتا تھا کہ میں بڑا افسانہ نگار ہوں یا خدا..... منٹو نے اپنے افسانوں میں خدا کے بندوں کے خاکے لکھے ہیں۔ اس نے کہیں کہیں خدا کا خاکہ لکھنے کی بھی کوشش کی ہے جو کچھ خدا کی بستی میں ہو رہا ہے اسے پوری دیانتداری اور فنکاری سے دکھانے کی کوشش کی۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

گورنمنٹ کالج ننگا ہو گیا

دیواریں کسی عمارت کا لباس ہوتی ہیں۔ کوئی بھی خوبصورت نظر آنے کے لیے اپنے کپڑے نہیں پھاڑتا۔ لاہور کو خوبصورت بنانے والوں نے گورنمنٹ کالج کی دیوار بھی گرادی اور لوہے کا جنگلہ لگا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے کشادگی پیدا ہوئی ہے' ماحول میں جمال بکھرا ہے۔ یہی بات گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر خالد آفتاب سے ایک اعلیٰ سرکاری شخصیت نے کی تو انہوں نے کہا کہ باہر والوں کو ایسا محسوس ہوتا ہوگا مگر ہم جب کالج کے اندر سے دیکھتے ہیں تو جمال کے ساتھ ملال کی کیفیت بھی محسوس ہوتی ہے۔ جب بڑے دروازے کے ساتھ ٹریفک کی آسانی بڑھانے کے لیے دیوار کا ایک ٹکڑا گرایا گیا تو ڈاکٹر خالد آفتاب پریشان ہو گئے تھے اور متعلقہ لوگوں سے بات بھی کی تھی اب جبکہ ساری دیوار گرادی گئی ہے۔ وہ صرف حیران ہوئے ہیں۔ وہ جو اس ادارے کی گمشدہ عظمتوں کی آرزو کی جستجو بنا رہے ہیں۔ اپنے دفتر سے باہر نکل کے دیکھتے ہیں تو لگتا ہے جیسے خلاؤں میں کھو گئے ہیں۔

کچھ معمر عورتیں ادھر سے گزریں تو کالج کے خوبصورت باغ کو پارک سمجھ کے آ گئیں اور گئیں تو مالٹوں کے چھلکے بھی اپنی یادگار کے طور پر چھوڑ کر چلی گئیں۔ ابھی لوگوں کو پتہ نہیں کہ کالج کے دوسرے طرف بھی ایک دروازہ ہے تو وہ ادھر سیر و تفریح بھی کریں گے اور آرام سے بھاٹی کی طرف نکل جائیں گے۔ ہماری قوم کو شارٹ کٹ کا ویسے بھی بڑا شوق ہے۔ کچھ لوگ پیدل حج کرنے جا رہے تھے کہ ریگل چوک پر انہیں ممتاز شاعر ظہیر کاشمیری نے کہا کہ بیڈن روڈ کی طرف سے جائیں' شارٹ کٹ ہے۔ حاجی صاحبان چپ کر کے بیڈن روڈ کی طرف مڑ گئے۔

جن گھروں کی دیواریں گرتی ہیں پھر وہاں راستے خود بخود بن جاتے ہیں۔

دیوار کیا گری مرے "سوہنے" مکان کی
لوگوں نے میرے صحن سے رستے بنا لیے

چادر اور چار دیواری کا اصول تعلیمی اداروں پر کیوں لاگو نہیں ہوتا۔ کل کلاں لڑکیوں کے کالجوں اور سکولوں کی باری بھی آ سکتی ہے۔ کینیرڈ کالج بہت خوبصورت ہے۔ ساتھ میں ریس کورس پارک بھی ہے۔ لڑکیاں تو گورنمنٹ کالج میں بھی پڑھتی ہیں۔ میں لڑکیوں کو پردوں اور دیواروں میں چھپا کر رکھنے کے حق میں نہیں مگر کچھ جگہوں کی اپنی پرائیویسی ہوتی ہے اور اسے ہر حال میں قائم رکھنا

KitaabPoint.blogspot.com

چاہیے۔ گلبرگ' کینٹ اور جی او آر میں کئی بڑے بڑے نایاب بنگلے ایسے ہیں کہ جن کے سامنے والی دیوار گرادی جائے تو سارا ماحول خوبصورت ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں انتظامیہ کے ارادے کیا ہیں۔ گورنر ہاؤس بھی تو خوبصورت ہے۔ کم از کم باہر سے ہی دیکھنے کے لیے لوگوں کو موقعہ دیں۔

اب گورنمنٹ کالج میں دھول دوئیں کا گزر براہ راست ہوگا اور شور وغل بھی بہت بے تکلفی سے مخل ہوگا۔ ہسپتالوں اور تعلیمی اداروں کو حتی الامکان شور وغل سے بچانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ مجھے اس ضمن میں گورنمنٹ کالج کے پہلے مسلمان پرنسپل پطرس بخاری کا ایک مضمون یاد آ رہا ہے۔ پروفیسر کے لیکچر میں جب باہر کی آوازیں شامل ہوتی ہیں تو عجیب مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ اب تو پورا کالج مضحکہ خیز صورت حال سے دوچار ہو گیا ہے۔

میں ایک غمگین کیفیت میں گورنمنٹ کالج میں گھومتا رہا۔ سب سے پہلے کالج کے پرنسپل سے بات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ بورڈ آف گورنرز کی طرف سے ایک کمیٹی بنی۔ کمیٹی کے ممبران نے بہت کوشش کی مگر کچھ پیش نہ چلی۔ چیف سیکرٹری سے دو مرتبہ بات ہوئی۔ کالج کونسل نے اس ضمن میں اپنی پریشانی متعلقہ لوگوں تک پہنچائی میں نے پرنسپل کی توجہ اس طرف دلائی کی طلبہ وطالبات بہت غصے میں ہیں۔ شاید وہ احتجاج کریں تو پرنسپل نے کہا کہ یہ ایک بے سود کارروائی ہوگی۔ میں تو کہتا ہوں کہ حکومت اتنی مہربانی تو کرے کی ناصر باغ اور کالج کے درمیان والی سڑک پر ٹریفک ہی بند کر دے وہ کہتے ہیں کہ غور کریں گے۔ ہمارے بینک سے لے کر سائیکالوجی کے شعبے تک دیوار صرف دو فٹ بھی اونچی نہیں۔ اس پر بھی جنگلہ لگا دیں۔ مگر ابھی یہ بات نہیں مانی جا رہی۔ میں تو کہتا ہوں کہ مال روڈ تک سب کچھ ہمیں دے دیں۔ ادھر سے لاء کالج اور ینٹل کالج ہمیں دے دیں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

لتا کے لیے پاکستانی ایوارڈ

ہم لتا جی کو ان کی 63 ویں سالگرہ پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ہم پر لتا کا شکریہ واجب ہے۔ اس کا شکریہ تو خود بخود ادا ہوتا رہتا ہے۔ جب کوئی اس کا گایا ہوا گیت سنتا ہے اور اس کے دل میں سرشاری کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو یہ شکریہ ہی ہوتا ہے منہ سے الفاظ کہنا ضروری تو نہیں ہوتا۔ جب کوئی خاتون مسکرا کر دیکھ لے تو یہ لاکھ شکریئے سے زیادہ پذیرائی ہے۔

بھارت کے سیاست دانوں سے ہمیں شکوہ ہی رہا مگر جب کوئی لیڈر پاکستان کے لیے اور مسلمانوں کے لیے کلمہ خیر کہہ دے' کلمہ حق ہی کہہ دے تو ہم خوش ہو جاتے ہیں۔ مرار جی ڈیسائی کو ہمیشہ پاکستان میں پسند کیا گیا۔ صدر ضیاء الحق بھارت قیادت کے مکرو فریب کو خوب سمجھتا تھا۔ اس نے مرار جی ڈیسائی کو پاکستان کا ایک اعلیٰ ایوارڈ دینے کا اعلان کر دیا تو بھارت کے سرکاری حلقوں میں کہرام مچ گیا۔ حیرانی ہوئی بلکہ پریشانی ہوئی کہ جب وہ ہمارے خان غفار کو ایوارڈ دیں تو ہم مائنڈ نہ کریں۔ ہمیں مزید پریشانی ہوئی جب بینظیر حکومت نے وہ ایوارڈ واپس لے لیا' یہ پوری قوم کی توہین تھی۔ بینظیر کو نہرو فیملی پسند ہے مگر کسی کو خوش کرنے کا یہ غیر سیاسی طریقہ ہے۔ کچھ پاکستانی دانشوروں کے ایوارڈ بھی ضبط کر لیے گئے۔ نجانے ایسے کام بینظیر سے کیوں کروائے گئے۔ ڈیسائی صاحب کو علم ہے کہ پاکستانی ان کی عزت کرتے ہیں۔

میں لتا اور دلیپ کمار کے لیے پاکستانی ایوارڈ دینے کی تجویز پیش کرتا ہوں ورنہ محبت سے بڑھ کر کوئی ایوارڈ نہیں۔ بھارت میں بہت سی ایسی شخصیات ہیں جن سے پاکستانی محبت کرتے ہیں ان میں سے ایک لتا ہے۔ پاکستان کے بہت ہی کم لوگوں کی ملاقات لتا سے ہوئی ہوگی۔ یہ جو محبت ہے وہ ایسے رستے بھی تلاش کر لیتی ہے جن پر ابھی ایک آدمی بھی نہیں چلا ہوتا۔ لتا جی تک پہنچنے کے لیے تو رستے بھی معلوم ہیں ایسے ہیں جب نامعلوم رستوں پر چلنے کو جی چاہے تو سفر بہت دل آویز ہو جاتا ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ لتا نے 1947ء میں گانا شروع کیا اور اردو میں گانا شروع کیا۔ اس بات کی وضاحت سے مزا جاتا رہے گا۔ اردو کی ترقی کو ایک سیاسی رنگ دے کر کچھ ادیبوں شاعروں نے بھارت میں خوب ترقی کی اور مال بنایا۔ اس حوالے سے انہوں نے کچھ پاکستانی لکھنے والوں کو بھی ساتھ ملا لیا۔ چنانچہ سرکاری سطح پر جو حال اردو کا بھارت میں ہے' اس سے ذرا بہتر پاکستان میں ہوگا۔ ''انجمن ترقی اردو'' بھارت کی سرگرمیاں ''انجمن ترقی اردو'' پاکستان سے اتنی مختلف نہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

بھارت میں اردو کی مقبولیت کے لیے جو کام دلیپ کمار اور لتا نے کر دکھایا' کسی سے نہ ہو سکا۔ بھارتی حکومتیں اس راز سے واقف رہیں مگر کر کچھ نہ سکیں۔ البتہ یہ کیا کہ اردو فیچر فلم کو ہندی فیچر فلم کہنا شروع کر دیا' پھر بھی وہ کامیاب نہ ہوئے۔ پاکستانیوں نے زیادہ دلچسپی سے یہ فلمیں دیکھنا شروع کر دیں۔ لتا کے گانے سننے کا ذوق شوق بڑھتا ہی گیا' جب دلیپ کمار پاکستان آیا تو لوگوں نے اس کا والہانہ استقبال کیا' یہاں بھارتی سفارت خانے کو مصیبت پڑ گئی۔ صدر ضیاء الحق نے بھی اپنی روایتی طبعی اخلاقی سے حسب معمول حیران کیا بلکہ پریشان کیا۔ ہم اپنے حکمرانوں سے خوش اخلاقی اور خوش عملی کی توقع ہی چھوڑ بیٹھے ہیں۔ مخالفوں نے بھی یہ کہا کہ صدر ضیاء نے الیکشن تو نہیں لڑنا تھا کہ کسی دوسرے کے لیے اتنی محبت دیکھ کر فکر مند ہوتا۔ اب پاکستانی منتظر ہیں کہ لتا جی یہاں آئے۔

مجھے بھارت کی چار پانچ عورتیں بہت پسند رہی ہیں' امرتا پریتم' مانیکا گاندھی' پھولن دیوی اور لتا منگیشکر..... لتا جی تو ہماری تنہائیوں اور اداسیوں کی راز دار ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ لتا بھی بھارت والوں کے پاس نہ ہوتی تو یہ ملک بدقسمت ہوتا۔ لتا کے گانے سنے جاتے ہیں جب ہم سننا نہیں جانتے تھے۔ لتا گاتی ہے تو دیوی لگتی ہے۔ شاید کبھی اپنے بت کدوں کو مورتیوں سے سجانے والے ہندو لتا کا بت بھی بنا لیں' پیار کرنے اور پوجا کرنے میں شاید کوئی خاص فرق نہیں۔ لتا کو سنتے ہوئے مزید یقین آ گیا کہ اچھی آوازوں کو سننا عبادت ہے۔ وہ گاتی ہے تو دھرتی دھوپ دھرم اور دھیان ایک کیفیت میں آ جمع ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ کہیں یہ بحث چھڑ گئی کہ لتا جنت میں جائے گی۔ اس دن کثرت رائے کی بات آخری ہوتی تو لتا جنت میں جا چکی تھی مگر کچھ لوگ لتا کو پسند کرنے کے باوجود اس فیصلے پر سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایک دانا آدمی نے بات سمیٹ دی اس نے کہا کہ لتا سورگ میں جائے گی' ہندی میں جنت کو سورگ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ سب لوگ متفق ہو گئے۔

لتا نے اس جہان کے جہنم زار میں جنت کی نشانیاں تخلیق کی ہیں۔ اسے سنتے ہوئے لوگ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی خیالی جنت میں پہنچ جاتے ہیں۔ لتا بڑی آسودگی اور سہولت سے گاتی ہے۔ ہمارے کچھ گلوکار گاتے ہوئے اتنی مشکل میں ہوتے ہیں کہ سننے والے کو بھی پیٹ میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ لتا بڑی فنکارہ ہے' بڑے دل کی عورت ہے' لتا نے ہمارے لیے کئی گلوکاروں کی تعریف کی ہے۔ اسے ہمارے ایک گلوکار کے گلے میں اپنا بھگوان بولتا ہوا نظر آیا۔ ہمارا کوئی فنکار ایسی بات کہہ دے تو لوگ طوفان کھڑا کر دیں۔ اخبارات مخالفانہ مہم چلا دیں۔

لتا نے نور جہاں کی بڑی تعریف کی' نور جہاں پاکستان کی ایک بڑی متاع ہے۔ نور جہاں کی آواز میں بدن کے رنگ بھی نکھرتے چلے جاتے ہیں بہت خوبصورت ہونا ایک انعام ہے مگر گلوکارہ کے لیے ڈس کریڈٹ بھی ہے۔ نور جہاں ابھی تک منٹو کے لکھے ہوئے

KitaabPoint.blogspot.com

خاکے کا جواب دیتی پھرتی ہے۔نور جہاں کو ایک سے زیادہ شادیاں کرنا پڑیں۔لتا ابھی تک غیر شادی شدہ ہے اس کا کوئی سکینڈل بھی سامنے نہیں آیا۔اس کے لیے نظم تو لکھی جا سکتی ہے خاکہ نہیں لکھا جا سکتا۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

پولیس نوں آکھاں رشوت خور

ممتاز مزاح گو شاعر بابا عبیر ابوذری نے ایک محفل مشاعرہ میں اپنی یہ مشہور نظم پڑھی جبکہ اس علاقے کے ڈی آئی جی پولیس پہلی قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

پولیس نوں آکھاں رشوت خور تے فیدہ کیہ
پچھوں کردا پھراں نکور تے فیدہ کیہ
جھاڑو نال بناون مور تے فیدہ کیہ
بوتھی ہو جائے ہور دی ہور تے فیدہ کیہ
بساں لٹیاں جاندیاں نیں تے صبر شکر
سنگیاں گھٹیاں جاندیاں نیں تے صبر شکر
گتاں پٹیاں جاندیاں نیں تے صبر شکر
عزتاں لٹیاں جاندیاں نیں تے صبر شکر
جے میں آکھ دیاں کچھ ہور تے فیدہ کیہ
پولیس نوں آکھاں رشوت خور تے فیدہ کیہ

باباجی کو بہت داد ملی ڈی آئی جی صاحب بھی سر ہلاتے رہے۔ یہ افسروں کے داد دینے کا انداز ہے۔ سر ہلانے کا مطلب تصدیق کرنا بھی ہوتا ہے۔ ہماری بہو بیٹیاں بھی شادی کی رضامندی اسی طرح دیتی ہیں۔ پہلے زمانے میں وہ شرماتی رہتی تھیں اور یہی تصدیق سمجھی جاتی تھی اب شرمانے کے زمانے گئے۔ پہلے کوئی رشوت لیتا بھی تھا مگر اس الزام کو گالی سمجھتا تھا۔ اب تو رشتے کا سب سے بڑا استحقاق یہ ہے کہ لڑکا پولیس میں ہے، کسٹم میں ہے یا اسی طرح کے کسی محکمے میں۔

کچھ نوجوانوں سے پوچھا گیا کہ بڑے ہو کر کیا بنو گے تو زیادہ تر نے یہی کہا کہ پولیس افسر بنوں گا اور مظلوم لوگوں کی خدمت کروں گا۔ ایک نے کہا میں مجرم بنوں گا اور پولیس والوں کی خدمت کروں گا۔ اسے سچی بات کے لیے انعام دیا گیا۔ کون ہے جو

KitaabPoint.blogspot.com

پولیس والوں کی خدمت نہیں کرتا؟ ہمارے ایک فقیر گورنر پنجاب مخدوم سجاد حسین قریشی گورنر ہاؤس سے اپنے علاقے کی پولیس کی خدمت کے لیے تحفے بھیجا کرتے تھے۔ وہ اس طرح کی خدمت دوسرے افسران اور پٹواریوں کی بھی کرتے تھے۔

پولیس والوں نے مجھے تنگ نہیں کیا۔ بات اتنی ہے کہ پچھلے دنوں کچھ ممبران صوبائی اسمبلی نے اجلاس کے دوران وزیر اعلیٰ پنجاب سے احتجاجاً شکایت کی کہ پولیس افسران ان کی سفارشوں پر غور ہی نہیں کرتے اور ہمارے جائز کام نہیں ہوتے۔ مجھے اس واقعے پر ہنسی آئی کہ ممبران جائز کاموں کے لیے پریشان ہیں۔ وہ کیسے لوگ ہیں جو ان سے جائز کام کے لیے کہتے ہیں؟ افسران کام کے ناجائز ہونے کا ذکر کریں تو کہا جاتا ہے کہ جناب کام جائز ہوتا تو پھر آپ کی مہربانی کی کیا ضرورت تھی؟

مخصوص لوگ اب اس آدمی کو ووٹ ہی نہیں دیتے جس کے بارے میں انہیں شک ہوتا ہے کہ وہ تھانہ کچہری میں ہمارے کام نہیں کرائے گا۔ وہ لوگ جو ممبران کے عزیز ہیں' ان کا کام تو کسی نہ کسی طرح ہو جاتا ہے' ان لوگوں کا کسی نے سوچا ہے جو بے یارو مددگار دفتروں کے چکر لگاتے لگاتے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں؟

کسی افسر یا پولیس افسر کے پاس روٹین کے جائز کام کے لیے بھی چلے جائیں تو وہ کہتا ہے کہ کسی ممبر یا وزیر کی سفارش لے آئیں۔ یہ بیماری متعدی ہو چکی ہے میں ایک کالج کے پرنسپل کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ سفارش کے بغیر چھٹی کی درخواست پر دستخط نہیں کرتا تھا۔ وہ پوچھتا تمہارا کوئی ممبر اسمبلی واقف ہے۔

جواب ملتا نہیں۔

کوئی بڑا افسر

نہیں جی۔

کوئی سینئر پروفیسر

نہیں جی۔

کوئی آدمی۔

نہیں جی۔

اچھا تو یوں کرو میرے چپڑاسی سے کہو تمہاری سفارش کر دے۔

چپڑاسی سے کہا جاتا وہ بھی آسانی سے نہیں مانتا تھا۔ کچھ مدت کے بعد اس چپڑاسی نے پانچ مرلے کا پلاٹ خرید لیا۔

KitaabPoint.blogspot.com

پولیس افسر کا چپڑاسی تو چھوٹے موٹے افسر سے کم نہیں ہوتا۔ وہ کبھی کسی پروفیسر شاعر اور شلوار والے آدمی کو صاحب سے ملنے ہی نہیں دیتا۔ غریب آدمی پر ظلم ہو تو تھانے والے پرچہ ہی درج نہیں کرتے۔ واقف حال لوگ تو پرچہ درج ہی نہیں کراتے۔

پولیس کے ظلم و ستم کی داستانیں آئے دن اخباروں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس لحاظ سے ہماری پولیس دنیا میں مشہور ہو چکی ہے۔ جب عوام کا اعتماد قانون نافذ کرنے والے اداروں پر سے اٹھ جائے تو پھر اسے تباہی سے کون بچا سکتا ہے؟ پولیس نے کئی مظلوم لوگوں کو ظالم بنا دیا۔ کئی شرفا کو چور ڈاکو بنا دیا۔ سندھ کی صورت حال تو بے حد تشویش ناک ہو گئی ہے۔ یہاں بے روزگار نوجوان پولیس میں بھرتی ہونے کو ترجیح دیتے ہیں ورنہ ڈاکو بن جاتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ ایک ہی بات ہے۔

ہماری پولیس کی عظیم الشان کارکردگی کی ایک مثال یہ ہے کہ ان کے پاس ایک رات گزارنے والے نوجوان نے تسلیم کر لیا کہ سومنات کا بت اس نے توڑا ہے۔ قصہ یہ تھا کہ ایک انسپکٹر سکولز نے کلاس میں بچوں سے پوچھ لیا کہ سومنات کا مندر کس نے توڑا تھا۔ غلطی تو انسپکٹر صاحب کی تھی اسے جس سوال کا جواب خود نہ آتا تھا۔ بچوں سے پوچھنے کی کیا تک تھی۔ جب نوجوان نے کہا کہ اسے نہیں معلوم تو انسپکٹر صاحب ناراض ہو گئے۔ بے چارے کلاس ٹیچر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے کہا کہ میں اس نوجوان کو جانتا ہوں۔ بہت شیطان ہے۔ اس نے سومنات کا بت توڑا ہو گا۔ بات ہیڈ ماسٹر تک پہنچی اور پھر اس نوجوان کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ انہوں نے راتوں رات نوجوان سے منوالیا کہ سومنات کا بت اس نے توڑا ہے۔

پولیس کے محکمے میں شریف اور لائق آدمی کا گزر ممکن نہیں، گزارا بھی ممکن نہیں۔

بہت تکلیف دہ سوال ہے کہ ہماری پولیس اتنی بدنام کیوں ہے اور اتنی ناکام کیوں ہے؟ میرے ایک بزرگ ہر نماز کے بعد دعا مانگتے تھے کہ اے خدا نہ ظالم بنا نہ ظالموں کے حوالے کر۔ میں نے پوچھا کہ ظالم کون ہے تو بڑے میاں نے جواب دیا پولیس والے اور ان سے تعلق رکھنے والے۔

پولیس میں اچھے آدمی بھی ہوں گے مگر یہ اچھائی کبھی موثر نہیں ہوئی۔ شریعت بل کے ضمن میں لوگ معترض نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر شرعی قوانین ہماری اس پولیس نے نافذ کرنا ہیں تو پھر یہ ممکن نہیں ہے۔ حکومت اس سلسلے میں مخلص ہے تو پھر پولیس کا نظام پوری طرح تبدیل کرنا ہو گا۔ نظام تو سارے کا سارا تبدیل کرنا ہو گا۔ ہمارے اکثر دفاتر کا ماحول تھانے سے مختلف نہیں ہے۔ ہر جگہ عام شریف آدمی کی توہین ہو رہی ہے۔

بابا عبیر ابوذری کی نظم کے دو مصرعے اور سنیں:

KitaabPoint.blogspot.com

کلی پولیس دے وچ ای ایہہ کمزوری نئیں
کیہڑا شعبہ اے جتھے رشوت خوری نئیں

آخر میں بغیر تبصرے کے باباجی کا ایک اور شعر سنیں۔

یہاں صرف تھانے ہی بکتے نہیں ہیں
یہاں پر کئی ایسے تھاں اور بھی ہیں

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

سیاست کا محکمہ موسمیات

ٹی وی سے موسم کا حال سنتے سنتے پیشین گوئیوں پر سے ہمارا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ سٹوڈیو کے باہر لوگ گرمی میں پسینے سے شرابور ہو رہے ہوتے ہیں مگر خاتون کہہ رہی ہوتی ہے کہ محکمہ موسمیات کی پیشین گوئی کے مطابق آج گرج چمک کے ساتھ چھینٹے پڑنے کا امکان ہے۔ فٹ پاتھوں پر ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتانے والے نجومیوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ سیاسی نجومیوں کی تعداد میں اضافہ نہیں ہو رہا کیونکہ یہ کام پیر پگاڑا نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ ہمارے لوگ بھی عجب سادی ہیں جو کچھ ہو رہا ہے اس میں دلچسپی نہیں لیتے۔ جو ہونے والا ہے اس کے بارے میں فکر مند رہتے ہیں۔ ان کی فکر مندی صرف آنے والے دنوں کے بارے میں معلومات کی حد تک ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمارا حال یہ ہے۔

وہ ہو رہا ہے جو نہیں ہونے والا ہے

جو ہونا چاہیے وہ نہیں ہوتا جو کچھ ہوتا ہے بے چارے عوام سے اس ضمن میں کوئی مشورہ نہیں ہوتا۔ اکبر الہ آبادی کا یہ مصرع اب بھی کچھ بامعنی ہے:

پیدا ہوئے بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

یہ شاید پہلے وقتوں کی بات ہے ورنہ اب کچھ کو کالجوں میں داخلہ نہیں ملتا۔ وہ بی اے کر بھی لیں تو نوکری نہیں ملتی۔ نوکری مل جائے تو پنشن اتنی کم اور مشکل سے ملتی ہے کہ جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وقت سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو پیشین گوئیوں سے ڈرا ڈرا کے ادھ موا کیا جاتا ہے۔ کوئی اچھی خبر اور اچھی پیشین گوئی سننے کو ملتی ہی نہیں۔ اوپر سے ہم ایسی باتوں پر جلد ایمان لاتے ہیں جو کچھ پیر صاحب نے کہہ دیا' وہ پتھر کی لکیر ہے۔ ہم تو ہاتھ کی لکیر کو بھی پتھر کی لکھیر سمجھتے ہیں۔

سنا ہے جو کچھ امریکی سی آئی اے نے کرنا ہوتا ہے اس کے بارے میں پیشین گوئی کروا دیتے ہیں اور پھر اسے پورا کرنے کے لیے کارروائی کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں برٹش سیکرٹ سروس کی ایجنٹ جین ڈکسن بہت مشہور ہوئی۔ بڑے بڑے بادشاہوں کے درباروں میں میراثیوں' جوکروں کے علاوہ نجومیوں کو بھی رکھا جاتا تھا۔ حکمران جو اپنے آپ کو بہت مضبوط اور طاقت ور سمجھتے ہیں' اندر سے بہت کمزور اور بزدل ہوتے ہیں۔ اندرا گاندھی' ذوالفقار علی بھٹو' صدر ایوب نہ صرف نجومیوں سے رابطہ رکھتے تھے بلکہ انہوں نے

KitaabPoint.blogspot.com

گرو اور پیر بھی رکھے ہوئے تھے۔

سنا ہے بینظیر بھٹو بھی کسی بنگالی بابے پر بہت اعتقاد رکھتی ہیں۔ ہمارے کئی حکمرانوں نے انتخابات کی تاریخ بھی زائچے بنوا کر مقرر کی ہم خود بھی اس سلسلے میں کچھ کم نہیں۔ جس کتاب میں کچھ ایسی بات ہو لاکھوں میں بکتی ہے جبکہ ہمارے ہاں کتابیں ہزار سے زیادہ نہیں شائع ہوتیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید بھلے دن آنے والے ہیں اور ہم وقت سے پہلے اسے خوش نصیبی سے صرف آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔ کرتے کچھ بھی نہیں۔

ایک شخص نے ماہر دست شناس کو ہاتھ دکھایا اس نے کہا کہ چالیس برس تک تمہارے حالات خراب رہیں گے۔ اس پر وہ پریشان حال شخص بہت خوش ہوا اور پوچھا پھر کیا ہوگا؟

دست شناس نے کہا: پھر تم عادی ہو جاؤ گے۔

چنانچہ ہم پاکستانی عادی ہو گئے کیونکہ اب تک جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا اس سے زیادہ اور کیا ہوگا؟ ہمیں پیر صاحب ڈراتے رہتے ہیں کہ فیملی پلاننگ ہونے والی ہے۔ اگر یہ بات سرکاری طور پر ہونا ہے تو ہنسی آتی ہے کہ فیملی پلاننگ کے محکمے والوں نے جو کچھ کیا ہے، وہ مضحکہ خیز بھی ہے اور شرمناک بھی۔

پیر صاحب فیملی پلاننگ کی بجائے کوئی اور اصطلاح استعمال کریں۔ پیر صاحب کہتے ہیں خون کی ندیاں بہیں گی۔ اہل پاکستان نے یہ منظر بھی دیکھ لیے ہیں۔ ڈاکے، قتل، اغوا زوروں پر ہیں۔ چنانچہ مارشل لاء کا ڈراوا بھی ان کی طرف سے مسلسل آتا ہے۔ ویسے کبھی کبھی وہ کچھ ہو بھی جاتا ہے جو پیر صاحب کہتے ہیں۔

ایک گھر میں سب لوگ اکٹھے بیٹھے تھے۔ منظور بی بی عمر 18 سال نے کہا کہ کل ہم میں سے ایک آدمی یہاں نہیں ہوگا۔ کل وہ کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بزرگ نے کہا کہ اس نے غلطی کی مگر تھی وہ ولی، مستقبل کا حال بھی جانتی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ کل ہم میں سے ایک آدمی نہیں ہوگا، آپ دیکھ لیں آج ہم میں سے ایک آدمی نہیں ہے۔

جب کوئی سیاستدان ہار جاتا ہے تو وہ اپنی مخالف حکومت کا تختہ الٹانے کے لیے فوج کی طرف دیکھتا ہے۔ جناب اصغر خان جنرل ضیاء کے مخالفین میں شامل رہے مگر انہوں نے مارشل لاء لگانے کے لیے کھلے خطوط لکھے تھے۔ پیپلز پارٹی مارشل کی بدترین دشمن ہے مگر آج کل معراج خالد ملک قسم حتیٰ کہ بینظیر بھٹو بھی مارشل لاء کے حق میں نظر آتے ہیں۔ جمہوریت کے بابا جی نواب زادہ نصر اللہ خان بھی مارشل لاء کے استقبالیوں میں کھڑے ہیں۔ مارشل لاء اب اہل پاکستان کے لیے کوئی ڈراوا نہیں۔ انہوں نے یہ زمانے بہت

KitaabPoint.blogspot.com

دیکھے ہیں۔ اور یہ بھی دیکھا ہے کہ حکومت کیسی بھی ہو اس کے لیے امریکہ کی منظوری اور آشیر باد ضروری ہے اور اب تک تمام حکومتوں کے ارادے' اقدام' اعمال اور انجام ایک جیسا ہی رہا ہے۔

ہمارا مشورہ پیر صاحب کو یہ ہے کہ اب وہ مارشل لاء کے علاوہ کوئی اور بات کریں اس بات میں کوئی ''سسپنس'' نہیں رہا۔ وہ پیشین گوئیوں کے علاوہ حکمرانوں کو صحیح مشورہ بھی دیا کریں۔ مرحوم صوفی دانشور قدرت اللہ شہاب کی رایت کے مطابق جھنگ کا ایک گمنام درویش صدر ایوب کو خط لکھ کر مفت مورہ دیتا رہتا تھا۔ ایوب خان نے اس طرف کبھی کان نہ دھرا اس نے 65ء کی جنگ میں جنگ بندی قبول نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ پھر تاشقند اپنی بجائے کسی اور کو بھیجنے کا مشورہ دیا تھا مگر ایوب خان نے رد کر دیا اور تاریخ میں اس کا نام ایک ناکام اور بدنام لیڈر کے طور پر لکھا گیا۔

ہمارے حکمران صرف ان کے مشوروں پر عمل کرتے ہیں جو بالآخر انہیں زوال کی طرف لے جاتے ہیں۔ نجومیوں' دست شناسوں' خوشامدیوں اور خودغرض وزیروں اور افسروں کی بجائے اگر وہ اپنا رابطہ عوام کے ساتھ رکھیں اپنی نوازشیں مخصوص لوگوں کی بجائے عمومی فلاح کے لیے عام کریں تو اس کے نتائج ملک وقوم اور خود ان کے حق میں بہتر ہوں۔

حضرت علی ایک فوجی مہم پر جا رہے تھے تو ایک پیشہ ور نے زبردستی ان کا ہاتھ دیکھا اور کہا آپ کے ہاتھ پر فتح کی لکیر نہیں ہے۔ حضرت علی نے پوچھا کہاں ہونی چاہیے اور پھر اپنے خنجر سے وہاں لکیر بنا دی۔ مخلص اور مقتدر لوگ اپنی تقدیر کے خود مالک ہوتے ہیں۔ حکمران اپنے ساتھیوں کے پاس یرغمال ہوتے ہیں اور اپنی خواہشوں کے قیدی ہوتے ہیں۔ پیر صاحب کا ہم احترام کرتے ہیں ان کا بڑا اثر ورسوخ ہے۔ بالخصوص سندھ اور بالعموم پورے ملک میں وہ ایسی صورت حال کے معاون ثابت ہو سکتے ہیں جو سب کی بہتری کا باعث ہو۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

وائٹ از وائٹ

میں ان دنوں لندن میں تھا جب بی سی سی آئی کو بند کرنے کا حکم نامہ صادر ہوا۔ میں بینکنگ سے نابلد آدمی ہوں۔ میں سمجھتا شاید یہ بی سی سی کی کوئی ہمشیرہ ہوگی اور یہودیوں کے خلاف کوئی پروگرام نشر ہو گیا ہوگا۔ یہ بھی شبہ ہوا کہ یہ کوئی ایسٹرن سروس ہوگی۔ امریکیوں اور یہودیوں سمیت سارا مغرب تھرڈ ورلڈ کا دشمن نمبر ون ہے اور مسلم ورلڈ کا مسلمہ مخالف ہے۔ مغرب نے ہمیشہ مشرق کے لیے منافق کا کردار ادا کیا ہے۔ بات اتنی سی ہے کہ بی سی سی آئی وہ بینک ہے جس سے تھرڈ ورلڈ اور مسلم ورلڈ کو فائدے پہنچے۔ حیرت یہ ہے کہ اب تک اس بینک کو اتنی ''ڈھیل'' کیوں دی گئی۔ مگر یہودی لابی دیر آید درست آید کا بڑا سلیقہ رکھتی ہے۔ اب جبکہ یہ بینک ایک مکمل ادارہ تھا اور بین الاقوامی طور پر معاشی طاقت کے طور پر ابھر رہا تھا' انہوں نے اسے اپنے پاس گروی رکھ لیا ہے اب ان کا رویہ بالکل ایسا ہے جو کسی لڑکی کے اغوا کے بعد کمزور وارثوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ تمام معاملات اور منصوبے جو اس بینک کے ساتھ وابستہ تھے' دھرے کے دھرے رہ گئے ہیں۔ مجھے ٹیکنیکل معاملات کا پتہ نہیں' نہ یہ میرا شعبہ ہے۔ مجھے ایک مدت تک بینک بیلنس کی اصطلاح کے معانی بھی نہ آئے تھے۔

میرا بینک تو میری جیب تھی جو اکثر خالی رہتی تھی' تب جب خرچ کا رواج ہی نہ تھا۔ اب بھی میری جیب سے وہ کاغذ زیادہ نکلیں گے جن پر ٹوٹی پھوٹی باتیں لکھی ہوتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ میری بیوی نے آج تک کبھی میری جیب کی تلاشی نہیں لی۔ ظاہر ہے وہ تلاشی لے کر اپنا وقت کیوں برباد کرے گی؟

یہ بات ماننے والی ہے کہ اس بینک میں کئی لوگوں نے گڑبڑ کی ہوگی۔ گڑبڑ کرنے والے ہر ادارے میں ہوتے ہیں۔ یہ کوئی جواز نہیں کہ چند لوگوں کی کرپشن کے بہانے سے ادارے کے ادارے بند کر دیئے جائیں۔ صدر شعبہ کی نااہلیوں کی بنیاد پر تعلیمی ادارے تو نہیں اجاڑ دیئے جاتے۔ کسی ڈائریکٹ حوالدار کی ہٹ دھرمیوں کے پیش نظر پورا تھانہ پوری بستی کی اینٹ سے اینٹ بجادی جاتی تھی۔ اپنے نظام کو مثالی رکھنے والے دوسرے قوموں سے ہمیشہ بدنظمی پھیلا کر ہی نبٹتے ہیں۔

ایک دفعہ جب ریلوے کی انتظامیہ سے شکایت کی گئی کہ ریل کے آخری ڈبے میں جھٹکے بہت لگتے ہیں تو ایک تازہ تازی سی ایس پی افسر نے جھٹ سفارش کی کہ ریل کا آخری ڈبہ بنایا ہی نہ جائے۔ غریب ملکوں کے لوگ ''معاشی ریل'' کے آخری ڈبے میں بری

KitaabPoint.blogspot.com

طرح بھرے ہوئے ہیں۔ ہم تو دروازے سے لٹکتے چلے آ رہے ہیں۔ ہر وقت گرنے کا خطرہ سر پر لٹکتا رہتا ہے۔ دنیا کے معاشی دیوتا اتنے ظالم ہیں کہ گرنے بھی نہیں دیتے۔

جہاں کروڑوں روپے کے حساب کتاب چلتے ہیں وہاں کچھ نہ کچھ تو ہیرا پھیری کہیں نہ کہیں ہو بھی جاتی ہے۔ بی سی سی آئی میں کرپشن کی باتیں بینک کی بندش کے فوراً بعد برطانوی پریس میں سامنے آئی تھیں۔ یہ الزامات بالکل ویسے ہی تھے جیسے ہمارے ہاں کسی سیاسی مخالف کو برباد کرنے کے لیے اسے اغوا اور پھر مرزائی ثابت کر دیا جاتا ہے۔ بی سی سی آئی کے حوالے سے بھی اصل باتیں آہستہ آہستہ سامنے آنے لگی ہیں۔ بی سی سی آئی نے پاکستان' لیبیا اور کئی ملکوں کی امداد کی۔ جب امریکہ سیاسی دھونس جمانے کی خاطر بند کرتا تھا۔ وہ بی سی سی آئی پوری کر دیتا تھا۔ اس طرح تیسری دنیا اور مسلم دنیا معاشی دباؤ سے آزاد ہونے لگی تھی۔ بینک کے بانی آغا حسن عابدی' صدر ضیاء الحق' شیخ زید اور کئی مسلم لیڈروں کے ذاتی دوست تھے۔ ستر کی لڑائی میں مسلم بینک کا منصوبہ امریکہ نے ناکام کیا تھا۔ اب انہیں شک ہوا کہ ورلڈ بینک کے مقابلے میں ساؤتھ بینک بننے والا ہے۔ یہ بالکل ایسی کارروائی ہے جیسے جاگیردار اپنے علاقے میں سکول تک بننے نہیں دیتے۔ ہمارے ہاں ابھی تک شرح خواندگی بہت معمولی ہے تو یہ انہی ایجنسیوں کا کیا دھرا ہے جو ہمیں زندہ رہنے دیتے ہیں نہ مرنے دیتے ہیں۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ پاکستان کے سیاست دانوں اور افسروں نے بی سی سی آئی کے ذریعے کالا دھن سفید کرایا ہے۔ ہمارے حکمرانوں کو صاحب بننے کا بڑا شوق ہے۔ بے شک کالا صاحب ہی کہا جائے مگر کالے سے سفید ہونے کی جسارت گوراشاہی کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ ہماری نوکر شاہی گوراشاہی کی توسیع ہے مگر ان میں ایک خرابی ہے کہ یہ کالے ہیں اور پھر نوکر ہیں۔ آقا تو یہ صرف ہمارے ہیں۔ ابھی ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کالا دھن سفید کرانے میں کیا برائیاں ہیں۔ یہ تو ہم خود بھی کرتے رہتے ہیں۔ غریب لوگ تو اس حوالے سے صرف پرایا دھن کی اصطلاح سے واقف ہیں۔ ان بیچاروں کو کیا پتہ کہ کالا اور سفید دھن کیسا ہوتا ہے۔ پتہ ہے تو صرف اتنا کہ دھن کسی گھوڑے کے پاس ہو تو سفید اور کالے کے پاس ہو تو کالا دھن ہے۔

میں نے برٹش میوزیم کے باہر ایک انگریز سے کہا کہ آپ جو اپنے لوگوں کے لیے اتنے اچھے ہیں' ہم لوگوں کے ساتھ کیوں زیادتیاں کرتے ہیں۔ آپ کو اپنا یہ محاورہ ثابت کرنے کا اتنا کیوں جنون ہے "مائٹ از رائٹ" اس نے کہا اب ہم اس محاورے کو کالعدم کر چکے ہیں۔ اب ہم "وائٹ از رائٹ" کے قائل ہیں۔ یعنی گورا (سفید) ہر حال میں صحیح ہے۔

کالے کو سفید کرنے والی بات پڑھ کر ہماری عورتوں کو بہت دکھ ہوا ہے۔ وہ بے چاریاں چہرے پر کریمیں مل مل کر تھک گئی ہیں مگر خاک رنگ نہیں چڑھا۔ ہمارے ہاں نوجوان لڑکی اداکاراؤں جیسی ہو تو صرف اسے گوری کہتے ہیں جبکہ مغرب کی ہر ایرا غیرا

KitaabPoint.blogspot.com

عورت خود بخود گوری کہلائی جاتی ہے۔

چلی اے گوری چھم چھم کے

مشرقی ہونے کا احساس بیدار رہے تو ہم محبوب عورت کے لیے سانولی کا لفظ استعمال کرتے ہیں' گوری نہیں۔

بی سی سی آئی کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ اس کی وجہ سے بینکنگ کے شعبے میں مغربیوں کی اجارہ داری ختم ہوگئی۔ ایک انہونی بات بھی ممکن ہوگئی کہ مغربی دنیا میں غیر گورے بھی اتنے دولت مند ہوئے اور اتنے افسر ہوئے کہ گورے بھی انہیں سر کہنے پر مجبور ہوئے۔ وہ یہ منظر کب تک دیکھتے کہ مختلف معاشی مسائل کے حوالے سے کسی میٹنگ کی صدارت کوئی کالا کر رہا ہے۔ گورے اچھے بھلے سانولے گندمی رنگ والوں کو بھی کالا ہی کہتے ہیں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

ٹیلی فون خراب ہے

ہمیں میر درد کا یہ شعر اکثر یاد آتا رہتا ہے۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

اس سے پہلے ہمیں صرف زندگی کی طوفانیوں کا تجربہ تھا۔ ہمارے سیاست دان لیڈر امیر وزیر جو کچھ زندگی کے ساتھ کر رہے ہیں لگتا ہے کہ یہ کسی اور کی زندگی ہے اور زندگی کا جو بس چلتا ہے وہ ہمارے ساتھ کر رہی ہے۔ ہمیں طوفان کا اتنا پتہ نہ تھا بس ادھر ادھر سے خبریں یہ سنتے تھے۔ پچھلے دنوں ایک رات جو طوفان آیا ہر شے الٹ پلٹ گئی۔ درہم برہم ہوئی۔ درہم کم اور برہم زیادہ ہوئی تو معلوم ہوا کہ طوفان کیا شے ہے اور سمجھ میں آیا کہ درد نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

طوفان آ کے گزر گیا۔ زندگی بھی گزر ہی جائے گی۔ اس طوفان میں سینکڑوں جانیں تباہ ہوئیں۔ بجلی، ٹیلی فون، پانی کی سپلائی اور تمام اس طرح کے سلسلے برباد ہو گئے۔ ان محکموں کے اہلکاروں نے وہی طرز عمل اختیار کیا جو کسی حادثے کے بعد زخمیوں کے بچے کھچے مال و اسباب کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ہمیں بجلی اور ٹیلی فون کی خرابی پر حیرت نہیں ہوئی کہ یہ طوفان نہ بھی آئے تو اکثر خراب رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ٹیلی فون کی خرابی کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں مثلاً میرا ٹیلی فون بعض اوقات مہینے کے تیس دنوں میں چھبیس دن خراب رہتا ہے۔ میں یہ کام ٹیلی فون کے محکمے کو شکایت کے طور پر نہیں لکھ رہا کیونکہ اس کے ٹھیک ہونے پر مجھے حیرت ہوتی ہے اور یہ حیرت شکایت بن جاتی ہے۔ یہ بھی وجہ نہیں کہ بعض اخبارات کے فون بھی اکثر خراب رہتے ہیں۔ اس کا بھی فائدہ ہوا ہے کہ ان کے صحافیوں نے خبریں جمع کرنے کے کچھ اور ذرائع تلاش کر لیے ہیں۔ ہم اس کے لیے سب سے پہلے ٹیلی فون کے محکمے کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور ان کی اس اعلیٰ کارکردگی کو سراہتے ہیں کہ ان کی وجہ سے کارکنوں کو سختیاں جھیلنے اور ناسازگار حالات میں بہتر کام کرنے کے مواقع مل رہے ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

ٹیلی فون کے محکمے والوں کے پاس ہزار بہانے ہیں اب تو وہ دفاتر میں موسم کے اچھے ہونے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں' چائے پیتے ہیں اور اپنے پسندیدہ لوگوں کو کراچی اور اسلام آباد' ملتان اور کبھی کبھی لندن فون کرتے ہیں اور کئی کئی گھنٹے کرتے ہیں مگر ہم اپنے اچھے لوگوں سے بات کرنے کو ترستے ہیں۔ اسے ٹیلی فونی زبان بندی کہنا چاہیے اب تو وہ بڑی سہولت سے کہہ دیتے ہیں کہ جناب طوفان کی وجہ سے گڑبڑ ہے ان سے کون کہے کہ طوفان تو گیا مگر آپ کا یہ طوفان کب ختم ہوگا؟ ہماری دنیا میں بے شمار ایسے ملک ہیں کہ جہاں بجلی' ٹیلی فون خراب ہی نہیں ہوتا۔ غالباً چین میں ایک زیر زمین بستی میں غیر ملکی وفد کے ایک رکن نے پوچھ لیا کہ اگر بجلی ٹیلی فون خراب ہو جائے تو آپ کیا کرتے ہیں؟ تو عظیم چینیوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ اچھا تو یہ خراب بھی ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں ریڈیو' ٹی وی پر محکمہ موسمیات کی پیش گوئی ہی نشر ہو جائے کہ آج گرج چمک کے ساتھ چھینٹے پڑنے کا امکان ہے تو شہر میں بجلی اور ٹیلی فون خراب ہو جاتے ہیں جبکہ محکمہ موسمیات کی اکثر اطلاعات غلط ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ محکمہ موسمیات والوں کو یہ اطلاعات فون پر ملتی ہوں گی۔ ہمارے ٹیلی فون کا یہ حال ہے کہ بات ہم مرد سے کرنا چاہتے ہیں اور فون کسی خاتون سے جا ملتا ہے۔ بعض اوقات فون اٹھائیں تو بیک وقت چار چار مرد اور عورتیں باتیں کر رہی ہوتی ہیں۔ کون کس سے بات کر رہا ہے' کچھ پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ جسے مرزنگ میں ملنا ہے وہ ریس کورس پہنچ جاتا ہے جس سے قرضہ لینا ہوتا ہے اس کی بجائے کوئی قرضہ مانگنے آ جاتا ہے۔

جہاں تک محکمے والوں کا تعلق ہے' ان کا فون ہمیشہ مصروف رہتا ہے۔ وہ کسی صارف کی طرف سے شکایت کا فون سنتے ہی نہیں۔ انہیں گھنٹی کی آواز سے پتہ چل جاتا ہے کہ شکایت آ رہی ہے۔ وہ فون اٹھاتے ہی نہیں۔ اٹھالیں تو فون یکلخت خراب ہو جاتا ہے۔ رانگ نمبر کی بڑی موجیں ہیں۔ کئی اداکارائیں اپنی شادی کا واقعہ اس طرح بیان کرتی ہیں کہ رانگ نمبر پر ان سے بات ہوئی اور پھر وہ شرما جاتی ہے۔ اگلی بات انڈرسٹڈ ہے۔

بستر کے ساتھ ہم نے ٹیلی فون رکھ لیا
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

نتیجہ یہ نکلا کہ بیوی بھی خفا ہو گئی ہے اور ٹیلی فون بھی خراب ہو گیا ہے۔ ٹیلی فون کے اس رویئے نے ایک طرز زیست جنم دیا ہے کہ ہم جھوٹ بہت بولنے لگ گئے ہیں اور بے مروت ہو گئے ہیں کہ جو بات منہ پر نہیں کہہ سکتے وہ فون پر کر دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ منہ پر کہنے لگ جاتے ہیں۔ گھر پر ملنے جاؤ تو صاحب غسل خانے میں ہوتے ہیں۔ وہاں بھی یہ تو ہوتا ہے کہ بچہ آ کر دروازے پر کہتا ہے کہ

KitaabPoint.blogspot.com

ابو کہہ رہے ہیں کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔فون پر یہ خطرہ کم ہی ہوتا ہے۔دو آدمی فون پر بات کر رہے تھے۔درمیان میں لائن ملی ہوئی تھی۔ایک آواز۔یار کتنے برس ہو گئے اب تو میرے پیسے واپس کر دو۔

دوسری آواز: آواز نہیں آ رہی۔

پہلی آواز: یار میرے پیسے

دوسری آواز: آواز نہیں آ رہی۔

درمیان میں آدمی بولا کہ بھئی پیسے دے دو آواز تو آ رہی ہے۔

"بھئی تمہیں آواز آ رہی ہے تو تم دے دو۔"

محکمہ ٹیلی فون والوں نے ایسا پکا بندوبست کرنے کی کوشش کی ہے کہ آواز ہی نہ آئے۔ہم بھی کئی دوسرے محکموں کے علاوہ ٹیلی فون کے ضمن میں بھی صبر و شکر کر اظہار کر چکے ہیں۔اس کے باوجود

آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

ہمارے انجینئروں نے ٹیکنیکل دشواری اور ہمارے افسروں نے ضابطے کی کارروائی کے بہانے اب تک اس ملک میں کچھ نہیں ہونے دیا اور آئندہ بھی انشاءاللہ کچھ نہیں ہونے دیا جائے گا۔اس موضوع پر سروے اور ریسرچ کرنے والوں کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تو مل سکتی ہے مگر ٹیلی فون اس کا بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

کامیابی کے لیے محنت ضروری نہیں

حکومت پنجاب نے امتحانات کا پرانا نظام بحال کر دیا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے خوشی ہوئی ہے۔ ایک خواہش یہ بھی دل میں پیدا ہوتی ہے کہ اور بھی پرانے نظام بحال کر دیئے جائیں اور انہیں پورے خلوص اور لگن سے چلایا جائے تو نتائج خاطر خواہ ہوں گے۔ ہمارے معاشرے میں جب کبھی بیوروکریسی کی ایماء پر نئے نئے تجربوں کا سلسلہ شروع کیا گیا تو سوائے ناکامی کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔

امتحانوں کا یہی نظام تھا جو برس ہا برس سے یہاں رائج تھا اور ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ مگر جتنے تجربے تعلیمی نظام اور ''امتحانی نظام'' کو بدلنے کے لیے کئے گئے کسی اور شعبے میں نہیں کئے گئے۔ جب کسی حکومت کو مسائل کا سامنا ہوتا ہے تو اسے بیوروکریسی نئی تجویزیں پیش کر دیتی ہے۔

امتحانوں کر پرانا نظام بحال ہوا ہے تو اس کے لیے انتظام بھی پرانا بحال کیا جائے۔ پہلے دسویں' بارھویں چودھویں اور سولہویں کا امتحان ہوتا تھا۔ اب سپلیمنٹری کا طریقہ رائج کر کے ہر طالب علم کو موقع دیا گیا ہے کہ وہ بے شک تین چار بار ایک ہی کلاس کا امتحان دیتا رہے۔ ایک نوجوان سے پوچھا گیا کہ آج کل آپ کیا کرتے ہیں؟ اس نے کہا۔

ہم بی اے کا امتحان دیا کرتے ہیں۔

کئی مثالیں موجود ہیں کہ ایک طالب علم پچھلے چودہ برس سے میڈیکل کالج میں پڑھ رہا ہے۔ ایسا شخص جب ڈاکٹر بنے گا تو وہ دکھی انسانیت کی کیا خدمت کرے گا؟ ایک لڑکے سے پوچھا گیا کہ تم بڑے ہو کر کیا کرو گے تو اس نے مناسب جواب دیا:

میں بینا بنوں گا اور ڈاکٹروں کی خدمت کروں گا۔

پہلے لوگ امتحان کی تیاری کے لیے پڑھتے تھے' اب نقل کے کامیاب طریقے سوچتے ہیں۔ سارا سارا دن آوارہ پھرنے والے غنڈہ گردی کرنے والے دوسروں سے زیادہ نمبر لے کر کامیاب ہوتے ہیں۔ انہیں اچھی اچھی ملازمتیں بھی مل جاتی ہیں۔ اس صورت حال میں محنت کرنے والے نوجوانوں کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی؟ کیا ان حالات میں انسانی اقدار پر ان کا ایمان برقرار رہے گا۔ پھر اس مقولے کا کیا بنے گا کہ محنت کامیابی کی شرط ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

صدمے کی بات یہ ہے کہ طالب علموں کے ماں باپ رشتہ دار بھی نقل کے کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوتے ہیں۔ کمرہ امتحان میں موثر کارروائیوں کے بعد لوگ آرام سے نہیں بیٹھ جاتے کیونکہ نقل کے لیے بھی عقل چاہیے۔

ایک نوجوان سے پوچھا گیا کہ تم بڑے نالائق ہو فیل ہو گئے ہو۔ اس نے کہا:

نالائق تو آگے والا طالب علم تھا' اسے کچھ آتا جاتا ہی نہ تھا۔

باہر سے جو پرچیاں بھیجی جاتی ہیں' بعض اوقات وہ جواب ممتحن کی نظر میں نہیں جچتا۔ یعنی پرچی سسٹم کی ابتداء بہت پہلے سے شروع ہو جاتی ہے۔ امتحان کے بعد نمبر لگوانے کے لیے باقاعدہ مہم کا آغاز ہوتا ہے۔ بورڈ کے کلرکوں کی معرفت آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ پرچے کس کے پاس گئے ہیں۔ اس اعتراف میں بھی کوئی ہرج نہیں کہ استاد صاحبان بھی اس سلسلے میں مکمل تعاون کرتے ہیں۔ بات سفارش سے رشوت تک پہنچ گئی ہے۔ ایک استاد نے اس ضمن میں لاجواب کر دینے والی بات کی۔

ہمیں اپنے چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے پیسے دینے پڑتے ہیں تو ہم کیوں نہ لیں؟ اس صورت حال سے بچنے کے لیے یہ اہتمام کیا گیا کہ بورڈ کے دفتر کے اندر مارکنگ کا بندوبست کیا جائے مگر یہاں بھی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ پچاس ساٹھ استادوں کی موجودگی میں ایک خوشی سے چلا کر اعلان کرتا ہے۔

فلاں افسر کے بیٹے کا پرچہ مل گیا ہے۔

ایک اور آواز آتی ہے۔

100 میں سے 89 نمبر دے دو۔

بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ پھر رزلٹ سے پہلے بھی گڑبڑ ہوتی ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ پہلی دس پوزیشنوں میں ردوبدل ہوتا ہے۔ اخبار میں جس طالب علم کے لیے اعلان ہوتا ہے کہ وہ تیسرے نمبر پر آیا ہے' بورڈ سے اطلاع آنے پر وہ ساتویں نمبر پر چلا گیا ہوتا ہے۔ بعض اوقات امتحانی سنٹروں کے لیے اس طرح کوشش کرتے ہیں جس طرح کچھ تھانوں کے لیے انسپکٹر صاحبان کرتے ہیں۔ اب امتحانوں والے انسپکٹروں اور پولیس انسپکٹروں میں خاص فرق نہیں رہا۔ جو کچھ امتحانی سنٹروں میں ہوتا ہے کوئی شریف آدمی سپرنٹنڈنٹ لگنے کو تیار نہیں ہوتا۔ چند روپوں کے لیے کون شریف آدمی اپنے آپ کو ذلیل کرنے کی اجازت دے گا۔ چنانچہ جو لوگ منتوں سفارشوں سے یہ ڈیوٹی دینے کو تیار ہوتے ہیں' ان کے بارے میں انکوائری کی جائے مگر اس انکوائری کا بھی دوسری انکوائری جیسا حشر ہوگا۔

KitaabPoint.blogspot.com

پچھلے دنوں جس تحصیلدار نے پولیس کی مدد سے ایک امتحانی سنٹر پر استادوں کو مرغا بنایا تھا' کیا وہ خود دیانتدار افسر ہے؟ کیا اس شرمناک واقعے کے بعد کوئی موثر کارروائی ہوئی؟ اصل حقائق سامنے آتے تو معلوم ہو جاتا کہ اس سنٹر میں کس کس بڑے افسر کے بچے امتحان دے رہے تھے۔ میں امتحان میں ڈیوٹی دینے والے استادوں کی صفائی میں کچھ نہیں کہنا چاہتا مگر اس واقعے سے پہلے جو واقعات ہوئے وہ سامنے کیوں نہیں آنے دیئے گئے؟

حکومت نے کالجوں میں داخلے کے لیے میرٹ پالیسی شروع کی تھی۔ تھوڑی بہت گڑبڑ کے علاوہ ایک اچھا تاثر لوگوں تک پہنچا۔ صرف ایک بار حکومت یہ فیصلہ کرے کہ وہ امتحان میں گڑبڑ نہیں ہونے دے گی اور امتحانوں میں اچھے استادوں کو لگایا جائے اور انہیں پورے اختیارات دیئے جائیں۔ اس وقت مجسٹریٹ اور پولیس والے سپرنٹنڈنٹ کے ماتحت ہوں تو نتائج حیران کن ہوں گے۔ جب طالب علموں کو معلوم ہوا کہ وہ کسی ناجائز ذریعے سے پاس نہیں ہو سکیں گے تو پھر ایک بار وہ کتاب کے ساتھ دوستی شروع کریں گے۔ پڑھنے پڑھانے کا شوق پھر دلوں میں بیدار ہوگا۔ اب تو حالت یہ ہے کہ جب ایک چور کسی گھر میں گیا تو بچے نے دیکھ لیا۔ چور ڈرا تو بچے نے کہا:

چپ چاپ میرا بستہ بھی دوسرے سامان کے ساتھ اٹھا کر لے جاؤ ورنہ ابو کو جگا دوں گا۔

ابو صاحبان کے سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ بچے کی دلچسپی پڑھائی میں کیوں ختم ہوئی؟ پہلے وہ کتاب کمرہ جماعت میں لے کر جاتا تھا اب کمرہ امتحان میں لے جاتا ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

ایک زبان ایک نصاب

وزیر اعلیٰ پنجاب جناب غلام حیدر وائیں آج کل اردو کے لیے خواہ مخواہ سنجیدہ ہوتے رہے۔ انہوں نے اہل قلم اور اہل دانش کی ایک میٹنگ بلائی تھی۔ تمام ادیب اور شاعر وائیں صاحب کو کہہ رہے تھے کہ جناب آج سے اردو نافذ کر دی جائے تو بھی یہ ممکن ہے۔ ان کی باتیں سن کر وہاں موجود کالے صاحب مسکرا رہے تھے کہ اشفاق احمد نے صاف کہہ دیا کہ جناب وائیں صاحب! آپ سرکاری سطح پر اردو نافذ نہیں کر سکیں گے۔ آپ کو ایسا نہیں کرنے دیا جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا وائیں صاحب نے اس ضمن میں کمیٹی بنانے اور تیس ادیبوں میں سے ایک کو اسی کمیٹی کا ممبر نامزد کرنے کے لیے کہا اور یہ بھی کہا کہ کمیٹی کے دوسرے ممبران میں خود نامزد کروں گا۔ وہ یقیناً بیوروکریٹ ہوں گے۔ معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ اب تو یہ معاملہ کچھ زیادہ ہی کھٹا ہو گیا ہے۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ وائیں صاحب نے کوئی اعلان نہیں کر دیا' ورنہ اس کا حشر بھی دوسرے اعلانات جیسا ہوتا۔ اکثر حکمران کہتے رہتے ہیں کہ ہم یہ کریں گے' ہم یہ کر دیں گے۔ ہو جائے تو فبہا نہ ہو تو مایوسی بڑھتی ہے۔ جس کے نتیجے کا علم صرف ہماری بیوروکریسی کو ہی ہے۔ تہ تو پکے حکمران ہیں۔ حکومت کسی کے پاس ہو انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے۔ تمام وزیروں کو پتہ ہے کہ اس اندھیر رات میں اجالا افسروں کے بغیر نہیں ہوتا۔ مخدوم سجاد حسین گورنر تھے تو بھی اپنے سیکرٹری کو سر کہہ کر بلاتے تھے۔ سر نہ ہو تو دھڑ کس کام کا ہے۔ ہماری افسروں کی ساری افسری صرف اور صرف انگریزی کی بدولت ہے۔ انہیں انگریزی کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ وہ اپنے دفتر میں پنجابی زبان میں دل پشوری کرتے ہیں۔ جب کوئی آدمی کام لے کے آتا ہے تو فر فر انگریزی بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ سائل کو جو کہنا ہوتا ہے' بھول جاتا ہے۔ اس طرح عوام اور حکام کے درمیان ایک فاصلہ قائم ہو جاتا ہے۔ فاصلے جب بڑھتے ہیں تو کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ ہم پچھلے بیالیس برس سے اعلانات سن رہے ہیں۔ دو لفظوں کی سیاست ہے۔ دعویٰ اور وعدہ ان دونوں لفظوں کی توقیر ہمارے ملک میں ختم ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ دو نعرے ہیں جن کی بنیاد پر اپنی سیاست چمکائی جاتی ہے۔ ایک نفاذ اسلام اور دوسرا نفاذ اردو' ہمارے مستقل حکمرانوں کو بھی نہ اسلام کا کچھ پتہ ہوتا ہے نہ انہیں اردو آتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں اسلام کی بات صرف ہوئی جو اردو میں ہوئی۔ ان میں بھی روڑے اٹکائے گئے۔ جناب نواز شریف کا یہ رعب ہے کہ وہ گورنمنٹ کالج کے پڑھے ہوئے ہیں۔ ہماری بیوروکریسی راوینز سے بھری پڑی ہے۔ اس لیے ان کے لیے دل میں ایک گوشہ ہے' کہ ایک راوین بھائی

KitaabPoint.blogspot.com

ہیں۔ انگریزی بھی ناکام کوشش کر کے بول لیتے ہیں۔ افسروں کے بقول جسے انگریزی نہ آئے وہ ان پڑھ ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وائیں صاحب اب اردو کے لیے اسی گرمجوشی دکھا رہے ہیں۔ انہوں نے ہم سخن ساتھی کے سالانہ عشائیے میں چند ماہ قبل یہ اعلان کیا تھا کہ کل سے تمام سیکرٹری صاحبان انہیں سمریاں اردو میں بھجوائیں' مگر وہ کل ابھی نہیں آئی۔ سیانے کہہ گئے ہیں کہ آج کا کام کل پر نہ چھوڑو۔ اگر ہمارے لیڈر اعلانات کرنے سے ہی پرہیز کریں تو قوم کو خاصا افاقہ ہوگا۔ جناب وائیں صاحب نے زرعی ٹیکس لگانے کا اعلان کیا۔ بڑی واہ واہ ہوئی۔ پھر انہیں یہ فیصلہ واپس لینا پڑا بلکہ اپنے یہ الفاظ واپس لینے پڑے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

زیارت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیفیت

زیارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہر مسلمان کی تمنا ہے۔ یہ تمنا دلوں کو بے قرار رکھتی ہے اور اسی سے سکون قلب بھی ملتا ہے۔ وہ لوگ کتنے بلند مرتبہ تھے جن پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر پڑی اور انہوں نے حضور کو دیکھا ان سے باتیں کیں۔ کوئی لاکھ ولی کامل ہو وہ ایک صحابی کی خاک پا تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس شخص کی خوش نصیبوں کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں جس نے خواب کے جہان میں حضور کی زیارت کی بلکہ زیارت کی کیفیت کو محسوس کیا۔

وہ منظر بہت انوکھا اور پیارا تھا۔ جب رسول کریم حجۃ الوداع کے موقع پر مسلمانوں کو خطاب فرما رہے تھے۔ حضور کے آخری خطبے کو منشور انسانیت کا نام دیا جاتا ہے۔ وہاں موجود خواتین و حضرات نے محسوس کر لیا کہ شاید اس طرح حضور کے ساتھ ان کی آخری ملاقات ہے۔ وہاں موجود عورتوں نے اپنے بچوں کو اپنے بازوؤں میں بھر کے سر سے اوپر اٹھا لیا تا کہ ان پر رسول کریم کی نگاہ مبارک پڑ جائے اور وہ اس صف میں شامل ہو جائیں کہ وہ بھی ممتاز ترین مسلمان کہلائیں۔

وہ جو دھیمے لہجے میں بولتا تھا۔ وہ جو کئی زمانوں کے بند اسرار کھولتا تھا۔ ایسا حسین شخص آسمانوں کی نگاہوں نے نہیں دیکھا۔ جن لوگوں نے اپنی زندگی ان کی رفاقت میں گزاری۔ جنہوں نے زندگی کے کچھ لمحے ان کے ساتھ بسر کئے۔ ان لوگوں کو دیکھ لینا بھی خوش قسمتی کی انتہا ہے۔ ان لوگوں کو تابعی کہتے ہیں۔ جنہوں نے تابعین کو دیکھا انہیں تبع تابعین کہتے ہیں۔ پھر وہ زمانے جو ان زمانوں سے جڑتے چلے آئے۔ افضل کہلائے۔

برصغیر کی تاریخ میں اس وقت ایک بحث چھڑ گئی تھی۔ جب شاہ ولی اللہ دہلوی نے اعلان کیا کہ وہ تابعی ہیں۔ انہوں نے ایک صحابی کی زیارت کی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ وہ مسجد میں بیٹھے تھے۔ ایک سفید رنگ کا سانپ نظر آیا۔ شاہ صاحب نے اس پر دوات پھینکی اور وہ مر گیا۔ ایک دو لمحوں کے بعد انہوں نے دیکھا کہ سانپ غائب تھا۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ اتنے میں چند لوگ مسجد میں داخل ہوئے۔ انہوں نے شاہی لباس پہنا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ کچھ سپاہی بھی تھے۔ آتے ہی مجھے کہا کہ آپ کو ہمارے بادشاہ نے بلایا ہے۔ میں نے سوچا کہ بادشاہ کو میرے ساتھ کیا کام ہے۔ میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے مسجد سے باہر لے گئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اس طرف کون بادشاہ رہتا ہے۔ تب انوں نے بتایا کہ ہم جن ہیں۔ ان کا رویہ ایسا نہیں تھا کہ مجھے خوف

KitaabPoint.blogspot.com

آتا۔ مجھے بادشاہ کے دربار میں پیش کیا گیا۔ اس نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ نے ہارے ایک ساتھی کو قتل کیا ہے اور قتل کی سزا موت ہے۔ میں نے انکار کیا کہ میں نے ان کے کسی ساتھی کو قتل نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے ایک سفید رنگ کے سانپ کو مار دیا تھا۔ وہ اصل میں جن تھا۔ میں نے کہا کہ میں نے تو سانپ کو مارا۔ سانپ موذی ہے اسے مارنے میں کوئی حرج نہیں۔ میں نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم پڑھی جو میرے بیان کی تصدیق کرتی تھی۔ بادشاہ نے کہا کہ ہم بھی مسلمان ہیں مگر اس حدیث کی تصدیق کس طرح ہوگی۔ اس نے درباریوں سے کہا کہ فلاں جن سے درخواست کی جائے کہ وہ اس معاملے میں ہماری مدد کرے۔ ایک جن آیا جو بہت بوڑھا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ میں نے اتنا بوڑھا شخص پہلے نہ دیکھا تھا۔ اس جن نے کہا کہ واقعی یہ حدیث مبارکہ ہے اور اتفاق سے میں اس محفل میں موجود تھا۔ جب حضور نے اس سلسلے میں گفتگو فرمائی تھی۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ کو آزاد کر دیا گیا۔ شاہ ولی اللہ نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے انسانی شکل میں ایسے شخص کی زیارت کی ہے جو حضور کی خدمت میں حاضر رہا۔ لہٰذا میں تابعی ہوں شاہ صاحب کی اس بات کی تائید یا تردید کرنا یہاں مقصود نہیں۔ بہرحال یہ ایک اعزاز ہے جو کسی آدمی کے لیے بہت بڑی خوش نصیبی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کی زیارت ہر دور میں ہر صاحب ایمان کی سب سے بڑی آرزو رہی ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

اس جاسوس زمانے میں

لوگ تو رہتے ہیں ہر لمحے ٹوہ میں ایسی باتوں کی
پیار محبت کے ہیں دشمن دل کے ایسے کالے ہیں
دیکھئے کچھ محتاط ہی رہئے اس جاسوس زمانے میں
میں بھی بچوں والی ہوں اور آپ بھی بچوں والے ہیں

جب غلام مصطفیٰ جتوئی اپنے کمرے سے جاسوسی کے آلات اخبار نویسوں کو دکھا رہے تھے تو مجھے انور مسعود کا یہ قطعہ یاد آ رہا تھا۔ عین ممکن ہے کہ جتوئی صاحب کے ضمن میں یہ کارروائی گھر والوں بلکہ گھر والی نے کی ہو' کیونکہ اپنے مردوں کی جس قدر جاسوسی بیویاں کرتی ہیں کوئی اور نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات انٹیلی جنس والے لیڈروں کے اتنے قریب ہو جاتے ہیں کہ ان کی رپورٹیں حکمرانوں کے لیے کم اور متعلقہ لیڈروں کی بیویوں کے زیادہ کام آتی ہیں۔ یہ رپورٹیں حکمرانوں کے اس لیے کام نہیں آتیں کہ انہیں شک پڑ جاتا ہے کہ کہیں ان کی اپنی نگرانی تو نہیں کی جا رہی۔ یہ رپورٹ تو ان کے اپنے بارے میں ہے۔

ایک جاسوسی کا نظام فطری بھی ہے اور صرف وہی کامیاب ہے۔ اللہ نے ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے منکر نکیر لگا رکھے ہیں۔ وہ سب کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ آج کل نیکیاں لکھنے والا فرشتہ بڑے آرام میں ہے' خاصا سست ہو گیا ہے۔ لوگ نیکیاں کرنا بھولتے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف لوگ اتنی تیزی اور کثرت سے برائیاں کرنے پر تلے ہوئے ہیں کہ اس رپورٹنگ پر مقرر فرشتہ بہت مشکل میں ہے۔ بے چارے کو بہت محنت کرنا پڑ رہی ہے۔ شاید اب یہ کام روحانی شارٹ ہینڈ سیکھے بغیر فرشتے کے لیے بھی ممکن نہیں۔

ہمارے حکام عوام کے سامنے تو جواب دہ نہیں۔ لگتا ہے وہ خدا کے سامنے بھی جواب دہ نہیں۔ کہا گیا ہے کہ قیامت کے روز تیرے ہاتھ پاؤں' تیری آنکھیں' تیری زبان تیرے خلاف گواہی دیں گے۔ آدمی کا کیا ہوا' سب کچھ اس کے سامنے آ جائے گا۔ سنا ہے سائنسی بنیادوں پر بھی یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ہر آدمی کی آواز اور عمل فضا میں محفوظ ہو رہا ہے۔ شاید انسان کبھی اس پر بھی قادر ہو جائے کہ وہ ان آوازوں اور تصویروں کی آڈیو اور ویڈیو کیسٹ بنا لے۔ کیا ہم یہ فلم دیکھ سکیں گے؟ جس حمام میں سب ننگے ہوں پھر کس کو کس سے شرم آئے گی؟

KitaabPoint.blogspot.com

ہمارے ملک میں اپنے مخالفین کی جاسوسی ایک ضروری سرکاری کارروائی ہے میرا خیال ہے کہ اگر رپورٹیں جمع کی جائیں تو ان کی تفصیل ایک جیسی ہوگی۔ تحریر بھی ایک ہوگی' جیسے یہ ایک ہی آدمی کی سرگرمیوں کی نگرانی ہوئی ہو۔ چنانچہ جتوئی صاحب کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے سب حکمرانوں نے ایک جیسے کام کئے ہیں اور ان کے مخالف سیاسی لیڈروں نے بھی ایک سے کام کئے ہیں۔

ہمارے ملک میں حکمرانوں نے اپنے مخالفوں کو ہمیشہ بڑی اہمیت دی۔ میں خوشامدیوں اور مفاد پرستوں کو بھی حکمرانوں کا مخالف سمجھتا ہوں۔ حکمرانوں کو ان لوگوں کی جاسوسی پر زیادہ توجہ دینی چاہیے تھی کیونکہ اصل میں یہی ان کے زوال کے اصل سبب بنتے ہیں۔

سابق وزیراعظم جتوئی کی دو حیثیتیں ہیں وہ موجودہ حکومت کے حلیف بھی ہیں اور حریف بھی ہیں۔ محترمہ بینظیر بھٹو' نواب زادہ نصراللہ خان' محمد خان جونیجو' اعجاز الحق' زاہد سرفراز اور ایک ''آدمی'' اہل اقتدار کو کھٹکتا ہے مگر سب سے زیادہ سیاسی حوالے سے خطرہ جتوئی صاحب کی طرف سے ہے۔ میں یہ بات افواہوں کے حوالے سے کر رہا ہوں۔ اقتدار ایسی بھول بھلیوں کا نام ہے کہ وہاں جانے کا رستہ نہیں ملتا پھر آنے کا رستہ نہیں ملتا بس آدمی گردش کرتا رہتا ہے اور بالآخر غلام گردش میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

موجودہ دور میں ہماری سیاست ایک کھلا راز ہے اب غلام مصطفیٰ جتوئی کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ وہ سندھ میں سب سے بڑی جاگیر کے مالک ہیں ان کی زمینوں میں پکی سڑکیں دور تک جاتی ہیں' ان کے ارادوں' منصوبوں' خواہشوں' کوششوں' کامیابیوں اور ناکامیوں سے سب واقف ہیں۔ ان کی جاسوسی کر کے کیا مل جائے گا؟ جس بات کا خطرہ ہے وہ تو کہیں اور ہو جائے گی اور جب ہو گی تو کچھ کام نہ آئے گا۔

جاسوسی کا نظام ملک و قوم کی سلامتی کے لیے ہوتا ہے۔ حکمرانوں کی سلامتی بھی اسی راز میں مضمر ہے۔ عام لوگوں کی زندگیاں خطرے میں ہیں مگر قیامت صغریٰ سے پہل کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ زلزلہ آنے سے پہلے کسی کو خبر نہیں ہوتی زلزلہ آنے سے پہلے جنگلوں کے جانوروں کو بھی پتہ چل جاتا ہے۔ ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ بدرشی کیمپ کا اسلحہ ڈپو پھٹنے والا ہے۔ راولپنڈی کے راجہ بازار میں دھماکہ ہونے والا ہے' گھوٹکی کے قریب گاڑیاں ٹکرانے والی ہیں۔ ہمیں تو سیلاب کی خبر بھی نہ ہو سکی اور ہماری بستیاں پانی میں ڈوب گئیں۔ ان موقعوں پر ہماری انٹیلی جنس ایجنسیاں کیا کر رہی ہوتی ہیں؟ کون ہے جو ہمیں خبر نہیں ہونے دیتا۔ ہم تو صرف اپنے اقتدار کے لیے ممکنہ خطرہ بننے والے لیڈروں کی خبر لیتے رہتے ہیں۔

ہمارے حکمران اس بات کا پتہ چلانے کے لیے فکرمند کیوں نہیں کہ ہمارے تھانوں میں اور جیل خانوں میں کیا ہوتا ہے؟ انہیں تو اس بات کی بھی پرواہ نہیں کہ ہمارے ''کمرہ امتحانوں'' میں کیا ہوتا ہے۔ دن دیہاڑے ہر کہیں رشوت کا بازار گرم ہے۔ کیا ہمارے

KitaabPoint.blogspot.com

ملک میں سمگلنگ' چور بازاری' ذخیرہ اندوزی نہیں ہوتی؟ پچھلے دنوں جعلی کرنسی کا بہت بڑا اسکینڈل پکڑا گیا۔ نجانے کتنے برسوں سے یہ کام ہو رہا تھا اور ہمیں پتہ نہیں تھا۔ ہمارے حکمرانوں کو بھی یہ پتہ نہیں چلنے دیا جاتا کہ جن دفتروں میں وہ بیٹھتے ہیں وہاں کیا ہوتا ہے؟ غریب گھرانوں میں زندگی کس طرح تڑپتی ہے؟ اس کے برعکس ہمارے امراء اور وزراء کس کس طرح عیش کو عیاشی بناتے رہتے ہیں؟

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

نوراں بی بی ہسپتال بھی بنوایئے

کسی گاؤں میں تین عورتیں سروں پر گھڑے رکھے پانی لینے جا رہی تھیں۔ انہیں راستے میں اپنے بیٹے ملے۔ ایک نے اپنی ماں سے کہا کہ میں بڑا افسر بن گیا ہوں۔ دوسرے نے کہا کہ میں بہت مشہور ہو گیا ہوں۔ تیسرے نے ماں سے کہا کہ آپ تکلیف نہ کریں' میں پانی بھر لاتا ہوں۔ ایک سیانے نے سن کر کہا تیسرا بیٹا ایک اعلیٰ انسان ہے۔

عمران خان بہت اعلیٰ انسان ہے۔ افسر اس کے سامنے دم نہیں مارتے۔ پاکستان میں اس سے زیادہ مشہور اور کوئی نہیں۔ اس نے اپنی ماں کے درد کو اس طرح محسوس کیا کہ اسے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا اور دوسروں کے دکھ کو بھی کم کرنے کی ٹھان لی۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے کھیل کو بھی ایک وقار اور وجاہت عطا کر دی ہے۔ کرکٹ کے اور بھی کھلاڑی ہیں مگر عمران خان ایک لیجنڈ بن گیا ہے۔ باکسنگ تو اب بھی کھیلی جاتی ہے مگر اسے جو کشش محمد علی کلے نے دی' کون اس کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ عمران خان کی طرح محمد علی ہار کر بھی دل جیت لیتا ہے۔ اب باکسنگ کے مقابلوں کی صرف خبر ہی سنی جاتی ہے۔ جب محمد علی رنگ میں ہوتا تھا تو رنگ ہی اور ہوتا تھا۔ عمران خان کی وجہ سے شہر شہر کی گلی گلی میں کرکٹ کھیلی جا رہی ہے۔ کرکٹ میں ایک عظمت حاصل کرنے کے علاوہ عمران نے اپنی شخصیت کو اقدار اور اخلاص کا ایک آئینہ بنا لیا ہے۔ اس نے مطالعہ بھی بہت کیا ہے۔ ورنہ اس شعبے میں صرف کھلنڈرے لوگوں کا چرچا رہا ہے۔ ایک اور آدمی ہے دلیپ کمار' جس نے فلمی دنیا میں بہت بلند مقام حاصل کیا ہے۔ ہمارے ہاں فلمی ہیرو ایک سطحی قسم کی محبوبیت کے علاوہ کوئی حیثیت اختیار نہیں کر پاتا۔ دلیپ کمار بڑے بڑے دانشوروں سے زیادہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ وہ مخیر بھی ہے۔ فلمی دنیا میں اس سے زیادہ معزز اور کوئی نہیں۔

کینسر ہسپتال کے لیے جو کچھ عمران خان نے کیا ہے وہ حکومتوں سے بھی نہیں ہو سکا۔ ہماری حکومتوں نے ایسا کوئی کام اب تک نہیں کیا۔ حکومتیں اگر کچھ کرتی بھی ہیں تو وہ خاص خاص لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ غریب شریب عام لوگ ہمیشہ بنیادی سہولتوں سے محروم رہتے ہیں۔ زندگی بھر ان کی تو ضرورتیں بھی پوری نہیں ہوتیں۔ مجھے خوشی ہے کہ ہمارے ملک میں ایسا ہسپتال بن رہا ہے جو اپنی ترقی یافتہ شکل میں دنیا کے کسی ہسپتال سے کم نہیں ہو گا پھر کسی بیرون ملک علاج کے لیے جانے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ کیا یہ ہسپتال انہی لوگوں کے لیے بن رہا ہے جو بیرون ملک بھی علاج کے لے جا سکتے ہیں۔ علاج کے لیے بیرون ملک جانے والوں کی خبریں

KitaabPoint.blogspot.com

ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے والوں کا حوصلہ نہیں بڑھا سکتیں۔

سوال یہ ہے کہ شوکت خانم ہسپتال میں کن لوگوں کا علاج ہوگا؟ میں عمران خان کی انسان دوستی کو سلام کرتا ہوں۔ مگر کیا آج تک کوئی غریب آدمی اس کا دوست بن سکا ہے؟ اس نے ایک دن بھی ایسے گھر میں گزارا ہے جہاں زندگی سسکتی ہے یا تڑپتی ہے؟ اپنے ہسپتال کے لیے بھی وہ امیروں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ اس کی کسی تقریب میں کوئی عام غریب آدمی شرکت کی خواہش بھی نہیں کر سکتا۔ اس نے کسی بینک میں اکاؤنٹ کھول کر غریب اور دکھی لوگوں سے کہا ہوتا تو اب تک کئی کروڑ روپے جمع ہو چکے ہوتے۔ وہ جانتا ہی نہیں کہ اس سے سچی محبت کرنے والے کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ خیر کے لیے' نمود و نمائش کی خاطر کروڑ روپیہ دینے والا بھی برا آدمی نہیں۔ مگر محبت سے سو روپیہ دینے والا بھی کہیں اچھا آدمی ہے۔

ہسپتال تو پہلے بھی بنے ہیں مگر اتفاق ہسپتال میں کتنے غریب لوگ اب تک داخل ہو سکے ہیں؟ لاکھوں انسان ہیں جو دوسری خوبصورت عمارتوں کی طرح اس عمارت کو دیکھ بھی نہیں سکیں گے۔ گنگا رام ہسپتال میں بھی غریب اور بے وسیلہ لوگوں کو داخلہ نہیں ملتا۔ میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جن کو آج تک اسپرو کے سوا کوئی دوا نصیب نہیں ہوئی۔ ہماری دور افتادہ بستیوں میں غریب مائیں ایسے جی رہی ہیں جیسے جینے کی نقل مار رہی ہوں۔ وہ محبت نہیں کر سکتیں' صرف خدمت کر سکتی ہیں۔ غریبی اور بڑھاپے میں کوئی فرق نہیں' تب مایوسیوں اور محرومیوں میں فرق مٹ جاتا ہے۔ میں نے اپنے گاؤں کی نوراں بی بی کو دیکھا ہے۔ وہ زندگی بھر کسی ڈاکٹر کو اپنا حال نہیں بتا سکی۔ وہ بے چاری تو اپنے شوہر اور اپنے بیٹے کو بھی اپنا حال نہیں بتا سکی۔ وہ اپنے کپڑوں کی طرح میلی اور پھٹی پرانی لگتی ہے۔ اس کے کپڑے صاف ہوتے اور اس کی صحت ٹھیک ہوتی تو لوگ اسے دیکھ کر ایک لحظہ کے لیے رک جاتے۔ وہ جب گھروں میں کام کرنے کے لیے جاتی ہے تو اس کا چھوٹا بیٹا اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ تقریباً ہر سال اسے ایک نیا بچہ مل جاتا ہے۔ اس کیڑے کو بچہ کہنا زیادتی ہے۔ وہ برتنوں کی صفائی سے پہلے خوراک کے ذروں کو چاٹتا ہے۔ تب ایک دکھ بھری خوشی نوراں کے چہرے پر ہوتی ہے۔ میں نے آج تک کسی اور چہرے پر ایسی کیفیت نہیں دیکھی۔ جتنا روپیہ وزیروں' امیروں کے بچوں پر ایک دن میں خرچ ہوتا ہے۔ اس سے ہزاروں ایسے بچوں کی زندگی سنور سکتی ہے۔ سرکاری حکام کے اخراجات سے اتنا بھی نہیں بچتا کہ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں کی ڈسپنسریوں میں کالی کھانسی کی گولیاں فراہم ہو سکیں' تاکہ وقتی طور پر ہی' معصوم بچوں کو آسودگی مل جائے۔

آج بھی ہمارے ملک میں ایسے لوگ ہیں جو مر جاتے ہیں اور انہیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ انہیں کیا بیماری ہوئی تھی۔ شوکت خانم ہسپتال بن جانے کے بعد بھی ان کی حالت میں تبدیلی نہیں آئے گی۔ دوسری بستیوں کو چھوڑ کر صرف عمران خان کے شہر میانوالی کی

KitaabPoint.blogspot.com

بات کریں۔ شاید عمران خان زندگی میں صرف دو ایک بار میانوالی گیا ہوگا۔ میانوالی میں اس کے والد کے رشتہ دار اور دوست رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ اپنی نسبت اپنی ماں کے ساتھ جوڑنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ محترمہ شوکت خانم واقعی بڑی عورت تھیں۔ ان کی شخصیت کا گہرا اثر عمران خان کی ذات پر ہے۔ میں عمران خان سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ دوسرے شہروں کی طرح میانوالی کو بھی یاد رکھے اور میانوالی کے دیہاتوں میں نوراں بی بی ہسپتال قائم کرنے کے لیے بھی کوشش کرے۔ ورنہ فیض میراثی سکنہ ابا خیل ضلع میانوالی کو شوکت خانم ہسپتال میں کون گھسنے دے گا؟ وطن عزیز میں چھوٹی چھوٹی بیماریوں کے علاج کے انتظامات بھی ہو جائیں تو ایک کارنامہ ہوگا۔ بڑی بڑی بیماریاں تو ان کو لاحق ہوتی ہیں۔ جو بقول اکبر الہ آبادی:

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

غریب لوگ پہلے دوا کا کام دعا سے لے لیتے تھے۔ اب دعا میں اثر ختم ہو گیا ہے اور المیہ یہ ہے کہ دوا میں بھی اثر نہیں رہا اور کیوں نہیں رہا' اس پر بات پھر کبھی سہی۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

ایک مرحوم پولیس افسر کی ''محرومیاں''

کون یقین کرے گا کہ ایک آدمی ایس پی کے طور پر ریٹائر ہوا اور وہ ایک کرائے کے مکان میں شفٹ ہوا ہو۔ پاکستان کے کسی شہر میں اس کے پاس پلاٹ بھی نہ ہو۔ پنشن پر گزارہ نہ ہو تو وہ بڑھاپے اور سانس کی تکلیف کے باوجود ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت بھی کرے۔ اس بڑے اور سچے انسان کا نام رب نواز خان تھا۔ الف کی طرح سیدھا آدمی۔ جس نے زندگی کے راستے پر ناک کی سیدھ میں سفر کیا۔ اس نے کبھی ادھر ادھر نظر نہ کی۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت اپنے رستے سے نہ ہٹا سکی۔ نہ کوئی اسے رام کر سکا۔ نہ کوئی لالچ اسے ڈگمگا سکا۔ اس نے نہ کچھ جمع کیا نہ طمع کی۔

پولیس کا محکمہ جس طرح بدنام ہے یقین ہی نہیں آتا کہ ایسا آدمی بھی اس برادری میں ہوگا۔ اقبال کا یہ مصرعہ یہاں بھی صادق آتا ہے۔

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی۔ پولیس والوں کے درمیان ان کا ہونا ایک خوشخبری کی طرح تھا جیسے گندے پانی کے جوہڑ میں کنول کا پھول اگ آئے۔

پولیس کا محکمہ مجھے اپنا اپنا لگتا ہے۔ میرے والد کریم داد خان تھانیدار تھے۔ وہ جب فوت ہوئے تو ان کی جیب میں کل ساڑھے چھ آنے تھے۔ وہ عجب آدمی تھے۔ میں نے انہیں پھولوں کی طرح ہنستے اور بادلوں کی طرح روتے دیکھا ہے۔ انہیں اردو، پنجابی اور فارسی کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ وہ صاحب ذوق اور صاحب درد انسان تھے۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ جب وہ ایک نوجوان مقتول کے گھر تفتیش کے لیے گئے تو وہاں ان کی سسکیاں' ایک ماں کی فریادوں سے زیادہ گھائل کر دینے والی تھیں۔ ابا جو ضمنی لکھتے وہ پولیس والوں کے مطالعہ کے لیے محفوظ کر دی جاتی تھی۔ مظفر گڑھ میں ان کے لیے نواب زادہ نصر اللہ خان نے کہا کہ ایسے لوگ بھولے سے اس محکمے میں آجاتے ہیں۔ میرے چچا حقدار خان ڈی ایس پی ریٹائر ہیں۔ وہ جذبات کا پہاڑ ہیں۔ وہ اتنے سادہ آدمی ہیں کہ انہیں مل کر حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے پولیس کی نوکری کیسے کر لی۔ میرے دوسرے چچا بھی پولیس میں تھے۔ میرے چار چچازاد بھائی پولیس میں ہیں۔ شفقت اللہ خان انسپکٹر' بہادر خان سب انسپکٹر' عنایت اللہ خان کنسٹیبل ہیں۔ اقبال خان پولیس کی نوکری چھوڑ آئے ہیں۔ مگر اب چاہتے ہیں کہ ان کا بیٹا سہیل خان پولیس میں بھرتی ہو جائے۔ میرے ایک عزیز اسلم خان بھی انسپکٹر ہیں۔ میری برادری

KitaabPoint.blogspot.com

کے ایک اعلیٰ انسان حمید اللہ خان نیازی بھی ایس پی ریٹائرڈ تھے۔ میں نے احمد ندیم قاسمی اور پروفیسر محمد منور سے ان کی تعریفیں سنی ہیں۔ ان کے لیے صرف یہ کہنا ہی کافی ہے کہ ندیم صاحب نے اپنی ایک کتاب کا انتساب ان کے نام کیا ہے اور یہ قطعہ بھی لکھا ہے۔

تو نے باتوں میں بکھیرے تھے جو نورس غنچے
میں انہیں شعر کی صورت میں سجا لایا ہوں
شاعری زیست مری زیست عبارت تجھ سے
تیری دولت تھی ترے پاس اٹھا لایا ہوں

شہید اکرام اللہ خان نیازی بھی ایک بہادر پولیس افسر تھے۔ مگر میں جب رب نواز خان نیازی سے ملا تو مجھے اپنے نیازی ہونے پر فخر ہوا۔ ایسا صاحب کردار انسان کم کم ہوگا کہیں۔ اس لیے میں ان کا چرچا نہیں کر رہا کہ وہ میرے بزرگ تھے۔ وہ چٹان کی طرح سخت نظر آتے تھے مگر اس چٹان کے دامن میں میٹھے ٹھنڈے پانیوں کے چشمے بہتے تھے۔ مشکل حالات میں بھی ان کے چہرے پر کوئی پریشانی کے آثار نہ ہوتے تھے۔ وہ کچھ عرصہ لاہور میں رہے کرائے کے مکان میں۔ راولپنڈی میں ان کا جنازہ بھی کرائے کے مکان سے اٹھا۔ ایسی شخصیت اپنے محکمے کے لیے ایک افتخار اور وقار کا باعث بن جاتی ہے۔ جنازے میں مرحوم کا چھوٹا بھائی احمد نواز خان نیازی بھی تھا۔ وہ بھی ایس پی ہے۔ مرحوم نے ہمیشہ اس سے محبت اور احسان رکھا۔ اسی شہر میں احمد نواز خان نے اپنے لیے محل بنوایا ہے۔ وہ لاکھوں کو مالک ہے۔ ایک روایتی پولیس افسر ہے۔ کہانیوں میں سنتے تھے کہ دو بھائی تھے اور ان کے مقدر جدا جدا تھے۔ میں نے ان دونوں کرداروں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ آج رب نواز خان نیازی راولپنڈی کے ایک قبرستان میں سو رہے ہیں۔ ان کی قبر پر کھڑے ہو کر میں نے فاتحہ پڑھی اور مجھے محسوس ہوا کہ صاحب قبر کو کوئی فتح نہ کر سکا۔ پھر میں اس سڑک پر سے گزرا جس سے ذرا دور ایک پہاڑی پر ایک خوش منظر امیرانہ گھر ہے جس میں اس قبر والے کا بھائی رہتا ہے۔ دور سے یہ گھر بھی ایک قبر کی طرح لگ رہا تھا۔ ایک مفتوح حاکم کے قلعے کی طرح۔

لاہور میں جب رب نواز خان ڈی ایس پی ٹریفک تھے' چیکنگ ہو رہی تھی۔ اس وقت کے گورنر جنرل عتیق الرحمٰن کی گاڑی بھی روکی گئی اور چیک کی گئی۔ یہ واقعہ خبر بن گیا۔ ایسا کئی چھوٹے بڑے واقعات رب نواز خان کی زندگی کی کتاب میں روشن سیاہی سے لکھے ہوئے ہیں۔

اس طرح کے آدمی اور کتنے ہیں پولیس کے محکمے میں۔ اس زمانے میں ایسے لوگ ایک یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اب اس

KitaabPoint.blogspot.com

جہان میں نہیں ہیں مگر میں نے ان لوگوں کو خان صاحب کے لیے روتے ہوئے دیکھا جنہوں نے کہیں بھی ان کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ وہ عام لوگ بھی انہیں یاد کرتے ہیں۔ جہاں جہاں وہ سرکاری فرائض کی انجام دہی کے لیے گئے میں ان سے تب ملا جب وہ ریٹائرڈ ہو کر آئے تھے۔ وہ کبھی مایوس نظر نہ آئے۔ وہ اپنی پچھلی زندگی کے حوالے سے مطمئن تھے۔ وہ کسی معاشی مسئلے کا بھی شکار نہ تھے مگر اس لحاظ سے آسودہ بھی نہ تھے۔ انہیں ریٹائرمنٹ کے بعد کئی ملازمتیں کرنا پڑیں۔ جب وہ لاہور سے شیخوپورہ جاتے تھے تو مینار پاکستان کے پاس ویگن کوچ کا انتظار کرتے دیکھے گئے۔ وہ ایسے شخص تھے کہ ہمیشہ ان کی عزت کرنے کو جی چاہا ان کے مزاج میں ایک جلال اور تمکنت تھی۔ انہوں نے وہ کام نہ کیا جو وہ کرنا نہ چاہتے تھے۔ جس بات سے انہیں ان کے دل نے روک دیا وہ رک گئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد پورا ڈسپلن ان کی زندگی کے معاملات میں موجود رہا۔ صبح صادق کے وقت اٹھتے تھے۔ نہا دھو کے صبح کی نماز پڑھتے۔ ساری عمر صرف صبح کی نماز پڑھی' تیار ہوتے اجلے کپڑے پہنتے۔ چھٹی والے دن بھی ان کی روٹین میں کبھی فرق نہ آیا۔ رات کا کھانا گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کے کھاتے۔ زمین پر بچھے ہوئے دسترخوان پر سب گھر والے بیٹھتے اور یہ کام ایسے ہوتا جیسے کوئی بہت بڑی نیکی ہو رہی ہو۔ وہ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی ایک بہت بڑی اچھائی سمجھ کر کرتے تھے۔ انہیں سانس کی تکلیف تھی اور ان کی کوشش ہوتی کہ دوسروں کو اس بیماری کا علم نہ ہو' کھانسی روکنے کی کوشش کرتے۔ حیرت ہے کہ وہ اس کوشش میں کامیاب رہتے مگر اس کے نقصانات ان کے جسم میں جمع ہوتے رہے۔ وہ نقصانات کا ایک سٹور روم بن گئے تھے۔ زندگی میں انہوں نے نقصان ہی کو اپنی کمائی سمجھا۔

آخر عمر میں بے مہری زمانہ اور طرز تپاک اہل دنیا دیکھ کر وہ تھوڑے سے ڈسٹرب ہوتے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ اب کچھ ''محرومیاں'' ان کے اندر رقص کرتی رہتی ہیں۔ جو کبھی کبھی رقص نیم بسمل بھی بن جاتا ہوگا۔ ہمارے ہاں اس بات کا اہتمام کیوں نہیں ہوتا کہ جس شخص نے ایک مثالی ملازمت کا ریکارڈ قائم کیا اور پورے محکمے کے لیے نیک نامی کا باعث ہوا یہ تو ہو کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اس کی زندگی ذمہ داریوں کے بوجھ سے آزاد ہو اور وہ سکون سے مر سکے۔ رب نواز خان بہت سکون سے فوت ہوئے۔ وہ ایسی ہی موت چاہتے تھے۔ سوہنی موت۔ چلتے پھرتے ایک دن وہ اگلے جہان چلے گئے جس طرح وہ ٹی وہ والے کمرے سے اٹھ کر اپنے سونے والے کمرے میں جایا کرتے تھے۔ ان کی موت کا سن کر ایسے ایسے آدمی آئے جنہیں گھر والوں میں سے کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ وہ نہ معلوم لوگ تھے۔ ایک انجانی خیر خواہی پورے ماحول میں سرایت کرتی چلی گئی۔ لوگ مرحوم کا ذکر کم کرتے تھے اور روتے زیادہ

KitaabPoint.blogspot.com

تھے۔

ایک بات بہت غور طلب ہے۔ لمحہ فکریہ ہے یا شاید ایک المیہ بھی ہو کہ ربنواز خان نے اپنے کسی بیٹے کو محکمہ پولیس میں نہ جانے دیا۔ یہ بھی ہے کہ ان بلند ارادہ نوجوانوں نے اس محکمہ میں جانا پسند بھی نہ کیا ہو۔ کیا اس بات کو کسی طرح کی محرومی کہا جا سکتا ہے۔ شاید ربنواز خان کے لیے یہی سب سے بڑی محرومی تھی۔ جس مشکل سے انہوں نے پولیس افسری کی۔ یہ مشکل آسان کرنا ان کے بچوں کے بس میں نہ تھا۔ پولیس کی نوکری ایسے اچھے جوانوں کے شایان شان بھی نہیں۔ یہ بات اس محکمے کے لیے شرمناک ہے۔ پولیس ایک فلاحی ادارہ کب بنے گا۔ جس محکمے کے لیے انہوں نے زندگی داؤ پر لگا دی۔ انہوں نے جیتی ہوئی بازی کے آخر میں اپنی جیت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پولیس کے محکمے میں ربنواز خان جیسے آدمی زیادہ کیوں نہیں۔ اتنے کم کیوں ہیں۔ یہ بھی ایک محرومی ہے اور یہ دوسری محرومی تھی۔ بعض اوقات ایک محرومی کئی محرمیاں بنتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے حوالے سے میں محرومیوں کے گرد واوین ڈالنا چاہتا ہوں ''محرومیاں''

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

وائیں صاحب کے لیے

غلام حیدر وائیں صدرات کر رہے تھے جیسے کچھ نہیں کر رہے تھے۔ وہاں اشفاق احمد تھے اور کچھ اہل قلم تھے۔ بہت سے بیورو کریٹ بھی تھے۔ اتفاق سے میں بھی تھا' اردو کو دفتری زبان کا درجہ دینے کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ اب تو یہ المیہ ہے' وائیں صاحب نے تقریر کی اور تحریک پاکستان شروع ہوگئی۔ غالباً اشفاق احمد نے کہا کہ وائیں صاحب ایسی میٹنگیں تو بہت ہوتی ہیں مگر کبھی کچھ بھی نہیں ہوا۔ اب کے بھی نہیں ہوگا آپ اردو کے واقعی ہمدرد ہیں تو ایک آرڈر جاری کر دیں۔ یہ نافذ ہو جائے گی وائیں صاحب کے کان میں چیف سیکرٹری نے کچھ کہا اور وہ اردو زبان کو چھوڑ کر اردو ادب کی بات کرنے لگے۔

سیکرٹریٹ کے ٹھیکیداروں نے وائیں صاحب کے خلاف پراپیگنڈا شروع کر دیا کہ انہیں انگریزی نہیں آتی چنانچہ وہ اردو کے لیے سرگرمی دکھا رہے ہیں۔ وائیں صاحب کو اردو بھی نہیں آتی تھی انگریزی اور اردو تو ہمارے لیڈروں کو بھی واجبی سی آتی ہے۔ وائیں صاحب نے انگریزی بولنا شروع کر دی اس پر بھی کئی لطیفے چلے۔ جب لیڈی ڈیانا پاکستان آئی تو وہ بھی وائیں صاحب کی انگریزی سے بڑی محظوظ ہوئی۔ اردو کے لیے حنیف رامے کچھ نہ کر سکے معراج خالد کچھ نہ کر سکے۔ ایک اور سابق وزیر اعلیٰ پنجاب نواز شریف وزیر اعظم پنجاب نواز شریف وزیر اعظم پاکستان بن کر بھی وزیر اعلیٰ پاکستان رہے وہ پنجاب کی وزارت اعلیٰ کے لیے بے تاب تھے کہ اسے اپنے گھر میں رکھنے کے لیے وائیں صاحب کو وزیر اعلیٰ بنا دیا۔ حکم تو سارا شہباز شریف کا چلتا تھا' کام سارا وائیں صاحب کو کرنا پڑتا تھا۔

اس کے باوجود خوشی تھی کہ ایک لوئر مڈل کلاس کا آدمی پنجاب کا وزیر اعلیٰ بن گیا۔ یہ ان کے محنتی اور معتمد ہونے کی سب سے بڑی گواہی تھی۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ نواز شریف نے چودھری پرویز الٰہی کو وزیر اعلیٰ کیوں نہیں بنایا تھا۔ وائیں صاحب کی المناک موت نے ہمیں دکھی کر دیا ہے۔ وہ بلاشبہ ایک منفرد سیاست دان تھے۔

وہ ایک محفل میں موجود تھے۔ میں نے کہہ دیا کہ لوگ وائیں صاحب سے مذاق کرتے ہیں جو انہیں درویش وزیر اعلیٰ کہہ دیتے ہیں۔ ویسے وہ کبھی کبھی درویش لگتے ہیں۔ وہ تو وزیر اعلیٰ بھی کبھی کبھی لگتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو انہیں مذاق میں وزارت اعلیٰ سے یوں نہ ہٹا دیا جاتا جیسے مکھن میں سے بال نکال پھینکتے ہیں۔ انہیں گولیاں بھی ایسے ہی ماری گئیں جیسے نشانہ بازی کی مشق کی جاتی ہے۔ وہ ایک

KitaabPoint.blogspot.com

غریب اور شریف آدمی تھے لوگوں نے انہیں کسی انداز میں سنجیدگی سے قبول نہ کیا۔ انہیں جس طرح وزیر اعلیٰ بنایا گیا' بنا کر ہٹایا گیا' اسی طرح مروایا بھی گیا۔ ان سے بہتر کوئی آدمی نہ تھا جو علامہ اقبال کے اس شعر کی سچی تشریح کر سکتا۔

خداوند یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطان بھی عیاری

وائیں صاحب کی بجائے کوئی امیر سیاست دان مرتا تو الیکشن کا بائیکاٹ ہو گیا ہوتا۔ وائیں صاحب واقعی مسلم لیگ کے عاشق تھے۔ مگر ان کی مسلم لیگ کو ہمیشہ ان کے گھر سے اغوا کیا گیا۔ وائیں صاحب کو اندر ہی اندر سے رنج تھا۔

وائیں صاحب نے کچھ اچھے کام کرنا چاہیے تھے مگر صوبے کے سب سے بڑے منصب کے وارث ہوتے ہوئے بھی صرف چاہتے ہی رہے۔ چاہتے تو ہم بھی بہت کچھ رہے ہیں مگر..... ! وائیں صاحب کے لیے مگر ایک مگرمچھ بن گیا تھا۔ وائیں صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک چھوٹی مچھلی ہوتے ہوئے بھی زندہ رہے۔

وائیں صاحب نے اپنے دور میں میرٹ کا بہت چرچا کیا کہ یہ ایک مذاق بن گیا۔ غریب آدمی حاکم بھی ہو جائے تو لوگ اسے مخول کرنے سے باز نہیں آتے۔ جو تھانیدار گالیاں نہ نکالے لوگ اس کے گال سہلانے لگتے ہیں۔ سنا ہے ایک مڈل پاس وزیر رانا پھول محمد ایک دفعہ وائیں صاحب کے پاس ایک ایم اے پاس نوجوان کی سفارش لے کے گئے تو انہوں نے حسب معمول بلکہ حسب عادت میرٹ کی رٹ لگائی تو رانا صاحب نے کہا کہ چلیں جناب فیصلہ میرٹ پر ہی سہی۔ نواز شریف 14 پاس ہے اور وزیر اعظم ہے وائیں صاحب آپ میٹرک پاس ہیں اور وزیر اعلیٰ ہیں میں مڈل پاس ہوں اور وزیر ہوں یہ نوجوان تو 16 پاس ہے۔

سرائیکی علاقے کے ایک ممبر نے نے اس طرح کی بات پر لڑتے ہوئے وائیں صاحب سے کہا کہ جناب اگر میرٹ پر فیصلہ ہوتا تو آپ کو وزیر اعلیٰ کے دفتر میں چپڑاسی بھی بھرتی نہ کیا جاتا۔ یہ بھی وائیں صاحب کا کمال ہے کہ وہ چپڑاسی نہ بن سکے اور وزیر اعلیٰ بن گئے۔ یہ بات کہنے کی ہمت کسی ممبر کو کسی بھی اور وزیر اعلیٰ سے نہ ہو گی۔ یہ وائیں صاحب کی ہمت تھی کہ وہ سب کچھ سن لیتے تھے۔ وہ بہر حال وزیر اعلیٰ تو تھے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

حلقہ ارباب ذوق کی آئینی حیثیت

لاہور کے ایک اخبار کے ادبی ایڈیشن میں اظہر غوری نے یہ عجیب وغریب دعویٰ کیا ہے کہ لاہور میں چلنے والے تینوں حلقے غیر آئینی ہیں۔ اس کی رائے اس حلقے کے بارے میں تو درست ہو سکتی ہے جس کا وہ خود ساختہ جائنٹ سیکرٹری ہے لیکن یہ بات مزید عجیب وغریب ہے کہ وہ شخص حلقے کا رکن ہی نہیں وہ اس میٹنگ ہی میں نہیں بیٹھ سکتا جس میں انتظامی اور آئینی نوعیت کے فیصلے ہو سکتے ہیں۔ لگتا ہے اس نے حلقے کے آئین کا مطالعہ ہی نہیں کیا..... مبارک احمد اور سعادت سعید اگر اس بحث میں پڑیں تو مناسب بھی ہے کہ وہ حلقے کے ممبر ہیں۔ برادرم سعادت سعید اپنے حلقے کے اجلاس معطل کر چکے ہیں۔ پاک ٹی ہاؤس میں میرے علاوہ جائنٹ سیکرٹری علی اصغر عباس رکن مجلس عاملہ رشید مصباح اراکین حلقہ اسرار زیدی' اصغر ندیم سید' ضیاء ساجد' اختر ہاشمی' سعادت سعید اور حسن رضوی کی موجودگی میں غیر رسمی طور پر ایک معاہدہ ہوا تھا کہ سعادت سعید کو بلا مقابلہ سیکرٹری بنا دیا جائے اور وہ اپنا حلقہ بند کر دیں۔ کم از کم وہاں موجود اراکین میں سے کوئی بھی ان کے خلاف انتخابات نہ لڑے' اس بات سے صرف اسرار زیدی نے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا۔ یہ معاملہ حلقے کی مجلس عاملہ میں پیش نہیں ہوا۔ اس کی آئینی اور قانونی حیثیت کچھ بھی نہیں مگر حلقے کو متحد کرنے کی کوششوں کے حوالے سے یہ ایک اہم قدم تھا اور نجی محفلوں میں کئے گئے معاہدوں کی پابندی آدمی کا اخلاقی فریضہ ہوتا ہے۔ کم از کم ادیبوں کو تو ان معاملوں میں زیادہ بااصول ہونا چاہیے۔ اس کے بعد سعادت سعید نے اپنے حلقے کے اجلاس معطل کئے اور اگر وہاں موجود اراکین بھی اس غیر رسمی معاہدے کی پابندی کر لیتے تو عین ممکن تھا کہ حلقے کو متحد کرنے کی یہ کوشش کامیاب ہو جاتی اور ہم سب لکھنے والے بے اتفاقی کی اس شرمندگی سے محفوظ ہو سکتے جس نے کئی برسوں سے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ سعادت سعید نے ہی اس ناخوشگوار صورت حال کا آغاز کیا مگر اب اس تکلیف دہ کیفیت سے رہائی کے لیے ایک امید لگی تھی تو حلقے کے وسیع تر مفاد کے لیے یہ بات کوئی اتنی بڑی بات نہ تھی۔ اگر اس محفل میں موجود حضرات ہی تھوڑی سی قربانی کرتے تو سعادت سعید بلا مقابلہ منتخب ہونے کی شرط سے ہٹ کر انتخابات لڑنے پر بھی آمادہ ہو جاتے اور اب کے وہ جیت بھی جاتے اور میرا یہ ذاتی خیال ہے کہ وہ حلقے کو بہت بہتر طور پر چلاتے اور اس طرح کی مذامت سے بھی چھٹکارا ملتا کہ آپ حلقے کے سیکرٹری ہیں تو کس حلقے کے سیکرٹری ہیں؟

میں ذاتی طور پر حلقے کو متحد کرنے اور سعادت سعید کے سیکرٹری منتخب ہونے کا حامی ہوں۔ اگرچہ وہ احتجاجاً اپنے کاغذات

KitaabPoint.blogspot.com

نامزدگی واپس لے چکے ہیں اور ایک اخباری بیان کے مطابق وہ حلقے کی بنیادی رکنیت سے بھی مستعفی ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ حلقہ ارباب ذوق لاہور اصلی کے جائنٹ سیکرٹری کے اس بیان کو بھی غیر ذمہ دارانہ اور نامناسب ٹھہراتے ہیں جو ایک اخبار میں ان کے متعلق چھپا ہے اس ضمن میں حلقہ ارباب ذوق کے جنرل باڈی کے اجلاس میں بھی گرما گرم بحث ہوئی اور متفقہ طور پر طے پایا کہ متذکرہ عہدیدار اس طرح کا بیان دینے کا مجاز ہی نہیں یوں بھی کوئی ایسا بیان جس میں حلقے کے کسی رکن کے جذبات مجروح ہوتے ہوں اور جو حلقے کے وقار کے منافی ہو کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ سعادت سعید نے پچھلے ایک عرصے سے ایک کامیاب سیکرٹری ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ وہ انتخاب ہار گئے۔ اسے حلقے کی بدقسمتی کہہ لیں یا جمہوریت کی خامی کہ ادیبوں کے ہاں بھی بندوں کے گننے کا رواج ہے۔

جہاں تک سیکرٹری جنرل کے انتخابات کا تعلق ہے تو جب سیکرٹری اور جائنٹ سیکرٹری کے انتخابات ہوتے ہیں تو اس میں بھی کوئی بدنیتی شامل نہیں۔ لاہور میں صرف ایک حلقہ ارباب ذوق ہو اور دوسرے شہروں کے سیکرٹری بھی اس معاملے میں دلچسپی لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اسی سال یہ مرحلہ بھی طے نہ ہو پائے۔ ویسے آئین کی رو سے سیکرٹری جنرل کی عدم موجودگی میں لاہور حلقے کا سیکرٹری یہ ذمہ داری بھی نبھاتا ہے اور اب بتایا جائے کہ حلقے کے کتنے جنرل سیکرٹری ہو سکتے ہیں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

اگر ہمارے پاس ایٹم بم ہے تو!!!

بھارت سے لڑائی میں کئی شہروں میں پاکستانیوں نے اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر طیاروں کی لڑائیاں دیکھیں جس طرح پتنگ بازی دیکھتے ہیں۔ دشمن کی طرف سے گولی آئے تو لوگ مرنے کو بھی اپنی شان سمجھتے ہیں۔ یہ تو ان کے تصور میں بھی نہیں کہ کبھی اپنے شہر میں موجود کوئی اپنا ہی اسلحہ ڈپو پھٹے گا اور ان پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ شہر بھر میں بم عورتوں' بچوں اور لوگوں کو تلاش کرتے پھریں گے تا کہ انہیں کچل ڈالیں۔ اوجڑی کیمپ کے واقعے میں لوگوں کو کہیں جائے اماں نہ ملتی تھی۔ کئی لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا کہ آتش فشاں پھٹ پڑا ہے مگر وہ یہ ماننے کے لیے بھی تیار نہیں کہ اپنا ہی اسلحہ ان پر استعمال ہو رہا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس واقعہ کو بھی سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی گئی۔ شہر میں اس قتل عام کی آڑ میں اس وقت کے وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے صدر جنرل ضیاء الحق کو نیچا دکھانے کی کوشش کی مگر ان کا وار پہلے چل گیا اور جونیجو صاحب چلے گئے۔

اگر اوجڑی کیمپ کے حادثے کی غیر جانبدارانہ تحقیقات ہوئی ہوتی اور اس کے بعد مناسب کارروائی بھی ہوئی ہوتی تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ نوشہرہ میں لوگوں پر قیامت ٹوٹی۔ اس کے بعد ان شہروں کے لوگ پریشان ہیں جہاں اسلحہ ڈپو ہیں۔ لاہور میں ٹھوکر نیاز بیگ کے قریب واقعی اسلحہ ڈپو کو ذرا سی ٹھوکر لگنے کے نتیجے میں کیا ہو گا لوگ ابھی سے فکر مند ہیں۔ شاید ہماری قسمت میں لکھا گیا ہے کہ آنے والے خطروں سے ڈرتے رہیں۔ ڈرنے کے باوجود جو کچھ ہمارے ساتھ ہونا ہے وہ ہو جاتا ہے۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ اس طرح ''فائدہ'' بھی ہے کہ اب کسی دشمن ملک کی طرف سے بم برسیں گے تو ہمارے لوگوں کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ مشرق وسطیٰ کی سیاسی صورت حال سے قطع نظر وہاں عراق کے کئی شہروں پر بچوں' عورتوں اور بے گناہ لوگوں پر جو بم برسائے گئے' ہزاروں لوگ مر گئے اور گھر تباہ ہوئے۔ کیا راولپنڈی اور نوشہرہ کے رہنے والے اس طرح کے حالات سے دوچار نہیں ہوئے۔ ان پر بھی بارود کی بارش ہوئی۔ ان کے بچے مرے ان کے گھر اجڑے۔ اس تمام صورت حال کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ سوال ہے اور اس کا جواب گم ہے۔ ہمارے ملک میں ایسے کئی سوال تاریخ کے ماتھے کا زخم ہیں اور مرہم رکھنے والا کوئی نہیں۔ اوجڑی کیمپ کے حوالے سے کہا گیا یہاں سے جہاد افغانستان کے لیے افغان مجاہدین کو اسلحہ سپلائی کیا جاتا تھا۔ بدر شی کیمپ میں تو ایسی کوئی بات نہ تھی۔ پھر ان بہت محفوظ اور عام لوگوں کی پہنچ سے دور مقامات پر تخریب کاری کیسے کامیاب ہوتی ہے؟

KitaabPoint.blogspot.com

آخر کون ہے جو ہمارے فوجی ذخیروں میں گھس کر ہمارے اس اسلحے سے ہمیں تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ ہماری کوئی جگہ محفوظ نہیں۔ سندھ میں لوگوں نے گھروں میں اسلحے کے ڈپو بنا رکھے ہیں۔ جنگلوں کو ڈاکوؤں نے اپنی چھاؤنیاں بنایا ہوا ہے۔ وہ جسے چاہتے ہیں اغوا کر لیتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں دھماکے کر دیتے ہیں۔ ہمارا کون سا شہر ہے جہاں دھماکہ نہیں ہوا؟ اب دھماکوں کی خبریں ہمارے لیے معمول بن گئی ہیں۔ جہاں دھماکہ ہوتا ہے وہاں میلہ لگ جاتا ہے۔ ہم بڑی تماش بین قوم ہیں۔ جب آگ کے الاؤ بلند ہوتے ہیں تو ہمارے لیے یہ آتش بازی قابل دید منظر ہو جاتا ہے۔

ہر روز کسی شہر میں ہوتے ہیں دھماکے
رہتی ہے میرے دیس میں شبرات مسلسل

دشمن سے ساری جنگوں میں ہمارا اتنا نقصان نہیں ہوا جتنا اپنی ہی غفلتوں اور تخریب کاریوں کے نتیجے میں ہو گیا ہے۔ کیا کسی ذمہ دار آدمی کی طرف سے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ یہ تخریب کاری لگتی ہے؟ کمال یہ ہے کہ یہ تخریب کاری تمام حکومتوں کے زمانوں میں ہوتی رہی ہے۔ ہماری کوئی حکومت اس ''اعزاز'' سے بچی ہوئی نہیں۔ ایک آدمی کچ دیاں چوڑیاں (ونگاں) بیچ رہا تھا۔ ایک خریدار نے ان پر ڈنڈا مار کر پوچھا کہ یہ کیا ہے تو اس آدمی نے کہا اب تو یہ کچھ بھی نہیں۔

ایک سیاسی لیڈر کے خیال میں اس طرح امریکہ کے روز روز کے اس مطالبے سے تو نجات ملے گی کہ وہ کہوٹہ پلانٹ کا معائنہ کرنا چاہتا ہے۔ دنیا کو یہ پتہ چل جائے گا کہ ہمارے پاس ایٹم بم نہیں۔ میں نے کہا کہ اگر ایٹم بم ہوا اور اوجڑی کیمپ کی طرح کہوٹہ کیمپ میں خدانہ کرے کوئی دھماکہ ہو گیا تو!!

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

کرکٹ کا کوڑا کرکٹ

ہمارا قومی کھیل اگرچہ ہاکی ہے مگر ہماری محبتیں کرکٹ کے ساتھ پیوست ہو کر رہ گئی ہیں۔ شہروں اور دیہاتوں میں' سڑکوں اور گلی کوچوں کے درمیان کرکٹ کا مظاہرہ اصل میں اس کھیل کے ساتھ ہمارے جذبوں کے میل کا ثبوت ہے۔ کرکٹ کے کھلاڑی ہماری ہاں فلمی ستاروں' ٹی وی کے اداکاروں سے بھی زیادہ مقبول ہوئے۔ یہاں مقبول کی بجائے محبوب کا لفظ استعمال کیا جائے تو بھی جائز ہے۔ فضل محمود' ماجد خان' حنیف محمد' ظہیر عباس' سرفراز نواز اور بہت سے کھلاڑی لوگوں کی آنکھ کا تارا بن گئے کئی تارے ٹوٹتے بھی رہے۔ مگر وہ لوگوں کے لیے ٹوٹے ہوئے خوابوں کی طرح تھے۔ پھر عمران خان نے اس منظر کو تاروں بھری رات بنا دیا۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ کرکٹ ٹیم کے ہارنے پر لوگوں نے یوں سوگ منایا جیسے خود بہت بڑی بازی جیت نہ سکے ہوں۔ جب بھی ہماری کرکٹ ٹیم یا کسی ایک کرکٹر کے خلاف کوئی سکینڈل بنا تو لوگوں نے اسے کسی روایتی داستان کی طرح لیا۔ ہماری روایتی داستانوں میں محبت ٹھاٹھیں مارتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

مگر اس بار جب ہماری ٹیم ویسٹ انڈیز کے دورے پر گئی تو لوگ جو اپنے نوجوانوں کی غیر تسلی بخش کارکردگی سے پہلے صرف اداس ہوئے تھے اب مایوس بھی ہو گئے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ عمران خان نے ورلڈ کپ جیت کر لوگوں کو ایسے میدان میں کھڑا کر دیا ہے جہاں وہ فتح کے بغیر کوئی خبر نہیں سننا چاہتے۔ عمران خان تو پیدا ہی فتح کے لیے ہوا ہے۔ کرکٹ کے علاوہ اس نے دوسرے میدانوں میں بھی فتح کے ڈھیر لگا دیئے۔ میری ذاتی رائے میں اب تک وطن عزیز میں اس سے زیادہ خوش نصیب اور محبوب آدمی شاید ہی پیدا ہوا ہو۔ ویسٹ انڈیز کے دورے پر عمران خان کی موجودگی کھلاڑیوں کے لیے ایک آسودگی کا باعث رہی۔ وہ گیا تو مبصر کے طور پر تھا اور اپنے کھلاڑیوں کے لیے ایک ہدایت کی علامت بھی بن گیا۔

ویسٹ انڈیز میں ہماری ٹیم کی کارکردگی بہت غریبانہ رہی پھر وہاں ساحل سمندر پر جو کچھ ہوا اس کے حوالے سے جو فیصلے ہوئے اتنے فاصلے پر ہم وطنوں کے لیے پریشان کن تھے۔ میاں داد نے آتے ہی پیر پگاڑا کی رہائش گاہ پر گرما گرم جلیبیوں کی طرح باتیں کیں۔ آدھی سے زیادہ جلیبیاں خود کھا گیا۔ اس نے کہا چاروں کھلاڑی نشے میں تھے۔ اگلے دن اس نے تردیدی بیان دے ڈالا جو ٹھنڈی ٹھار چائے کی طرح تھا۔ میاں داد ایک صاحب افتخار کرکٹر ہے مگر اس کی شخصیت ہمیشہ متنازعہ بن جاتی ہے رہی سہی کسر سرفراز

KitaabPoint.blogspot.com

نواز نے پوری کر ڈالی۔ اس نے خبروں میں رہنے کے لیے سیاست کا رخ کیا تھا اور رانی سے شادی بھی کر لی۔ اس طرح اسے کامیابیوں کے ہار تو ملے مگر یہ پھول جلدی مرجھا گئے۔ اس نے جاوید میاں داد کے خلاف ایک بار پھر اسی طرح باتیں کیں جس طرح وہ کبھی کبھی رانی کے خلاف کرتا تھا۔ سرفراز کا کہنا ہے کہ میاں داد باقاعدہ جوا کھیلتا ہے۔ اس ضمن میں اس نے آصف اقبال، عبدالرحمٰن بخاطر اور راج بھاگڑی کا نام بھی لیا۔ میاں داد کے سوا اس نے کرکٹ کے تمام کھلاڑیوں کا دفاع کیا اور کہا ساحل سمندر پر جانا کوئی برائی نہیں وہاں ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ جو قابل گرفت ہو اور اگر کوئی بات ہوئی بھی تھی تو اس سلسلے میں مدثر نذر کو پکڑنا چاہیے وہ انگلینڈ میں رہتا ہے اور کوچنگ پاکستانی ٹیم کی کرتا ہے۔

ہمارے خیال میں سرفراز نواز کو اس طرح گندی اور ننگی باتیں نہیں کرنی چاہیں میاں داد نے آٹھ ہزار رنز کیے ہیں۔ کرکٹ ٹیم کی سربراہی بھی کی ہے۔ کرکٹ ٹیم کے کھلاڑیوں اور پرانے کھلاڑیوں پر اس طرح کیچڑ نہیں اچھالنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ ہماری سیاست کی طرح کرکٹ بھی ایک ایسی دلدل بن جائے جس میں ہم سب پھنس کر رہ جائیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر پی سی بی کیا کر رہی ہے۔ جسٹس نسیم حسن شاہ شاید دوسری ذمہ داریوں کی وجہ سے بے حد مصروف ہیں کہ انہیں کرکٹ کے اتنے اہم امور پر توجہ دینے کا وقت ہی نہیں مل رہا۔

اتنا ضرور ہونا چاہیے کہ سرفراز نواز کے بیانات کی تحقیقات کرائی جائے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ کرکٹ ٹیم کے کپتان وسیم اکرم وقت پر پاکستان نہ آئے۔ وہ ویسٹ انڈیز سے ناک کی سیدھ میں انگلستان چلے گئے انہیں کم از کم دو چار دنوں کے لیے تو پاکستان آنا چاہیے تھا۔ ایک تو ان سے مل کر پاکستان کی عبرت ناک شکست پر اظہار ہمدردی کرنا تھی اور دوسرے معاملات پر اظہار افسوس بھی کرنا تھی۔ وہ کم از کم یہ تو بتاتے کہ ساحل سمندر پر کیا ہوا تھا۔ ساحل پر ریت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے اس کی خدمت میں پنجابی کا یہ شعر عرض ہے۔

اڈ اڈ جاندی ریت سی تے کھل کھل جاندا بھیت سی
تیز ہوا دے شور وچ کنہوں کول بٹھا لیا

نہ جانے الزامات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ ویسے اونٹ ریتلی جگہوں پر بیٹھنا پسند کرتا ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

راجیو گاندھی کے لیے دکھ

راجیو گاندھی سابق وزیر اعظم تھے۔ پھر بھی ان کی آخری رسومات پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ ادا کی گئیں۔ بھارتی صدر اور وزیر اعظم بھی آخری رسومات میں شریک تھے۔ اس خبر کے ساتھ یہ خبر نہ ہوتی تو شاید ہم بڑے شرمندہ ہوتے۔ کہا گیا کہ صدر ضیاء کا جنازہ آنجہانی راجیو گاندھی سے بڑا تھا۔ راجیو گاندھی کے ساتھ بھی کئی دوسرے آدمی ہلاک ہو گئے البتہ جنرل ضیاء کے ساتھ آرمی کے بڑے مرتبے کے لوگ تھے۔ ہمارے ہاں قائداعظم لیاقت علی خان اور جنرل ضیاء الحق کا جنازہ ایک یادگار واقعہ بن گیا۔ مگر ہمارے ہاں کسی سابق سربراہ کا جنازہ کبھی کوئی واقعہ نہ بن سکا۔

وزیر اعظم بنانے میں ہم بڑے ماہر ہوئے۔ انہیں ہٹانے کے بھی ماہر ہوئے۔ کسی وزیر اعظم کو ذرا سا احساس ہوا کہ وہ وزیر اعظم ہے اسے اس احساس کمتری سے بچانے کے لیے گھر بھیج دیا گیا۔ غالب نے کہا تھا۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

دو ایک وزیر اعظم اپنی غیر سیاسی ذہانت سے کچھ وقت نکال گئے۔ ان کے لیے غالب کے شعر کو اس طرح پڑھا جائے۔

میں نے کہا کہ بزم ناز اس نے کہا کہ کیا کہا
میں نے کہا کہ کچھ نہیں اس نے کہا کہ ٹھیک ہے

کوئی نوجوان اگر ایک سانس میں اپنے سارے وزرائے اعظم کے پورے پورے نام گنوا دے تو اسے ذہنی آزمائش کے مقابلے میں شرکت کے بغیر انعام دینا چاہیے اور نیلام گھر میں اسے ایک مضبوط کرسی انعام دی جائے۔ ہمارے اپاہج گورنر جنرل غلام محمد نے وزیر اعظم کو زیر و زبر کرنے کے لیے رعشہ زدہ ہاتھوں سے دستخط کر دیئے۔ شاید ہمارے اس گورنر جنرل نے اپنے عرصہ حکومت میں صرف یہی دستخط کئے تھے۔

پنڈت نہرو نے کہا تھا کہ میں سال میں اتنی دھوتیاں نہیں بدلتا جتنے پاکستان کے وزیر اعظم بدل جاتے ہیں۔ گوشہ گمنامی میں ہمارا کوئی لیڈر مر جاتا ہے تو کئی دنوں کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی ہمارا وزیر اعظم رہ چکا ہے۔ ہم آخر کس کس کو سرکاری اعزاز کے ساتھ دفن

KitaabPoint.blogspot.com

کرتے؟ ہمارے حکمرانوں سے تو یہ بھی نہ ہو سکا کہ سابق حکمرانوں کے گھر جا کر فاتحہ خوانی ہی کر لیں۔

بھارت کے وزرائے اعظم میں سے مرار جی ڈیسائی ایسا لیڈر ہے کہ شاید اس کی موت پر سرکاری انتظامات دکھائی نہ دیں۔ شرط یہ ہے کہ نہرو فیملی میں سے کسی آدمی کی حکومت ہو جس کا اب بھی امکان ہے' اسے نشان پاکستان ملنے پر راجیو گاندھی نے بہت برا منایا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ راجیو کی آخری رسومات میں مرار جی ڈیسائی شریک ہوئے یا نہیں۔ سیاسی دنیا میں رواداری پوری طرح ہمارے ہاں پیدا نہیں ہوئی۔ سیاسی مخالفتیں خاندانی دشمنیوں میں بدل جاتی ہیں۔

ہمارے گاؤں کے ایک مولوی صاحب نے ہمیں بتایا کہ فلاں آدمی کو ووٹ میرے بھتیجے نے نہیں دیا مگر اس نے نماز میرے پیچھے پڑھنا چھوڑ دی ہے۔ اس کے باوجود ہماری دیہاتی صورت حال میں مخالف کا جنازہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے گاؤں کے ایک بزرگ سردار اور نیک آدمی جہان خان کا جنازہ تھا۔ دوست دشمن موجود تھے۔ ایک دوسرے کے جانی دشمن بھی تھے۔ ایک آدمی نے شرارت کی اور دو مخالفوں کو لڑانے کی کوشش کی مگر انہوں نے لڑائی سے گریز کیا اور کہا کہ اس کے بڑے موقعے آئیں گے۔

آج سردار کا جنازہ ہے

◆◆◆